PDFBOOKSFREE.PK

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

انشائیہ — جون ایلیا 11

وقت کی قدر کرنا ہے ... گزرتے لمحات پر ایک دانش مندی کی گہری نظر

آپ کے خط — مدیراعلیٰ 12

سسپنس کی محفل میں قارئین کی تیکھی و شیریں باتیں، گلے شکوے اور خلوص مشورے

فلک تک چل — ڈاکٹر ساجد امجد 20

ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

اندر کی آگ — کاشف زبیر 47

خوفناک اور پراسرار طاقتوں کا کربناک تماشا

کشکول — انوار صدیقی 66

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

جھوٹ — تنویر ریاض 97

اپنے پیار اور احساسات کی محافظ ایک حسینہ کا امتحان

جزائے سزا — مرزا امجد بیگ 106

دلیلوں کے ہتھیار کے ساتھ میدان میں اترنے والے امجد بیگ کا منفرد انداز

اصلی نقلی — سلیم انور 135

ایک دوشیزہ کی شاطرانہ چالوں اور گہری نگاہوں کا کمال

محفل شعر و سخن — قارئین 140

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

گرہ — بابر نعیم 143

جرائم کی دنیا میں پینترے بدلتے مجرموں کا احوال

آئینہ ایام — سید خلیق احمد 147

گزرے ماہ و سال میں تنہائیوں کا عذاب سہنے والوں کا قصہ

مسافر — ناصر ملک 152

گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

ہم نشین — منظر امام 195

انسان اور جانور کی زندگی کا ایک دلچسپ تقابلی جائزہ

نوشۂ گنج بخشؒ — ضیا تسنیم بلگرامی 205

پیدائش سے قبل ہی دھوم مچانے والے ایک ولی کا زندگی نامہ

بلا — محمد الیاس 217

خواہشوں اور خوابوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے رشتوں کی آزمائش

آشوب وفا — محی الدین نواب 232

تحیر تجسس، سنسنی اور چشم کشا حقیقتوں کے جال میں بنی ایک انوکھی داستان

جلد42 • شمارہ 01 جنوری 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

انشائیہ

نیا سال

جون ایلیا

ہم ایک نیا سال شروع کر رہے ہیں۔ اس سال میں ہمیں پاکستان کی تاریخ کے حساب سے پچھلے سالوں کا حساب دینا ہے۔

نئے سال اور پرانے سال' کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ زمانے میں نہ لمحے ہیں' نہ ساعتیں' نہ دن ہیں' نہ ہفتے' نہ مہینے ہیں اور نہ سال۔ زمانہ' ایک لمحہ بھی ہے اور لمحے کا ہزارواں حصہ بھی۔ زمانہ ازل بھی ہے اور ابد بھی۔ زمانہ ہی وہ سب کچھ ہے' جو ہے۔

زمانہ وجود اور عدم کا ایک سمندر ہے۔ ایک بے کنار اور بے کراں سمندر' جس میں ہم بہہ رہے ہیں' ڈوب رہے ہیں اور ابھر رہے ہیں۔ پھر بھی ہمارا جسم ہے کہ نہیں بھیگتا۔ ہمارے کپڑے ہیں کہ خشک رہتے ہیں۔ زمانہ ہمارے دائیں بھی ہے اور بائیں بھی۔ زمانہ ہمارے سامنے بھی ہے اور پیچھے بھی۔ زمانہ ہمارے اوپر بھی ہے اور ہمارے نیچے بھی۔ زمانہ ہمارے اندر بھی ہے اور ہمارے باہر بھی۔ ہمارا بدن اور ہماری روح زمانے کے سوا اور کیا ہیں؟ وہ جو مل رہے ہیں اور وہ جو بچھڑ گئے ہیں۔ وہ کون ہیں' وہ کون تھے؟ میں اور تم' جو ایک دوسرے میں سانس لے رہے ہیں۔ میں اور تم جو ایک دوسرے کا سکھ بھی ہیں اور دکھ بھی۔ آخر ہم کون ہیں؟ وہ جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں' وہ جو ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے تھے' وہ جو ایک دوسرے کی جدائی میں مر جاتے تھے اور رسائی میں جی اٹھتے تھے' وہ کون تھے؟ کون تھے وہ' کیا وہ زمانے کے سوا کچھ اور تھے؟

زمانہ ہی تو ہے جو ہمیں مارتا ہے اور ہمیں جلاتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو گزرتا ہے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور زمانہ ہی تو ہے جو کبھی نہیں گزرتا۔ ہاں' زمانہ کبھی نہیں گزرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستارے ہیں اور ہیں۔ کہکشاں ہے اور ہے۔ پہاڑ ہیں اور ہیں۔ سمندر ہے اور ہے۔ کیا تم کائنات کو بدلتے ہوئے دیکھتے ہو؟ کیا سورج کبھی نکلتا ہے اور کبھی نہیں نکلتا؟ کیا چاند کبھی ڈوبتا ہے اور کبھی نہیں ڈوبتا؟ یہی تو زمانہ ہے جو ہے اور سب کچھ ہے۔ یہی تو زمانہ ہے جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

جب تم سب کچھ کہنا چاہو اور بس ایک ہی لفظ کہہ سکو تو کہہ دو' زمانہ۔ اور جب تم کچھ بھی نہ کہنا چاہو اور سب کچھ کہہ سکو تو بس ایک لفظ کہہ دو' زمانہ۔ ہماری اور تمہاری ساری زباں دانی اور نکتہ سامانی' اس ایک لفظ کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے؟

ہم جو لمحہ بھی گزار رہے ہیں وہ آخری لمحہ ہے۔ زندگی اور آرزومندی کا آخری لمحہ۔ اور یوں تو لمحوں کا حساب اور شمار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہم گزرتے رہیں گے اور گزر جائیں گے اور لمحہ پھر بھی باقی رہے گا۔

کیا تم مجھے ایک بات بتاؤ گے' تمہارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ سوچو اور سوچ کر جواب دو کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ حقیقت کیا ہے جو نہ ہمارے ہونے سے بدلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے؟

تمہارے دانش مندانہ سکوت نے میرے سوال کا جواب دے دیا اور اس کے سوا اس سوال کا کوئی اور جواب تھا بھی نہیں۔ ہے بھی نہیں۔ وہ سب سے بڑی حقیقت گزرنا' گزرتے رہنا اور گزر جانا ہے۔ کیا ہمارے دکھوں میں سب سے بڑا دکھ یہ نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں' گزرتے جا رہے ہیں اور گزر چکے ہیں؟

ہمارے پاس دن' رات' ہفتے' مہینے اور برس نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس تو بس ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اور یہی ایک لمحہ ہمارے لیے دن' رات' ہفتہ' مہینا اور برس ہوتا ہے۔ ہم زمانے ہی میں ہوتے ہیں اور زمانے ہی میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ایک ہی تو پونجی ہے اور وہ خود ہم ہیں۔ اس گھڑی' اس لمحے اور اس پل کے ہم۔

اس گھڑی' اس لمحے اور اس پل کے ہم' نیا سال منانے والے ہیں۔ یہ سال، یہ صدی ہم نے جی جی کے اور مر مر کے گزاری ہے جس کے سال جو ہم نے اپنی نئی پہچان اور اپنے ہونے کے نئے دھیان کے ساتھ گزارے ہیں' وہ تو عجب کچھ تھے۔ اندھیروں اور اجالوں کے چار گھونٹ تھے اور اندھیروں اور اجالوں کی اونچائی اور نیچائی تھی جن کے بیچ ہم ہونے نہ ہونے کا دکھ رچا رہے تھے' سکھ منا رہے تھے۔

وہ دن اور پہلے کے وہ ہم' گزر گئے ہیں۔ اب ہم اپنے ہونے کا نیا پن بسر کرنا چاہتے ہیں۔ نئی خواہشوں' نئے خیالوں اور نئے خوابوں کے ساتھ گزر کرنا چاہتے ہیں۔ اور دیکھو' خواہش کے بعد نئی خواہش' خیال کے بعد نئے خیال اور خواب کے بعد نئے خواب کے ساتھ گزر بسر کرنا ہی زندگی ہے اور اب تو پہلے سے زیادہ اچھا موسم ہے۔ اب تو پہلے سے زیادہ اچھے دن ہیں۔ ہم نے تو بہت برے دن گزارے ہیں۔ کیا نہیں گزارے؟ ہم نے تو ان برے دنوں میں بھی اپنی امیدیں نہیں ہاریں۔ وہ ساری امیدیں ہمارے وجود میں مہک رہی ہیں۔ وہ ساری تمنائیں ہماری نمود میں دمک رہی ہیں۔ اب ہمیں نئی امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے گنگنانا چاہئیں تاکہ جمہوریت زندہ رہے' پاکستان تابندہ رہے۔

.....

آپ کے خط

عزیز قارئین!
السلام علیکم!

جنوری 2013...... کا شمارہ نئے سال کی آمد اور گزشتہ سال کے گزر جانے کا احساس لیے حاضر ہے۔ وقت کا پہیا یونہی گھومتا رہے گا، زندگی کے دن گھٹتے اور عمر بڑھتی رہے گی مگر یہ ایک اچھی بات ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمیشہ ایک تجسس چھپا رہتا ہے، جس کے سہارے انسان اپنی امید ٹوٹنے نہیں دیتا۔ بہرحال سالِ نو اور سسپنس کی سالگرہ کی بے حد مبارکباد اس دعا کے ساتھ کہ یہ سال امت مسلمہ اور ہم پاکستانیوں کے لیے خوش آئند ہو اور ہم آپ کے تحریری مشوروں کی روشنی میں پرچے کو مزید بہتری کی طرف لے جاتے رہیں۔ بے شمار دکھی لمحات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اربابِ اقتدار سے ایک عاجزانہ درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں کچھ صحیح ہو نہ ہو لیکن تعلیمی نظام میں بہتری کے آثار نظر آنے بہت ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ پچھلے دنوں حسن ابدال کے ایک اسکول ٹیچر نے بچے کو محض تاخیر سے اسکول پہنچنے پر اس طرح بے رحمی سے مارا کہ بچہ اپنی جان ہی گنوا بیٹھا۔ لہٰذا تدریسی عملے کی نا صرف علمی قابلیت بلکہ اخلاقی اور نفسیاتی تربیت بھی بے حد اہم ہے۔ معلوم نہیں ناقص تعلیمی نظام کی وجہ سے ملکی حالات تباہ ہیں یا ملکی حالات کی وجہ سے نظامِ تعلیم کا یہ حال ہے۔ جو بھی ہو مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بہترین اور یکساں نظامِ تعلیم اور قابل اساتذہ ہماری نسل کی بقا اور شاندار مستقبل کی ضمانت ہیں...... اس کے ساتھ خوشخبری یہ ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے اسنوکر کے کھلاڑی محمد آصف نے بلغاریہ میں ایک بین الاقوامی مقابلے میں شاندار فتح حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن کیا۔ عالمی چیمپئن شپ کا یہ اعزاز پاکستانی کھلاڑی محمد یوسف کے بعد اب محمد آصف کے پاس ہے۔ (مبارک ہو) ہماری نوجوان نسل کا یہی جذبہ ہونا چاہیے۔ پاکستانی قوم کی یہی شان ہے وہ روتی ہے تو اپنے لیے ہنسنے کا سبب بھی خود ہی تلاش کر لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں ہمارے وطن کو ان گنت کامیابیوں اور ترقیوں سے نوازے...... ہمیشہ سلامتی اور بقا قائم رہے (آمین) سنہرے خوابوں اور خوش گفتاریوں کے سنگ ذرا ہم بھی رخ کرتے ہیں اپنی جھنکارتی محفل کی جانب۔

✠ **ابن مقبول جاوید احمد صدیقی**، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”انتہائی سادہ مگر پُرکشش ٹائٹل جو منفرد سا لگا...... ذاکر جی ویل ڈن۔ سسپنس تو کئی سالوں سے زیرِ مطالعہ ہے۔ کچھ انتہائی مصروفیت کی وجہ سے حاضرِ مجلس نہ ہو سکا۔ پہلے تو عرض ہے کہ کئی ماہ و سال سے پہلے والی مجلس ”آپ کے خطوط“ کو رونق بخشنے والے کہاں چلے گئے؟ مثلاً ضیاء الرحمان، سانگھڑ، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بھکر، شان گشکوری، بشریٰ باجوہ، بشریٰ افضل، سعدیہ ہما شیخ، طاہرہ یاسمین، ارم خان وغیرہ۔ بھئی پہلی فرصت میں ہماری طرح محفل کی رونق بڑھائیں۔ ہاں محترم ریاض بٹ، ہمایوں سعید بنوں اور انجم فاروق ساحلی وقتاً فوقتاً ریگولر رونق بڑھا رہے ہیں۔ اصل میں محترمہ روشنی رشید کا تبصرہ پڑھ کر میں بھی ان کا ساتھ نبھانے چلا آیا۔ بہترین تبصرہ و خط احسان سحر میانوالی کا تھا۔ بھرپور تبصرہ خوب گہرائی لیے ہوا تھا۔ قیصر اقبال کلول نے بھی بھرپور تبصرہ اور چھیڑ چھاڑ میں حصہ لیا۔ شاہد عمران آپ کے لیے لمحۂ فکریہ کہ محمد جاوید بلوچ نے آپ پر چربہ سازی کا الزام لگا دیا ہے؟ یار ہمایوں سعید سچ تو یہ ہے کہ خوب صورت عورت کے ساتھ 90 فیصد عام شکل کے مرد ہی نظر آتے ہیں؟ یہ اس صنفِ نازک کی مہربانی نہیں ہے کہ ایسے اچھے کردار کے مردوں کو بھی قبول کر لیتی ہیں۔ مگر مرد جیسا بھی ہو، کالا گورا، خوش شکل، بے حد بدشکل سب دنیا کی حسین ترین بیوی کے لیے ہی کوشاں رہتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی جی صرف دو تین لائنوں کا تبصرہ؟ تصویر العین صاحبہ سالگرہ مبارک ہو۔ ویسے بھی اس بار صرف تین ہی آپ لوگ محفل میں حاضر ہوئی ہیں؟ یعنی ماریہ فاروق اور سعدیہ بخاری؟ یہ ماہا ایمان جی کہاں ہیں؟ حمیرا رضا اور دل نشین؟ اور بقول سعدیہ بخاری کے یہ امریکن سنڈی کے موافق غائب حضرات مانسہرہ کے ڈبل ایم اے اور محمد نعمان خوشبو لگا کے آ جاؤ بھی۔ رضوان تنولی صاحب لکھتے ہیں کہ میں تو صرف سسپنس کی پہلی تاریخی کہانی اور قسط وار سلسلے پسند کرتا ہوں اور تبصرے میں دوسری کہانیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے؟ خیر اچھی بات ہے؟ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ ہمارے سسپنس میں کہانیوں کا انتخاب بھی بے حد شاندار ہوتا ہے۔ تاریخی کہانی، آخری صفحات پر بے مثال انتخاب، اسلامی کہانی اور ملک صفدر حیات کی بہترین جاسوسی کہانی اور پھر کچھ بدیسی مگر شاندار ترجمے اور مزاح و مداح سے بھرپور ہماری معاشرتی کہانیاں، اسی لیے قاری صفحہ ایک سے 290 صفحہ تک سسپنس کے ہر لفظ کے حصار میں بندھا ہوا رہتا ہے اور اس کے پیچھے بھی کم از کم چار دہائیوں کی عرق ریز محنت، مسلسل بہتر سے بہتر کی تلاش اور وہ کر گزرنا جو دوسروں کے لیے ناممکن ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد ہمیشہ سے چھائے رہے۔ بت شکن بھی ماضی کے سبق آموز اور عبرت آموز واقعات سے بھرپور رہی۔ مگر کاش انسان ماضی سے سبق حاصل کر سکتا۔ مگر وائے قسمت! کاشف زبیر کی مختصر مزاح بے حد زبردست رہی۔ شرمین اور فرید کے کردار بھی خوب تھے واہ کاشف صاحب! نک ویلوٹ جب بھی آیا، چھا گیا دوسرے دلوں پر۔ اس دفعہ بھی بلی کی چوری انوکھی روداد بنی رہی۔ جاسوسی! انوکھا طریقہ اور بے چاری بلی بھینٹ چڑھ گئی۔ ایک مائیکرو فلم کے لیے! واقعی عشق اور سیاست میں سب جائز ہے۔ پہاڑ اوجھل ابھی زیرِ مطالعہ ہے یقیناً دل موہ لینے والی روداد ہوگی ملک صاحب زندہ باد۔ یہ ہیں ہمارے نامور اور انتہائی بامعنی اور گہرائی لیے ہوئے کہانیوں کے خالق جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب اور ایک اور شاہکار، یادگار اور پُراثر واقعہ کہانی لے آئے ہیں۔ ”خوئے نہاں“ اور انجام بھی زبردست۔ رافیہ، آغل خان، غلامو، توفیق اور امتیاز کے گرد گھومتی ایک معاشرتی کہانی۔ گوشۂ عافیت وائٹ کے لحاظ سے انوکھی سائیکالوجی کی حامل کہانی رہی اور مزہ دے گئی۔ مسافر ابھی زیرِ مطالعہ ہے اور مریم کے خان کی پیش عقل یقیناً اس ماہ کی سب سے بہتر بلکہ بہترین کہانی رہی۔ ان تقص کے حامل بچوں کا آپس کا اتفاق، پیار، احساس ذمے داری، لوگوں کے منہ پر تھپڑ ہے کہ جو کچھ یہ آج کل ہو رہا ہے۔ عقل نہیں ہے مگر عقل کے اندھوں سے زیادہ ذہن ہے۔ کمائی و مائی، منظر امام نے انوکھا طریقہ سو اردات صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ واہ رکشا کی آمدنی کیسے کیسے طریقے سے بنائی گئی۔ چار سمت ایک چوراہا تو احمد اقبال کی سدا کی طرح دل کو چھوتی ہوئی، عقل کی تہوں میں بستی چلی گئی۔ میں نے اس طرح پڑھی جیسی کیفیت مسمریزم زدہ انسان کی ہوتی ہے۔ زبردست انمول موتی لگا۔ کشکول کی کیا تعریف کروں۔ اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین کے ارد گرد بے پناہ خوب صورت واقعات میں 50 فیصد صرف کشکول کے لیے سسپنس لیتا ہوں۔ اب یہ ہے کہ لوچن اور روشنو کے ساتھ کیا ہوگا؟ اور شیخ حامد کے لیے خفیہ راز کھولنے والے کی بھی قلعی کھولیں؟ کون غدار ہے؟ اگلے ماہ کا انتظار بے قرار...... صفحہ 15 پر محی الدین نواب کی سحر انگیز قلم سے لکھی کہانی کا جس کا وعدہ ہوا ہے انتظار ہے بے تابی سے۔ کیا یہ سسپنس 5 تاریخ کو نہیں آ سکتا؟ خرم صاحب بٹ صاحب کی والدہ محترمہ اور محمد الیاس خان کی والدہ کے لیے فرداً فرداً دعا کی اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کریں اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔ محفلِ شعر و سخن میں تینوں قارئین کی بہترین کاوش تھی اور شعروں میں سے بابر عباس، محمد قدرت اللہ نیازی، سعدیہ بخاری، احسان سحر اور زرمین خان کی کاوش خوب تر تھی۔ تفصیلی تبصرے کا شکریہ

✠ **طاہر عباس**، کوٹلی آزاد کشمیر سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”آپ کے سسپنس ڈائجسٹ کی تو بات ہی الگ ہے، یہ منفرد ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔ میرا اور سسپنس ڈائجسٹ کا ساتھ ”موت کے سوداگر“ کی پہلی قسط سے ہے اور آج تک قائم اور دائم ہے۔ سسپنس کا ایک سحر ہے جس سے نکلنا تو ناممکن ہے۔ شدت سے اس کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ اتنا لمبا عرصہ ہو گیا سسپنس پڑھتے ہوئے لیکن پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے قابلِ اشاعت ہوگا (خوش آمدید) ایک کہانی تاریخی اور ایک اسلامی جن سے بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ رائٹرز میں ڈاکٹر ساجد امجد، طاہر جاوید مغل، ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف زبیر اور محی الدین نواب پسندیدہ ہیں، یہ سب لوگ سسپنس کو چار چاند لگاتے ہیں۔ فاتح پوری پڑھنے سے جذبہ جہاد کی ترغیب ملتی ہے۔ فاتحِ اسلام صلاح الدین ایوبی کی فتوحات پر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں امتِ مسلمہ کو ایسے ہی انقلابی سپہ سالار اور رہنما کی ضرورت ہے۔ انوکھا ملاپ میں حامد نے ثابت کر دیا کہ محبت بڑی طاقت ہے۔ قسط وار کشکول بھی زبردست جا رہی ہے، لیاقت حسین کا روحانی کردار بھی اپنی مثال آپ ہے۔ صدیقی صاحب کے تمام کردار کہانی سے انصاف کرتے نظر آتے ہیں خاص طور پر سراج، میڈم، اورنگ زیب وغیرہ۔ بیگ انکل کی دائمی نجات بھی ٹھیک تھی۔ بوڑھا درخت میں نصیحت ہے کہ امید پہ دنیا قائم ہے، ناامیدی انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ مسافر بھی میری پسندیدہ کہانی ہے، شاندار سلسلہ ہے۔ ممنوعہ میں نواب صاحب نے معاشرے کے ایک دردناک موضوع کو جلا بخشی۔ بے راہ روی ہمیشہ معاشرے کو دیمک زدہ کر دیتی ہے۔“

✠ **ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں**، گجرات سے شریک محفل ہیں ”اس بار ماہنامہ سسپنس 21 نومبر کو ملا۔ حسینہ سرورق اس سال بھی ملک کے حالات بہتر نہ ہونے کی وجہ سے اس سال کے اختتام پر کسی ستون کو بانہوں میں تھامے ہوئے پائی گئی۔ سب سے پہلے جون ایلیا مرحوم کی، ایک آرزو کی خیر خبر لی جس پر تبصرے کے لیے ہمیشہ کی طرح اب بھی معذرت۔ محفلِ یاراں کا رخ کیا تو میدان کے اکھاڑے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے والے قیصر اقبال قلابازیاں لگاتے ہوئے پائے گئے اس سے دل نہ بھرا تو انہوں نے سات آٹھ منٹ بعد پھر فرطِ جذبات سے ایک قلابازی لگائی۔ حسنین عباس بلوچ، آزادی مبارک ہو۔ تصویر العین صاحبہ سالگرہ کے بجائے اگر لوگ سہ روزہ سالگرہ مناتے تو میری اور آپ کی سالگرہ اکٹھی ہوتی کیونکہ 21 دسمبر کو ہماری بھی سالگرہ ہے۔ بہرحال ہماری طرف سے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ احمد خان توحیدی آپ کا تبصرہ نہایت ہی خوب صورت تھا۔ رمضان پاشا صاحب آپ کو ٹریجڈی مناظر بھلا کیوں اچھے لگتے ہیں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ سب ہمایوں سعید کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔ رہنے دو، ابھی بچہ ہے کھیلنے کودنے دو اسے۔ اب ایک نظر کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے ماضی کے جھروکوں سے لی گئی کہانی۔ بت شکن کا دیدار کیا اور محمود غزنوی کی بے پناہ فتوحات پر اسے سیلوٹ کرنے میں کسی بھی طرح بخل سے کام نہیں لیا۔ پہاڑ اوجھل میں بجے کے کردار نے الجھن میں الجھائے رکھا۔ انوار صدیقی کی سلسلہ وار کہانی کشکول زلفِ یار کے پیچ و خم کی طرح ایک معمایی ہوئی ہے۔ میڈم روبی کا سراپا حسن اور شبنم کے خوب صورت ہونٹ کسی بھی قسم کی قیامت ڈھانے سے اب قاصر ہیں۔ مسافر بہتر سے بہتر ہو رہی ہے۔ شاہد سلیم کے کردار کے جنونِ عشق نے اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھا۔ چار سمت ایک چوراہا میں حرام طریقوں سے کمائی گئی دولت سے اولادِ نرینہ کی پرورش کرنے والے خود بھی عذابِ الٰہی سے نہ بچ سکے اور ان کی اولاد اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے بھی خوش اور مطمئن زندگی نہ گزار سکی۔ باقی ڈائجسٹ ابھی تک خرابیٔ صحت کی بنا پر زیرِ مطالعہ ہے۔“ (اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے۔ آمین)

✠ **اے۔ ایم چودھری**، احمد پور شرقیہ سے چلی آ رہی ہیں ”دسمبر کا سسپنس 2 دن لیٹ، بڑے انتظار کے بعد 20 نومبر کو ملا، جتنا انتظار سسپنس کا کرنا پڑا اتنا تو میں گھر والوں کا بھی نہیں کرتی، خیر ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔ واہ کیا بات ہے بڑے عرصے بعد مجھے ٹائٹل پسند آیا ہے، جہاں پیاری معصوم دوشیزہ پلر کے ساتھ کھڑی کسی کی یاد میں کھوئی کھوئی سی لگی۔ اس کے بعد اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے سیدھی محفلِ دوستاں میں جا پہنچی جہاں پر قیصر اقبال کلول صاحب کرسیٔ صدارت پر براجمان نظر آئے۔ بھائی جان آئے او، تے چھا گئے ٹھاہ کر کے۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔ بہت اچھا تبصرہ لگا آپ کا۔ دوسرے نمبر پر جاوید بلوچ صاحب بونگیاں مارتے نظر آئے لیکن بھیا تبصرہ اچھا لگا۔ ہمایوں سعید راج یہ آپ اپنی عادت بتا رہے ہیں کہ ترجیحی بنیادوں پر آپ نے محبت کی اب یہ پتا نہیں کتنی بار کی خیر اب کی بار تو نبھا لیجیے گا ورنہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ حسنین عباس بھیا اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے (آمین) انجم فاروق صاحب کے پین کی انک شاید کم تھی یا کوئی نوٹ بک دستیاب نہیں تھی جو اتنا مختصر خط لکھا۔ بھیا اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔ تصویر العین سسٹر ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، اللہ عزوجل آپ کو لمبی عمر یا عطا فرمائے (آمین) انکل احمد خان توحیدی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اور انکل آپ ہمارے بزرگ ہیں اور بزرگوں کو بچوں کے درمیان موجود رہنا چاہیے تو پلیز آتے رہیے گا۔ مانا کہ تفسیر انکل اور بابر عباس ہمارے ضعیف العمر بزرگ ہیں لیکن آپ بھی شرکت کریں گے تو خوشی ہوگی۔ رمضان پاشا بھائی ابھی شادی ہوئی نہیں اور خون کی کمی ابھی سے۔ بیوی آنے کے بعد کیا بنے گا، جب بیوی کی ڈانٹ سے روزانہ خون خشک ہوگا۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب جب آپ ہر معاملے کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں تو ماہا کی اصلیت بھی سمجھ لو، ارے میں بھول گئی کسی خاص کی اصلیت جاننے کے لیے بھی اعلیٰ دماغ چاہیے اور وہ آپ کے پاس...... آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ بابر عباس انکل جی کیسے ہیں آپ اور آج کل بڑی خوش فہمی میں کیوں مبتلا ہیں؟ اگر ہماری آنٹیاں محفل میں شرکت نہیں فرما رہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا ڈر ہے جناب۔ ویسے اپنے بارے میں تو بتائیے آپ کس گارڈن کے آلو ہیں۔ یاسر علی بھائی کیا اب بھی چاچو سے لے کر پڑھتے ہیں یا خود ہی اپنی جیب ہلکی کر لیتے ہیں، خوش آمدید۔ محفل میں اب ڈر کر بھاگ مت جائیے گا۔ سعدیہ بخاری ڈیئر آہستہ آہستہ یہ کرخت حضرات نعمان پیارے کی طرح گم ہو جائیں گے جس طرح اپنی ماہا کی آمد پر تفسیر میاں گم ہو گئے ہیں۔ ماریہ فاروق سسٹر صوبیہ تفسیر بابر، تفسیر عباس بابر کی وائف اور عون کی والدہ محترمہ ہیں۔ ریاض شاہد بھائی بہت مبارک ہو آپ کو، اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب عطا فرمائے اور برے کاموں سے دور رکھے (آمین) رضوان تنولی صاحب لگتا ہے کہ آپ کی دم ہے جو ہر وقت آپ کو دم یاد رہتی ہے دھیان کیجیے گا اگر آپ کی دم پر کسی کا

✠ **نورین صبا**، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کررہی ہیں ”اس سال کا آخری شمارہ اب کے 16 تاریخ کو ہی ہاتھ آ گیا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی بہت بھلا لگا۔ سادہ مگر بے حد جاذب نظر۔ گزشتہ سال ایسا گزرا کے آہٹ بھی نہ ہوئی۔ شاید ہم اپنے شہر کے حالات سے سکتہ میں رہے۔ محرم الحرام بہت خوف کے ساتھ شروع ہوا۔ لیجیے دیکھتے ہی دیکھتے 4 شہروں میں دھماکے۔ گیس کی فراہمی الگ معطل، لگتا ہے ہم نے اپنے آپ پر رحم کرنا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے بت شکن میں سلطان محمود غزنوی پر بہت دلچسپ اور تحقیق سے بھرپور تحریر کی ہے۔ بہت معلومات میں اضافہ ہوا۔ کاشف زبیر کی تحریر منتقم مزاج کیا خوب کہانی ہے۔ بہت ہی نصیحت آمیز، گریم جیکسن کا ایک بازو کٹ گیا لیکن دوسرے بازو یعنی پوتے نے کیا خوب کام دکھایا۔ کشکول میں انوار صدیقی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بلی کی چوری میں ٹنک ویلوٹ 007 ایجنٹ بنے رہے۔ پہاڑ اوجھل میں ملک صفدر کی محنت اور ایمانداری کی کیا بات ہے۔ خوئے نہاں جیسے کردار ہمارے معاشرے میں اکثر و بیشتر نظر آتے ہی رہتے ہیں، کبھی چہرے بدل کر کبھی حالات اور خدوخال بدل کر، لیکن ڈاکٹر عبدالرب کے قلم کا نشتر وڈیرا شاہی کے ناسور پر خوب چلا۔ تنویر ریاض صاحب کی گوشہ عافیت انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ مسافر میری پسندیدہ کہانی ہے۔ میں سب سے پہلے کتر نیں اور اس کے بعد مسافر پھر باقی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ شہریار کو بہت بڑی مشکل میں ڈالا گیا وہ بھی بے یارومددگار، کہانی میں تیزی کے ساتھ دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ احمد اقبال کی چارسمت ایک چوراہا بہت طویل کہانی۔ معاشرے کی بے حسی کا بھرپور اظہار، لیکن مجھے بہت اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ قصہ چہار درویش کو جدت دے کر توڑ مروڑ کے رکھ دیا گیا۔ میری دعا ہے جنوری 2013ء کا سالگرہ نمبر بہترین ہو۔“

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”اس بار سرورق سادہ تھا، ساتھ ہی دلکش بھی۔ اس ماہ کا انشائیہ حسب حال تھا، یعنی وطن عزیز کے موجودہ حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے قیصر اقبال بھائی مبارک باد۔ محمد جاوید بلوچ بھائی آپ کی ادھوری مجبوری پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ تصویر العین صاحب میں کسی بھی معاملے سے گھبراتا نہیں ہوں۔ کھاریاں والے بابر عباس بھائی آپ کی دعا مجھے پسند نہیں آئی کیونکہ مجھے اپنے گلے میں ڈھول لٹکانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔ اشعار کی محفل میں یاسر علی راجپوت کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ صوبیہ کفیر بابر کا چناؤ بھی لاجواب تھا۔ بت شکن، یہ شہرہ آفاق تاریخ پڑھی ہوئی ہے مگر کہانی کا لکھا ہوا قصہ زیادہ لطف دیتا ہے اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ منتقم مزاج، کہانی بہت عمدہ تھی لیکن اسے اتنی زیادہ وسعت دینے کی ضرورت نہ تھی۔ کشکول، یہ دبنگ کہانی اب اپنے اختتام کی طرف گامزن ہوتی نظر آرہی ہے۔ یہ رائے مسافر کے لیے صحیح نہیں ہے۔ بلی کی چوری، میں ٹنک ویلوٹ نے اپنی خداداد صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا، کہانی مزیدار تھی۔ پہاڑ اوجھل، میں وہی تفتیش وہی بھاگ دوڑ، آخرکار مشکل مرحلہ نمٹا ہی دیا۔ حسام بٹ زندہ باد! گوشۂ عافیت، پسند نہیں آئی۔ خوئے نہاں بھٹی صاحب نے اپنی دیرینہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس بار بھی وڈیرا شاہی کی نسبت ایک دبنگ کہانی تحریر کی ہے جو کہ کافی عرصہ یاد رہے گی۔ پیش عقل میں سانولی لڑکی کی حکمت عملی سے ریس ہی معطل کر ڈالی یوں اپنی شکست سے بچ گئی، بچوں کے لیے ایک اچھی کہانی تھی۔ کمائی و مائی میں کمائی تو ہو ہی رہی تھی لیکن ومائی ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ چارسمت ایک چوراہا، آیا یہ تو ایک ٹکٹ میں چار مزے والی کہانی تھی، اقبال صاحب نے اس کہانی میں بہت سوں کا پول کھول کر رکھ دیا، ساتھ ہی بہتوں کا بھلا بھی کر ڈالا، مدتوں یاد رہے گی یہ کہانی۔ سرمد شہید کا نام تو سن رکھا تھا مگر قصہ اب سامنے آیا۔“

✠ **ارسل کاظمی**، آزاد کشمیر سے محفل میں چلے آرہے ہیں ”میں عرصۂ دراز سے سسپنس کا خاموش قاری ہوں اور پہلی مرتبہ اس خوب صورت محفل میں شامل ہونے کی جسارت کررہا ہوں (خوش آمدید) سسپنس بلاشبہ ایک معیاری پرچہ ہے اور میں نے ہمیشہ اسے اپنے دوست کی طرح ہی پایا ہے۔ اپنی پسندیدہ محفل، محفل خطوطاں کی طرف بڑھے اور محفل کے شرکا کی فقرے بازیوں اور شرارتوں سے محظوظ ہوئے۔ کرسی صدارت پر قیصر اقبال کو جلوہ افروز پایا، مبارک ہو اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے مسافر اور کشکول کا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ دونوں عمدہ تحریریں ہیں اور معاشرے میں جرائم کے ساتھ ساتھ اصلاح کے پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ احمد اقبال کے قلم سے چارسمت ایک چوراہا ایک شاندار اور سبق آموز تحریر تھی۔ چاروں دوستوں کی منزل درست تھی مگر راہ کا انتخاب انہیں راس نہ آیا اور چاروں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ دیگر تحریروں میں پیش عقل ایک ایسے جذبے کی دعوت دیتے ہوئے جو فی الحال پاکستانی قوم میں مفقود ہے، عمدہ تحریر تھی۔ کمائی و مائی بہت جلد محبت میں گرفتار ہو کر لٹ جانے والے ایک بے وقوف عاشق کی ناکامی اور انکشاف کی داستان تھی۔ بلی کی چوری، پہاڑ اوجھل، خوئے

✠ **سہیل طارق**، گوجرانولہ سے پنجابی وچ لکھتے ہیں۔ ”یار سچی گل ایہہ اے کہ سسپنس مینوں بڑا چنگا لگدا اے۔ قیصر اقبال کلول نے تے ایدکی واقعی میدان مارلیا اے۔ وہ جی گل ایہہ اے کہ ساڈا شہر ”گجراں“ دا شہر اے۔ جے تسیں کدی تشریف لیاؤ تے ”مجھ“ دا نخالص دودھ پیانواں گے۔ اک ایہہ گل دسو کہ جے میں پنجابی زبان وچ لکھ کے کوئی کہانی بھیجاں...... تے اوہنوں سسپنس وچ چھاپ دیو گے؟...... ورائٹی ہووے گی۔“

”یار طارق! تیری کدرے مت تے نئیں ماری گئی اے۔ اردو زبان دے پرچے وچ پنجابی دی کہانی کینویں چھپ سکدی اے۔ باقی رہی نخالص دودھ دی گل تے...... مینوں اک گل دس، تینوں میرے نال دشمنی کی اے۔ کراچی وچ پوڈر دا دودھ پی کے ساڈے وچ انی ساں نہیں رہی کہ نخالص دودھ دا مزہ چکھ سکاں۔ گجراں دے شہر وچ انشاء اللہ تہاڈے نال ملاقات ضرور ہووے گی۔ پنجابی زبان مینوں چنگی طرح نہیں آوندی۔ کوشش کیتی اے۔ قیصر اقبال کلول ہوراں تہاڈی تریف توں ایمان نال بڑے ہی خوش ہوئے نے۔ اس میرے یار تے تہاڈا شکریہ ادا کیتا اے۔“

نہاں اور منتقم مزاج اوسط درجے کی کہانیاں تھیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ محفل شعروسخن میں عدنان یوسف اور جنید احمد ملک کے اشعار عمدہ تھے۔“

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں ”دسمبر کا سسپنس بروقت مل گیا، سرورق میں ایک حسینہ نظر آرہی تھی۔ اس

پاؤں آ گیا تو...... اور جناب صنف نازک کو آپ جیسے بھوتوں سے نہ خوف پہلے تھا نہ اب ہے۔ یاسر علی راجپوت، عون بابر عباس، قدرت اللہ نیازی اور غلام رسول خان کے اشعار بہت پسند آئے۔ اس کے بعد سیدھی مسافر کی خبر لی جہاں شہریار صاحب پل میں ماشہ پل میں تولہ والی صورت حال سے دوچار نظر آئے، مار دھاڑ کر کے آخر نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ یہ قسط بہت زبردست رہی حالانکہ لگتا تھا کہ اناڑی پڑھ رہی ہوں، ہر دومنٹ پر اغوا لیکن بہرحال بہت مزہ آیا یہ قسط پڑھنے کا، اب دیکھو شاہد سلیم کے لیے شہریار کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد کشکول میں چھلانگ لگائی جہاں اورنگ زیب اور سراج ایکشن میں نظر آئے وہیں شیخ حامد کی حالت سے مزہ دوبالا ہو گیا۔ اب لگتا ہے کہ اس ناسور کے دن تھوڑے ہیں۔ پلیز اینڈ میں اورنگ زیب یا سراج کو کچھ مت کیجیے گا یعنی مت ماریے گا۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے تو تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔“

✠ **عدنان یوسف**، بنوں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”اس سال کا آخری رسالہ دسمبر سے پورے گیارہ دن پہلے مل گیا، یہ ہوا کمال نمبر 1 کہ مہینا شروع ہونے سے پہلے رسالہ مل جائے، سرورق میں ہمیشہ کی طرح خوب صورت لڑکی، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ محفل یاراں میں کرسی کنٹری پر قیصر اقبال کلول صاحب موجود تھے جو پچھلے میچ (ماہ) کا کنٹری (تبصرہ) پورے خشوع وخضوع سے کررہے تھے، محمد جاوید بلوچ کسی ماہا ایمان نامی جڑی بوٹی کی بات کررہے تھے اور ایک بار پھر قیصر اقبال...... یہ ہوا کمال نمبر 2...... ماریہ فاروق ہر دفعہ رسالے کی قیمت کا رونا روتی ہے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، جو اس دفعہ ایک ہی زاویے کے گرد گھومتی ہوئی نظر آئی۔ ہاں شاہد سلیم کی انٹری پسند آئی، کشکول کا اب آخری وقت آرہا ہے اور اس کے ساتھ شیخ حامد کا بھی...... مختصر کہانیوں میں ٹنک ویلوٹ کی بلی کی چوری بے حد پسند آئی۔ کاشف زبیر صاحب منتقم مزاج اور عبدالرب بھٹی کی خوئے نہاں بھی اچھی کہانیاں تھیں۔“

✠ **حبیب احمد**، کرک سے محفل میں چلے آرہے ہیں ”یہ میرا کسی بھی شمارے میں پہلا خط ہے (بہت دیر کی مہرباں......) دسمبر کا شمارہ 23 نومبر کو ملا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے جس میں حسام بٹ کی والدہ کی انتقال کی خبر سن کر افسوس ہوا اور شمارہ چھوڑ کران کے لیے سورۃ یٰسین پڑھی اور واپس آ کر اپنی پسندیدہ کہانی مسافر پر نگاہ دوڑائی جس میں شہریار ایک دلدل سے بچ کر دوسری دلدل میں دھنستا جارہا ہے (شاید آپ تصور کی آنکھ سے دیکھ بھی رہے ہیں) اور اس کے بعد حسام بٹ کی تحریر پڑھی جو کہ بہت اچھی تھی اور آخر میں چارسمت ایک چوراہا، پڑھی۔ جس میں مجھے سمتوں کی سمجھ آ گئی لیکن چوراہے کی سمجھ نہیں آئی۔ اس کے علاوہ مسافر کی کتنی اقساط باقی ہیں وہ بھی بتا دینا۔ مطلوبہ کتاب کے بارے میں مجھے جواب ضرور دینا میں انتظار کروں گا آپ کے جواب کا۔“ (مشکل ہے)

✠ **ایم رضوان ملغانی**، کاسی اسٹریٹ، کوئٹہ سے تشریف لائے ہیں ”کافی عرصے سے خاموش ہوں...... لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں پاتا الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، کیا کہوں کہ سسپنس عمدہ ہی نہیں عمدہ ترین ہے (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ) کردار تخلیق کرنا، انہیں ایک سانچے میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ یہ صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس فن سے وابستہ ہیں۔ یہ جسارت ہر کوئی نہیں کرسکتا پر ایک ادنیٰ سی کوشش اس ناچیز انسان نے بھی کی ہے۔ امید ہے پڑھ کر رائے ضرور دی جائے گی۔“ (پڑھ کر رائے قائم کی جائے گی)

✠ **تنویر آصف چودھری**، دینہ، جہلم سے چلے آرہے ہیں ”سسپنس سے میرا تعلق تو پرانا ہے شاید ہی اب کوئی پرانا ڈائجسٹ مجھ سے بچا ہو پر محفل میں شرکت فرسٹ ٹائم ہے (خوش آمدید) خط لکھنے کا مقصد صرف ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ رب کائنات ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور زور قلم اور زیادہ کرے آج کے دور میں کتابوں کو ہاتھ لگانے کو جی تو بہت چاہتا ہے پر ٹائم نہیں ملتا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا ہی حوصلہ ہے جو کتابوں سے گوہر نایاب چن چن کر ہمارے لیے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے ایک استدعا ہے کہ دجال کے بارے میں لکھیں یہ ان کی ایک عظیم اسلامی خدمت ہوگی اور اپنی قوم پر احسان بھی۔ باقی سسپنس کی ساری تحریریں معیاری تھیں۔ مرزا صاحب کی دائمی نجات سبق آموز تحریر تھی۔ مسافر ایک زبردست کہانی ہے جو دن بدن زور پکڑتی جارہی ہے اور نواب صاحب کی کیا بات ہے۔“

✠ **نوید انجم بٹ**، گہیاں، گجرات سے محفل میں شریک ہورہے ہیں ”میں 2002ء سے ماہنامہ سسپنس کا مستقل قاری ہوں اس سے پہلے بندۂ ناچیز گاہے بگاہے محفل شعروسخن میں شرکت کرتا رہا ہے اور اسی حوصلہ افزائی کی بدولت پہلی بار محفل یاراں میں شریک ہورہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ خوش آمدید کہیں گے (خوش آمدید) حسینۂ سرورق کو ذاکر انکل نے فرصت کے لمحات میں بیٹھ کر اپنے خوب صورت شاہکار کو سسپنس کی زینت بنایا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کے انشائیہ ایک آرزو کو سرسری پڑھا پھر محفل یاراں میں پہنچے جہاں پر قیصر اقبال مسند صدارت پر فائز تھے مبارک ہو بھائی آپ کے تبصرے سے یہی لگا کہ آپ کرکٹ کمنٹیٹر ہیں بچ کے رہنا اب ہر کوئی زیر عتاب ہے کیا کرکٹ کیا امپائر کیا کمنٹیٹر۔ اب آگے قدرت اللہ بھائی کا مشہور جملہ بولوں گا کہ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔ محمد جاوید بلوچ کا طاہرہ گلزار کو دیا گیا جواب کافی پسند آیا۔ تصویر العین اوکاڑہ، سالگرہ مبارک ہو۔ قدرت اللہ نیازی صاحب شیر خان کی صدارت کرسی پر پھولے نہیں سمارہے تھے اسے کہتے ہیں غیروں کی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ باقی لگتا ہے کہ بابر عباس نے ڈائجسٹ ملتے ہی تبصرہ کردیا تبھی تو کہانیوں پر تبصرہ غائب ہے۔ ماریہ فاروق بجلی کی مانند محفل میں وارد ہوئی اور پلک جھپکتے ہی چلی گئی باقی۔ راجا ثاقب اور نعمان پیارے کی کمی بھی دل دکھارہی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بت شکن پڑھی جس میں نگاہوں سے اوجھل محمود غزنوی کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد سے گزارش ہے کہ کبھی رضیہ سلطان کے حالات سے بھی پردہ اٹھائیں۔ پہاڑ اوجھل میں ملک صفدر نے باقی تھانیداروں کے برعکس معاملے کی سنگینی کو انتہائی سمجھداری سے سلجھا دیا۔ انوار صدیقی کی کہانی کشکول بور کررہی ہے۔ ناصر ملک کی مسافر میں شہریار کی مشکلات ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ احمد اقبال کی چارسمت ایک چوراہا۔ احمد اقبال اس میں تعلیم کا قصور نہیں بلکہ قصور ان کی منفی سوچ کا ہے اگر یہ پڑھے لکھے چاروں دوست مطمئن نہیں تو دوسری طرف ہم جیسے ان پڑھ گنوار بھی اپنی طرز زندگی سے بھی مطمئن نہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

کے بعد انشائیہ میں حاضری دی۔ گلے شکووں سے دعائیہ انداز، انشائیہ نے سوچ کے در وا کیے۔ انسان کے رویے و اسرار و رموز کے پردوں میں چھپے ہوئے عیاں ہوئے۔ آگے چل کر محفل میں داخل ہوئے جہاں سب سے پہلے نمبر پر قیصر اقبال کلول تھے۔ مبارکباد اور دوستوں کے کتوب بھی شامل تھے۔ اپنی حاضری بھی نظر آئی۔ آگے بڑھے تو مسافر کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس مرتبہ کی قسط سنجیدہ اور ایکشن سے یکسر بھرا تھی، کشکول بھی اپنا سفر کامیابی سے جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد تاریخی واقعات سے مزین بت شکن پڑھی جس میں محمود غزنوی کے حالات و واقعات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ وہ ہمت و جرأت کا پیکر تھا اور تاریخ میں بت شکن کے نام سے مشہور ہوا۔ مختتم مزاج نے اچھا تاثر دیا۔ بلی کی چوری تک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ تھا۔ پہاڑ او جھل اور خوئے نہاں نے بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھی، محفل شعر و سخن میں بھی معیاری اشعار اچھے لگے۔ گوشۂ عافیت میں بیوی سے اتنا بیزار ہوا اور اس کو قتل کر دیا۔ پیش عقل میں ریس میں حصہ لینے والی بچیوں نے اچھا درس دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے سرمد شہید لکھ کر تاریخ کے گمنام جھروکوں سے پردہ اٹھایا۔ اللہ والے کے دلوں کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح آخری صفحات کی خوب صورت کہانی چارست ایک چوراہا احمد اقبال جیسے بے مثال لکھنے والے کی بہترین تحریر تھی۔ کہانی کا اختتام بھی اچھے انداز میں کیا گیا۔''

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ''دسمبر کے شمارے میں خوب صورت سی لڑکی مشرقی انداز میں کسی شعر کی تفسیر بنی کھڑی ہے۔ ذاکر، انکل ویلڈن۔ جون ایلیا کراچی کی صورتِ حال پر افسردہ سے انشائیہ کے ساتھ موجود تھے۔ قیصر اقبال، بھکر اپنے تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے مبارکاں بھاپا جی! آپ کی بھاگ دوڑ کام آگئی لیکن صنف اوئی اوئی کے پاس پناہ لینا بالکل اچھا نہیں لگا۔ جاوید بلوچ! بھائی آپ کو تو پتا ہے چوری شدہ مال کہاں واپس ملتا ہے۔ عادل خان Wellcome اور ہمایوں سعید کو جو علاوہ سب کچھ تھا صرف پیار نہیں تھا۔ محترم ہمایوں سعید! محفل میں کی جانے والی نوک جھوک صرف دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے برا نہ منایئے گا۔ حسنین عباس! اللہ آپ کو اور تمام اسیران کو اپنے فضل سے رہائی نصیب فرمائے اور عمران حیدر کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ انجم فاروق کے اختصاریہ نے سارہ راجپوت راولپنڈی کی عجلت و مصروفیت کی یاد دلا دی۔ تصویر العین مبارک ہو خیر سے کتنی صدیوں کی ہوگئی ہیں آپ؟ احمد خان توحیدی! جناب اگر گستاخی ہوگئی ہو تو معذرت کہ آپ تو بزرگ ہیں ہمارے۔ بابر عباس آپ اتنے قدیم ہیں؟ اور کیا واقعی سسپنس بھی ڈیڑھ روپے کا بھی ہوا کرتا تھا؟ سعدیہ بخاری آپ کی آہ سے کیا مطلب اخذ کیا جائے اور میری بھینسیں واپس کر دیں، مہربانی ہوگی۔ ماریہ فاروق! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض شاہد سزائے موت سے بریت کی مبارک باد قبول کریں۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی جس نے میری طرح اپنا سحر طاری کر رکھا ہے، شیخ حامد کو کال کر کے معلومات دینے والے کے بارے میں ہم کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ شہریار کو مسافر میں سخت حالات سے سامنا کرنا پڑا اور ساری قسط میں شہریار ''لکن میٹی'' کھیلتا رہا۔ شاہد کا کردار ڈرامائی طور پر کہانی کا حصہ بنایا گیا۔ احمد اقبال کی چارست ایک چوراہا غلط کام کا غلط نتیجہ کی تشریح کرتی نظر آئی۔ چار یار اگر اپنی فیلڈ میں کام کرتے رہتے تو یقیناً اس سے زیادہ کامیاب ہوسکتے تھے۔ کمائی و مائی منظر امام کی دلچسپ تحریر تھی ہر جگہ ایک ہی رکشا والے کی موجودگی شروع سے ہی ہمیں کھٹک رہی تھی بھلا ہو اس دوست کا جس نے ان کا پول کھول دیا۔ ساجد امجد بت شکن لے کر آئے، پڑھ کر خون کو گرما یا۔ کاشف زبیری منتقم مزاج میں فریڈ جیکسن کی دادا سے محبت بہت پسند آئی ایک مادر پدر آزاد معاشرے کے ایسے واقعات بالکل انہونے سے محسوس ہوتے ہیں۔ اقبال کاظمی تک کے لیے بلی کی چوری کا کیس لے کر آئے جو خاصا منافع بخش ثابت ہوا۔ محفل شعر و سخن بھی کافی معیاری رہی احسان سحر کے مراسلے بھی زبردست رہے۔ سالگرہ نمبر میں نواب صاحب کی شمولیت کا اعلان کر کے ادارہ نے سنسنی سی پھیلا دی ہے ابھی سے انتظار شروع ہوگیا ہے۔ حسام بٹ صاحب اور محمد الیاس خان ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔''

✠ **سارہ**، کراچی سے شریک محفل ہیں ''عرب نقوش کی مالک دوشیزہ کی تصویر سے مزین، بہترین سرورق کے ساتھ سسپنس ملا۔ جن لوگوں نے ویلکم کیا ان کا بہت شکریہ...... قیصر اقبال کلول...... ویلکم...... پہلی شرکت کے لیے...... اور آتے ساتھ ہی قبضہ......؟ جاوید بلوچ! آپ اپنی خیر منائیں، ایسا نہ ہو کہ ہائے کر کے بیٹھنے اور امی کہہ کے اٹھنے کا موقع بھی نہ ملے۔ تصویر العین! اپنے لیے مجھے اپنا نام بہت پسند ہے آپ کا نام آپ کو مبارک...... بابر انکل...... مجھے یقین ہے سب کو پیچھے تو میں چھوڑوں گی، آپ کی آفر کا شکریہ۔ احسان سحر! میرا تبصرہ آپ کو بہت زور سے لگا؟ بھائی جی سوری...... اس بار سسپنس کچھ زیادہ ہی اچھا لگ رہا ہے، ایک بات سچ بتاؤں؟ وہ یہ کہ خواتین کی بہ نسبت مرد حضرات سسپنس کے لیے زیادہ اچھا لکھتے ہیں (شاید اسی لیے آپ نے اتنے مختلف رنگوں کے قلم استعمال کیے کہ آپ کا خط بھی خوب صورت ہوگیا) ڈاکٹر ساجد امجد کی بت شکن دلچسپ رہی۔ منتقم مزاج، کاشف زبیری ہی کا خاصا ہے...... کہ گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔ تک ویلوٹ نے کمال کرتے ہوئے اچھے طریقے سے بتا دیا کہ کچھ بھی ہو اصول آخر اصول ہے۔ کشکول خاصی ہنگامہ خیز رہی۔ اور تنگ زیب نے شیخ حامد کی دم پر ٹھیک سے پاؤں رکھ دیا ہے، مسافر میں شہریار نے کمال کر دیا۔ اب کہہ سکتے ہیں وہ اس غلط کام میں علی الاعلان کندن بنتے جا رہا ہے۔ احمد انکل کی چارست ایک چوراہا، بہترین تحریر رہی۔ آج کے حالات و واقعات کا عمدہ نمونہ دلفریب انداز میں پیش کیا...... اور اینڈ میں تو سچ مچ دھماکا کر دیا، غیر متوقع انجام کے ساتھ...... محفل شعر و سخن میں یاسر علی راجپوت کا انتخاب Best......''

✠ **قیصر محمود اعوان**، خالد محمود اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''ماہنامہ سسپنس کے خطوط کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنے کے لیے یہ میری دوسری کوشش ہے۔ مجھے میرا پیارا پرچہ 20 نومبر کو ملا ہر بار کی طرح ایسے محسوس ہوا جیسے میرے لیے کسی نے ویزا بھیجا ہو۔ اس کے ساتھ تھوڑا رنج بھی ہوا جب خطوط قارئین میں مجھے اپنا تحریر کردہ خط نہ ملا۔ سرورق کیا ہی شاندار تصویر محو تصور بنائی گئی ہے اور اس کی آنکھیں تو واقعی لاجواب بنائی ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی نہایت مفکرانہ سوچ میں کراچی کے حالات پر روشنی ان کے محب وطن ہونے اور طائرانہ سوچ و روشن خیالی کی عکاسی ہے۔ اس کے بعد محفل یاراں پہنچے۔ کرسیٔ صدارت پر قیصر اقبال کلول بھکر کو براجمان پایا۔ مبارکاں۔ لگتا ہے فٹ بال سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں آپ۔ محمد

جاوید بلوچ کا تبصرہ اچھا لگا۔ طاہر الدین بیگ صاحب آپ قسمت والے ہیں جو مہینوں کا حساب لگا رہے ہیں باقی ہم سے پوچھیں کہ دن کیسے کٹتے ہیں۔ ہمایوں سعید انجم فاروقی احسان پاشا کی تحریریں پڑھیں، باقی محمد حسنین بلوچ صاحب ہمارے سابقہ قیدی رہائی آپ کو آزاد فضاؤں کی مبارک ہو۔ تصویر العین آپ کو ہماری طرف سے سالگرہ مبارک۔ باقی آپ نے لکھا کہ رمضان پاشا صاحب غیر شادی شدہ ہو کر گھبراتے نہیں، اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، ادریس احمد خان، بابر عباس، حسنین عباس، اے ایم چودھری، احسن سحر و رضوان تنولی کی تحریریں اچھی تھیں۔ محترمہ سعدیہ بخاری آپ کی وکالت نہایت شاندار رہی۔ علاوہ ازیں کشکول پڑھی۔ SP اور تنگ زیب کی کارکردگی شاندار جا رہی ہے، اگلی قسط میں دشنو امید ہے کوئی نیا کام کر دکھائے گا۔ دوسری کہانی مسافر پڑھی، شہریار ایک مصیبت سے نکلتا ہے دوسری میں پھنس جاتا ہے۔ امید ہے یہ دلچسپی جاری رہے گی خوئے نہاں پڑھی جس میں وڈیروں کے ظلم و زیادتی کے بارے میں لکھا تھا یہ رونا تو آج بھی جاری ہے، باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ اشعار میں طارق کلیرا، سعید عباسی، غلام رسول خان کے اشعار پسند آئے۔''

✠ **انجم فاروق ساحلی**، لاہور سے چلے آ رہے ہیں ''اس مرتبہ سسپنس کا ٹائٹل سادگی اور دلکشی کے ساتھ کسی گہری سوچ، کسی لمبے انتظار کی عکاسی کرتا ہوا محسوس ہوا۔ پتھر کے ستون سے لپٹی حسینہ کی آنکھیں بھی کچھ پتھرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ خطوط کی محفل خاصے بھرپور تاثرات پر مبنی تھی۔ پہاڑ او جھل اچھی کاوش تھی۔ بلی کی چوری دلچسپ اور معیاری پیشکش تھی۔ پیش عقل کا اختتام فکر انگیز تھا۔ کمائی و مائی منظر امام صاحب کی کاوش بھی دلچسپ و منفرد تھی۔ محفل شعر و سخن میں غلام رسول، لاہور کا شعری انتخاب خوب صورت تھا۔ صفحہ نمبر 153 کے لطائف پُر لطف تھے۔ بت شکن تاریخ کا ایک روشن باب تھی۔ سرمد صاحب کا احوال بھی خوب تھا۔ مسافر اور کشکول اپنے مخصوص انداز میں تیزی سے محو سفر ہیں۔ چارست ایک چوراہا کے بعض مقامات متاثر کن تھے لیکن متعدد جگہوں پر کہانی مضمون کا رنگ اختیار کرتی چلی گئی۔ امید ہے سالگرہ نمبر میں نواب صاحب کی آمد متاثر کن ہوگی۔ کوئی مختصر تحریر بھیجی جا سکتی ہے یا نہیں؟'' (بالکل بھیجی جا سکتی ہے)

✠ **شیر علی خان**، خانیوال سے چلے آ رہے ہیں ''اس دفعہ کی حسینہ اور کچھ خاص لوگوں میں کافی مماثلت نظر آئی۔ سیاسی کیبز ملالہ اور یوتھ فیسٹیول کی سیاست اور اب کراچی کا خون میں نہائے محرم کے بعد جون ایلیا کی ''آرزو'' سے بالکل متفق ہوں کہ اللہ تمام برادریوں میں افہام و تفہیم سے برداشت کا مادہ پیدا کریں تاکہ 71ء والے حالات نہ پیدا ہو جائیں۔ اس دفعہ 16 نومبر کو انٹرن شپ اور Laptop اسکیم کی منعقدہ تقریب VAAR راولپنڈی میں شرکت کا موقع ملا۔ وزیر اعلیٰ اور اس کے حواریوں کو خوب مواقع میسر آئے۔ جلسے کے بیچوں بیچ نوجوان نسل ستائش کے بجائے تبدیلی کے نعرے لگاتی نظر آئی، جس سے آئندہ کی سیاست کے منظر نامہ کی تصویر کشی ہوگئی۔ قصر صدارت کی طرف دھیان دیا تو ملکی سیاست کی طرح تعلقات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جاوید بلوچ اگر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو شیشہ مان لیا جائے تو اگلی دفعہ بیگم نوازش علی کا خط ضرور شامل ہوگا۔ بیگ صاحب نے اس دفعہ کافی پیلاہٹ کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمایوں سعید کی باتوں کو جاوید بلوچ انجوائے کرتے ہیں تو تفسیر عباس کو شکایتی لہجہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ بہر حال عمران بلوچ کے بارے میں سن کر کافی پریشانی ہوئی۔ تصویر العین آپ کو عمر کی کٹوتی (سالگرہ) مبارک ہو۔ احمد خان توحیدی صاحب کا تبصرہ کافی اسٹیل قسم کا رہا، کافی جگہ منگنی شادی اور نکاح کا ذکر کرتے نظر آئے۔ لگتا ہے متاثرین میں شامل ہیں۔ ادریس بھائی اس دفعہ ناموں کی لسٹ یعنی بلیک لسٹ زیادہ کالی نہیں ہوئی۔ پیارے انکل! ڈائجسٹ ٹرینوں کے بجائے PIA سے بھجوایا کریں، چاہے قیمت 60 سے 70 کر دیں کیونکہ میری باجی طاہرہ گلزار کافی خفا ہیں مجھے بھی راولپنڈی کے بجائے ایبٹ آباد سے ڈائجسٹ دستیاب ہوا ہے۔ احسان سحر ہماری محفل کے بوڑھے درخت اب لچکدار نہیں رہے۔ تنولی صاحب کڑوے کسیلے انداز للکار کے ساتھ قلم کی تلوار لیے میدان جنگ میں جنگ کرتے نظر آئے۔ بت شکن کو بار بار پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ مسافر اور کشکول میں اس دفعہ بھی مار دھاڑ اور اغوا عروج پر رہے۔ گوشۂ عافیت میں مشکلات سے نہ گھبرانے کا درس ملا۔ احمد اقبال چارست ایک چوراہا میں سماج سے ایک خوب صورت کہانی لے کر آئے اور آج کل کے حقیقی واقعات سے پردہ اٹھایا۔ اشعار میں محمد ادریس اور نسیم احمد کے اشعار پسند آئے۔''

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں ''آنچل اوڑھے معصوم لڑکی پاکیزہ حسن کا شاہکار ثابت ہوئی۔ پہلے نمبر پر موجود قیصر صاحب کا تبصرہ بلاشبہ زبردست تھا، بس قدرت اللہ کو نیچرل کہہ کر یعنی اتنا پیارا نام بگاڑ کر آپ نے اسکول پرنسپل کا نہیں، اسکول کے بچے ہونے کا ثبوت دیا۔ جاوید بلوچ صاحب نے منہ میں ہری مرچیں رکھ کر ماما اور سعدیہ کا ذکر سولہ مرتبہ فرمایا۔ تصویر العین صاحبہ ہمیں سرعام اتنی بددعائیں مت دو۔ قدرت برادر! ہمیں آج تک کسی بھی لڑکی نے بھائی بنانے کی بے وقوفی نہیں کی۔ اسی لیے تو مجھے ان سب کو عقل سے پیدل کہنے والوں پر غصہ آتا ہے۔ بابر صاحب! اب اگر آپ بزرگانہ روش اپنائیں گے اور لڑتے جھگڑتے بچوں میں ثالث کا کردار ادا کریں گے تو اچھا لگے گا۔ سعدیہ صاحبہ! ہم نہایت ایمانداری سے بجلی کے وزیر جیسے بیان کو سچ کر دکھائیں گے۔ چودھری صاحب! اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی طرح سنسان بیابان دل ہونے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ عدنان برادر! وہ جو سیاسی محبت نے آپ کے دل کے زنگ آلود تاروں کا ستیاناس کر دیا تھا تو آپ نے کسی الیکٹریشن سے رجوع کیا یا نہیں؟ سب سے پہلے چارست ایک چوراہا سے شروعات کی۔ چار دوستوں اور ان کے آباؤ اجداد کے گرد گھومتی نہایت تیز رفتار اور دلچسپ کہانی ثابت ہوئی۔ حالات اور قسمت کے ستائے ہوئے ہونہاروں کا یوں غلط سمت میں چلنا آج کل انہونی اور ناقابل یقین بات نہیں۔ ملک صاحب حسب عادت دلچسپ کیس لیے حاضر ہوئے۔ کاشف زبیر کی منتقم مزاج توقعات پر پوری نہیں اتری۔ سندھ دھرتی کی کہانی خوئے نہاں میں ہمیں آغل خاں سے زیادہ رافعہ قصور وار لگی، بے شک ان کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ مگر جب انہیں پتا چلا کہ شوہر کو میرا یہ فعل پسند نہیں تو انہیں فوراً وہ تعلق ختم کر دینا چاہیے تھا۔ تنویر ریاض کی گوشۂ عافیت بھی لاجواب رہی۔ مریم کے خان کی کہانی پیش عقل نے واقعی سوئے ضمیر جھنجوڑ ڈالے۔ منظر امام کی حسب سابق معاشرتی کہانی کمائی و مائی سبق آموز رہی۔ محفل شعر و سخن میں پہلے نمبر پر موجود شعر کو پڑھا بہت، چوما بہت۔''

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے محفل میں تشریف لا رہے ہیں ''میزان زیست سے ایک اور سال تفریق ہوگیا اور قرطاس کے سینے پر...... کئی تلخ

وسفاک واقعات رقم کر گیا۔ حالات جوں کے توں رہے...... بلکہ اور بھی بدترین ہوتے چلے گئے وہی...... مہنگائی غربت بے روزگاری فرقہ بندی دہشت گردی، لوٹ مار، لاقانونیت اور...... ارباب اختیار واقتدار کی وہی بے حسی، خاموشی وخود غرضی...... ماہ محرم الحرام کے مغموم ومقدس ایام...... یوم عاشور جب تاریخ انسانیت کا سب سے بھیانک اور لرزہ خیز سانحہ رونما ہوا۔ خوشگوار انقلاب اور مثبت تبدیلیوں کا خواب...... دیوانے کا خواب ہے۔ رب عظیم کے حضور دعا ہے کہ امت مسلمہ کے حال اور حالات پر رحم فرمائے۔ سسپنس کی تاخیر...... ذہنی اذیت کا باعث بن رہی ہے، سادہ سا خوب صورت سرورق اور نہایت سادہ سی خوبرو دوشیزہ سرورق...... ذاکر صاحب کے کمال فن، مہارت ومشاقی کا نایاب نمونہ ہے۔ جون ایلیا کا تلخ وسفاک انشائیہ، ایک آرزو...... لوح وقت پر خون جگر سے رقم کیا گیا۔ آپ کے خط میں...... آپ کا اداریہ ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتا ہے، ہم اسے ٹیپ کا بند کہتے ہیں، مسند خلافت پر بھکر سے قیصر اقبال کا شاندار اور جاندار تبصرہ...... بہت ہی مبارکاں...... علی پور سے محمد جاوید بلوچ...... قربانیوں کے بکرے فریزر میں نہایت اہتمام وحفاظت کے ساتھ رکھ دیے جاتے ہیں یہ بھی امت مسلمہ کا المیہ ہے۔ ہمایوں سعید اگر کھالوں کے بیوپاری بن کر بھی چلے جاتے تو سعدیہ بخاری سے ملاقات نہ ہوتی کیونکہ سنا ہے انہوں نے...... مرغی کی قربانی دی تھی۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ عہد ناگوار کے تلخ حالات اور تلخ رویوں پر افسردہ نظر آئے۔ سرگودھا سے حسنین عباس بلوچ، بہت زیادہ اور تہ دل سے مبارکباد کہ آپ کو اذن رہائی مل رہا ہے اور عمران حیدر بلوچ سے متعلق جان کر بہت افسوس ہورہا ہے ہماری جانب سے ان کی مزاج پرسی ضرور کیجیے گا۔ اوکاڑہ سے بہت پیاری تصویر العین سالگرہ مبارک ہو۔ سعدیہ بخاری بادام اور ان کے جیسی سخت اشیا کھانے سے قاصر اور معذرت خواہ ہیں۔ کھاریاں سے بابر عباس، آپ کی بے لوث محبتیں ہمارے لیے متاع قلب وجان ہیں۔ آپ کو شہریار اور میڈم شکیلہ کے رومانس سے بوریت ہوتی ہے اچھی بات ہے۔ آپ کی موجودہ عمر کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ابتدائی صفحات پر ماضی کے آئینے میں...... خزینۂ تاریخ سے ایک اور گوہر نایاب...... ایک نادر روزگار شخصیت سلطان محمود غزنوی کی بے مثل وولولہ انگیز داستان۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین اور نہایت بیش قیمت تحریر وتحقیق ثابت ہوئی۔ کاشف زبیر کی پر اثر کوشش۔ منتقم مزاج...... نہایت کامیاب رہی، سانپ کی خصلت رکھنے والے انسان نما لوگوں کا پر اثر احوال...... سانپ کی سرشت میں وفا نہیں ہوتی۔ یہ اٹل حقیقت ہے۔ اسرار وتحیر کی دبیز تہوں میں پنہاں انوار صدیقی کا ماورائے عقل سلسلہ کشکول...... سسپنس کی خاص الخاص سوغات ہے۔ اقبال کاظمی کی دلچسپ اسٹوری بلی کی چوری...... بھی دلچسپ ثابت ہوئی۔ پہاڑ او جھل بھی زبردست رہا۔ سندھ کے وڈیرا راج کا ایک اور لرزہ خیز منظر...... خوئے نہاں چشم افلاک نت نئے تماشے دیکھنے پر مجبور ومحو حیرت ہے۔ تنویر ریاض کا گوشۂ عافیت بھی خوب رہا۔ زندگی کے راہ پرخار میں پابرہنہ وپاپیادہ...... مسافر کی تلخ وطویل مسافت، ناصر ملک کی مسافر دل کی آنکھوں سے پڑھی جاتی ہے۔ پسندیدہ مصنفہ مریم کے خان کی اثر انگیز روداد پیش عقل ضمیر کی عدالت میں ایک دلخراش تماشا، ضیا تسنیم بلگرامی کی سرمد شہید ایک ایمان افروز تحریر...... دلچسپ مصنف کے دلچسپ طرز بیاں سے مزین کمائی ومائی...... وجود زن کی فتنہ انگیزیاں، دلچسپ پر مزاح مگر قابل افسوس...... معاشرے کے جراح اور ماہر نباض احمد اقبال کے قلم کا شاخسانہ۔ رشتوں کی دیواروں میں دراڑوں اور امید وآس کے کچے دھاگوں کے ٹوٹنے کا دلچسپ مگر روح فرسا قصہ، ناقابل فراموش وناقابل بیاں، چارسمت ایک چوراہا...... عالم نفسانفسی...... بیشک کہ یہی قرب قیامت کے آثار ہیں۔ حسام بٹ اور محمد الیاس خان کی والدہ ماجدہ کے انتقال پرملال پر ہم ان کے صدمۂ جانکاہ میں برابر کے شریک ہیں۔"

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے محفل کی زینت بنی ہیں "آج محرم کی سات تاریخ ہے مجھے تو کرب وبلا کے میدان سے یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی کی ہر آزمائش پر صبر وتحمل، برداشت، استحکام اور اسی شجاعت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس دفعہ بھی ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ پہلے نمبر پر قیصر اقبال کلول تھے۔ پہلی بار شرکت کی اور پہلے نمبر پر آگئے، ویلڈن۔ لیکن پلیز کنٹری کم ہی کیا کریں اور شکر ہے کہ آپ نے بروقت بریک لگائی ورنہ یقیناً بلیک ہول میں ہی جا کر گرتے۔ عادل خان ہم آپ کو محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں اور عمران حیدر بلوچ کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہوجائیں۔ احمد خان توحیدی آپ کی سالگرہ پر ہیپی برتھ ڈے۔ رمضان پاشا ٹائٹل پر اس سے زیادہ برا تبصرہ یقیناً کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ وہ ناکام عاشق آپ ہی تو تھے، یا نہیں کیا۔ تین بھائی تین کہانیاں بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس کا تبصرہ اچھا لگا۔ سعدیہ بخاری آپ ایلفی لے کر گیا کریں گی۔ ریاض شاہد مبارک ہو، انشاء اللہ جلد ہی آپ حسنین عباس بلوچ کی طرح رہا ہوجائیں گے۔ عدنان یوسف کیا ٹائٹل گرل کی صورت آپ کی کھوئی ہوئی محبوبہ سے ملتی تھی جو سرورق چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے جو محفل کی رونق کو چار کیا آٹھ کیا سولہ چاند لگا رہے تھے۔ کترنیں میں اس دفعہ محمد جاوید راؤ کی جدید محاورے چوائس اچھی لگی۔ کشکول میں اب شیخ حامد کے گرد اور رنگ زیب کا جال تیزی سے بن رہا ہے یقیناً اب اس کا انجام زیادہ دور نہیں اور لیاقت حسین کے ساتھ جب تک اس کی ماں ہے یقیناً بدی کی طاقتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اقبال کاظمی کی بلی کی چوری اچھی کاوش تھی۔ پہاڑ او جھل میں ہمیشہ کی طرح صفدر حیات نے یہ کیس بھی حل کرلیا اور اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ دو محبت کرنے والوں کو ملادیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوئے نہاں کا انجام دکھی کر گیا۔ گوشۂ عافیت میں وائٹ نے صرف ایک کمرے کے حصول کے لیے اپنی بیوی کا قتل کردیا۔ مسافر میں پتا نہیں کیوں مجھے شہریار پر رہ رہ کر غصہ آتا ہے شاید اس لیے کہ وہ میڈم کا غلام بنا ہوا ہے۔ (اتنا غصہ؟ یہ اچھی بات نہیں ہے) مریم کے خان کی پیش عقل بہت اچھی کہانی تھی اور اس کہانی میں جو پڑھنے کو ملا کاش اس کا عملی مظاہرہ ہم بھی کرسکیں۔ کمائی ومائی میں اس لڑکی صائمہ شایان کو خوب بے وقوف بنایا۔ ویسے جو خود ہی لٹنے کو تیار ہو اسے لوٹنے میں مزہ بہت آتا ہے۔ چارسمت ایک چوراہا نے خاص متاثر نہ کیا۔ اسے پڑھ کر وہ تین دوستوں والی کہانی یاد آگئی جو ایک غار میں پھنس جاتے ہیں اور پھر اپنی اپنی نیکی یاد کرکے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ محفل شعر وسخن میں یاسر علی راجپوت، احسان سحر، محمد امجد ریاض کی پسند اچھی لگی مجھے۔"

✠ **حمیرا رضا**، لاہور سے محفل میں شرکت کررہی ہیں "سسپنس باقاعدگی سے گھر آرہا ہے مگر ہائے رے ستم بالائے ستم اب بہت ہی کم وقت ملتا ہے خود اپنی ذات کو وقت دینے کا۔ ہمیشہ سسپنس میں سے کچھ نہ کچھ پڑھتی ہی رہتی ہوں کبھی تاریخی کہانی تو کبھی مرزا امجد ایڈووکیٹ، کبھی ملک صفدر حیات تو

کبھی ڈاکٹر شیر شاہ سید، منظر امام غرض فرصت کی ان گنی چنی گھڑیوں میں جو بھی کہنہ مشق رائٹر نظر سے گزرے انہیں پڑھ لیتی ہوں، مگر بہت بہت معذرت کہ تبصرہ نہیں کرپاتی۔ ارے میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کچھ عرصہ سے میری آئی سائیٹ (نظر) خطرناک حد تک کم ہورہی ہے چشمہ بھی لگ گیا ہے۔ ہر وقت سر درد میں مبتلا رہتی ہوں (اللہ آپ کو صحت دے، آمین) آج قلم حسنین عباس بلوچ بھائی کی وجہ سے اٹھایا۔ ارے میرے اچھے بھائی میں بھلا آپ کو کیوں بھولنے لگی جب آپ نے محفل میں حاضری دی، میں نے تب بھی یاد رکھا اور غیر موجودگی کو بھی۔ آپ نے دعا کی درخواست کی تھی خاص داتا دربار میں جاکر ان دنوں اپنے بیٹے کی پیدائش کے سلسلے میں کراچی میں تھی تو شوہر کو بھیج دیا آپ کے کام سے (جزاک اللہ) عمران حیدر بلوچ بھائی کے گردوں کی خرابی کا پڑھ کر کافی دکھ ہوا، خدا آپ کو صحت دے اور آپ کو خدا جلد از جلد رہائی دے اور باقی بے گناہ اسیران بھی آزادی کی منزل کو پہنچیں اور ادارے سے معذرت کہ ابھی کچھ بھی پڑھ نہیں سکی (جب پڑھ لیجیے گا تو اپنی رائے ضرور دیجیے گا) کچھ عرصہ ہوا سسپنس سے خواتین کے خطوط کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ شاید وہ سب بھی میری طرح مصروف ہیں، میری جانب سے تمام پاکستانیوں کو نیا سال مبارک ہو خدا آنے والے سال کو امت مسلمہ کے لیے پرسکون بنائے۔ آمین"

✠ **سعدیہ بخاری**، اٹک سے تبصرہ کررہی ہیں "دسمبر کا سسپنس محرم الحرام کی 5 تاریخ کو سوگوار فضا میں ملا جہاں ایک طرف مسلمان واقعۂ کربلا کی یاد میں سوگوار ہیں تو دوسری طرف پیغمبروں کی سرزمین ارض فلسطین پر کفار اسلام نہتے اور معصوم فلسطینیوں پر بم برسا رہے ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کراچی کے حالات پر نوحہ کناں ہیں جہاں اپنے ہی اپنوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ دسمبر کے شمارے کا سرورق سوفٹ کلرز میں بے حد خوب صورت کتابی چہرے، براؤن آنکھوں والی سادہ سی حسینہ جانے کیا سوچ رہی ہے؟ محفل خطوط میں اس بار بھی صدارت صنف وجاہت ہی کے پاس رہی۔ انکل نے تو یہ شاخ الوؤں کو ٹھیکے پر ہی الاٹ کردی۔ قیصر اقبال صاحب صدارت مبارک ہو محترم عرض یہ ہے کہ یہ گولوں کا زمانہ نہیں ہے چوکوں اور چھکوں کا دور ہے جس میں بعض اوقات ایک بولر یا بیٹسمین میچ کا پانسا پلٹ دیتا ہے، آپ تعداد کو رو رہے ہیں۔ دوسرے نمبر پر جھوٹی افواہیں پھیلانے کے ماہر جاوید بلوچ ماہا ایمان کی فکر میں گھلنا چھوڑیں وہ وہی ہیں جو ہیں آپ شارقہ سلجوق پر تحقیق وتفتیش کریں۔ بہت سے نئے لوگ بھی نظر آرہے ہیں سب کو خوش آمدید۔ ہمایوں سعید آپ کے ماہا کو دیے گئے جواب سے ہم پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ شکر ہے آپ کا دماغ بھی چل پڑا۔ اے ایم چودھری آپ کا تبصرہ پسند آیا لیکن پلیز اپنے پورے نام کے ساتھ شرکت کریں۔ قدرت اللہ نیازی دھو کے باز وہ ہوتے ہیں جو عورتوں کا نام استعمال کرتے ہیں اور اسے شرارت کا نام دے دیتے ہیں۔ تصویر العین ڈیئر ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اینڈ انکل احمد خان توحیدی آپ کو بھی زندگی کی 60 ویں بہار مبارک ہو۔ رضوان احمد تنولی ویلکم بیک، یہ بتائیں پہلے کسی کے سینڈل دیکھ کے بھاگے تھے؟ قیصر اقبال، جاوید بلوچ اینڈ احسان سحر کے تبصرے زبردست تھے۔ ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب پہاڑ او جھل سے بلاشبہ نازلی اور اسلم نے اپنی محبت پانے کے لیے غلط راستہ چنا مگر تقدیر ان کے ساتھ تھی کہ اپنی منزل پانے میں کامیاب رہے۔ مسافر شہریار کے اغوا سے لے کر واپسی تک تمام قسط ایکشن سے بھرپور تھی۔ شہریار حیدر خان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہورہا ہے۔ کشکول خلاف معمول فل ایکشن میں زبردست رہی۔ شیخ حامد کا انجام صاف نظر آرہا ہے۔ تاریخی کہانی بت شکن کہلانے والے غزنی سلطان محمود غزنوی تاریخ ہند کی نامور شخصیت کی داستان [illegible] اسیرت وکردار میں اپنی مثال آپ اللہ کی مدد پر بھروسا کیا اور کامیابی حاصل کی۔ آخری صفحات کا توشۂ خاص احمد اقبال کے نشتر انگیز کے قلم کا شاخسانہ چارسمت ایک چوراہا رشتوں کی پامالی اور شارٹ کٹ سے راتوں رات دولت مند بننے کی خواہش رکھنے والے نوجوانوں کا انجام آخرکار یہ ہوتا ہے کہانی کم حقیقت زیادہ ہے۔ مختصر کہانیوں میں ہماری موسٹ فیورٹ رہی منتقم مزاج مغرب میں رشتوں سے وفا نبھانے کا یہ خوب صورت انداز بہت اچھا لگا۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح مختصر ترین مگر چونکا دینے والی مزاحیہ تحریر لے کر آتے ہیں۔ خوئے نہاں اور گوشۂ عافیت درمیانے درجے کی کہانیاں تھیں۔ بلی کی چوری بھی تعریف کے لائق ہے۔ پیش عقل بھی پراثر کہانی تھی۔ اشعار کی محفل میں یاسر علی راجپوت اور محمد جاوید راہ کا انتخاب پسند آیا۔"

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں شرکت کررہی ہیں "سب سے پہلے حسنین بلوچ کی رہائی کا سن کر دل خوش ہوا۔ اللہ عمران بلوچ کو بھی رہائی دے۔ اسلامی سال شروع ہوچکا ہے اور دعا ہے کہ پاکستان کو اچھے حکمران نصیب ہوں۔ ابتدا قیصر کلول سے، مجھے لگتا ہے آپ کلول بہت کھاتے ہیں، شادی شدہ ہوکر حسینہ سے دل لگی؟ اگر ہمایوں سعید، سعدیہ کے گھر کے سامنے قربانی کے گوشت کی آس میں بیٹھے تھے تو جاوید بلوچ آپ وہاں کیا کررہے تھے۔ شکریہ طاہر الدین بیگ آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا۔ ورنہ کچھ "مشکری" انداز رکھنے والے ستائش نہیں کرتے۔ تصویر العین ثبوت تو آپ ہمایوں سے مانگو۔ رمضان پاشا اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں۔ آپ کو سرورق کی لڑکی کی ناک اپنے جیسے لگی توبہ توبہ قیامت کی نشانیاں۔ ماہا آپ کو ہمایوں کے پرایا ہونے پہ دکھ ہے یا خوشی۔ انکل آپ مجھے بلیک لسٹ کررہے ہیں۔ اس لیے کہانیوں پر تبصرہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ خط لکھنا چھوڑ سکتی ہوں مگر ڈائجسٹ کو پڑھنا نہیں چھوڑ سکتی، اس لیے مجبوری کے تحت خط کسی اور سے لکھوا رہی ہوں۔ (ناراض ہونے سے پہلے محفل میں جگہ کی مجبوری کو سمجھ لیتیں تو ناراض نہ ہوتیں) سسپنس کے عاشقوں کا دل نہ دکھائیں، ماہا ایمان دل نشین، آمنہ سیٹھانی واپس آجائیں تاکہ مدمقابلوں کی "ککڑوں کوں" ختم ہو اور اچھل کود بند ہو۔ ہمارے ہونے سے ہی محفل رنگین ہے۔" (بے شک...... حالات سنگین ہیں)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ ساجدہ راجا، ہندواں سرگودھا۔ بابر عباس، کمیل عباس، حسنین عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ حافظ محمد عرفان، سرگودھا۔ سید محی الدین اشفاق، لیہ۔ ماریہ فاروق، چمن۔ عبدالغفور خٹک، اٹک۔ اختر عباس تھراج، ظفر اقبال ظفری، کبیر والا۔ سنسان دل، جودھپور، کبیر والہ

فلک تکچل

ڈاکٹر ساجدا امجد

دورِ حاضر ہو یا عہدِ گزشتہ... وقت ہمیشہ سے مختلف چہروں اور حوصلوں میں ڈھل کر اقتدار کی بساط پر بازی پلٹتا رہا ہے... یہ بھی حقیقت ہے کہ تاج و تخت کی بھول بھلیاں عجیب سبق آموز ہوتی ہیں، جہاں برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ نامور عہد ساز "حیدر علی" کی پیدائش پر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس فرزند دل پذیر کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یوں رقم ہوجائے گا کہ یتیمی کی کٹھنائیاں اٹھانے والے بچے کے دروازے پر دنیاوی حشمت و جاہ کبھی دستک دے گی جس نے باپ کے قرض کے عوض اسیری کی، زندگی بھی گزاری۔ تاریخی جملہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے" کہنے والا ٹیپو سلطان اسی بہادر شخص کا فرزند تھا جس نے اپنی شجاعت اور دلیری سے مرہٹوں اور انگریز قوم کے دانت کچھ اس طرح کھٹے کیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ریاست میسور کا کل رقبہ جو صرف 33 دیہاتوں پر مشتمل تھی، حیدر علی جیسے حکمران کے دور میں اسّی ہزار میل تک پھیلتا چلا گیا اور جب وقت پلٹا کھائے اور... انہی رقبوں کا دائرہ تنگ ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے ہیں۔ طاقت کے حصول، استعمال اور پھر زوال... گویا اقتدار کے قصے سب ہی ایک جیسے مگر... فرق صرف نتائج میں آتا ہے اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ کون سا حکمران کس قدر دل عزیز تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شیخ ولی محمد کے پاس اس اعزاز کے سوا کوئی اعزاز نہیں تھا کہ وہ مکہ شریف کے قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں کہ وہ عرب سے ہجرت کر کے دہلی اور پھر بہ عہد عادل شاہ گلبرگہ (دکن) کیوں آئے۔ وہ کسی تجارتی قافلے کے ہمراہ بھی نہیں آئے تھے اور نہ کسی حملہ آور کے لشکر میں شامل تھے یعنی نہ تو وہ کوئی خوش حال تاجر تھے نہ صاحب سیف کہ جاگیریں اپنے نام کراتے تلوار کی نوک سے اپنا مقدر بناتے۔ وہ تو ایک عام سے آدمی تھے۔ عام بھی اور گم نام بھی۔ انہوں نے گلبرگہ میں الوند کے مقام پر اقامت اختیار کی۔ حصولِ رزق کے لیے نہ کوئی پیشہ اپنایا، نہ حرصِ دنیا کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے۔ خاموشی سے ایک خانقاہ سے منسلک ہوگئے۔ عبادتِ الٰہی میں دن رات گزارنے لگے۔ کئی مواقع ایسے آئے جب دنیاوی حشمت وجاہ ان کے دروازے پر دستک دینے آنکلی لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ منہ پھیرے کھڑے رہے البتہ یہ دعا ہر وقت ہونٹوں پر رہتی کہ ''اے خدا! میری اولاد کو میری طرح گم نام نہ رکھیو۔ انہیں نیک شہرت سے مالا مال کیجیو۔ آئندہ نہ جانے زمانہ کیا رخ اختیار کرے۔ وہ کوئی پیشہ اختیار کریں، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ان کے پیشِ نظر رہے۔''

یہ سترھویں صدی کے اوائل کا ہندوستان تھا۔ محمد عادل شاہ بیجاپور کا حکمران تھا۔

شیخ ولی محمد اپنی زندگی کا مقصد تلاش کر چکے تھے۔ وہ اپنی اولاد کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے تھے..... چنانچہ جب ایک روز خانقاہ کا ایک درویش ان کے سامنے آکر بیٹھا تو انہوں نے ایک عجیب سا سوال اس درویش سے کیا۔

''کیا تیرے گھر میں کوئی بیٹی بھی ہے؟''

''شیخ صاحب، میں ایک کیا تین بیٹیوں کا باپ ہوں۔''

''ان میں سے ایک میرے گھر بھیج دے۔''

''شیخ صاحب، آپ اس عمر میں شادی کریں گے؟''

''میں تیری بیٹی اپنے لیے نہیں اپنے بیٹے کے لیے مانگ رہا ہوں۔''

''یہ تو میری خوش بختی ہوگی۔ میں تیار ہوں۔''

شیخ ولی محمد نے اپنے بیٹے محمد علی کی شادی اس درویش کی بیٹی سے کردی۔ یہ شادی محمد علی کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ اللہ نے انہیں یکے بعد دیگرے چار لڑکے دیے۔ لڑکوں کے نام محمد الیاس، شفیع محمد، محمد امام تھے .....اور چوتھے فتح محمد تھے۔

محمد علی بھی خانقاہ سے وابستہ تھے لیکن شادی کے بعد آمدن بڑھانے کے لیے کھیتی باڑی بھی شروع کر دی تھی۔ اسی محدود آمدنی پر خوش تھے لیکن بیوی کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ اس بے چاری نے غربت ہی غربت دیکھی تھی لہٰذا اب خوش حالی کے اجالے کا تقاضا بھی کرتی تھی۔ اس زمانے میں سپاہ گری ایک منافع بخش پیشہ تھا لیکن محمد علی نہ سپاہی تھے نہ سپاہی زادے۔ بیوی کو ان سے یہی گلہ رہتا تھا۔ اس نیک بخت کے سات بھائی تھے جو بیجاپور میں تھے اور عادل شاہ ثانی کی فوج میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ وہ محمد علی کو بھی اکساتی رہتی تھی کہ بیجاپور چلا جائے۔ وہاں ملازمتوں کے اچھے مواقع ہیں لیکن محمد علی اپنے والد کے ڈر سے ''الوند'' چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب شیخ ولی محمد کا انتقال ہوگیا تو محمد علی کی بیوی کا اصرار بھی شدت اختیار کر گیا۔ محمد علی مجبور ہوگئے اور بیجاپور چلے گئے۔ برادرانِ نسبتی نے خیر مقدم کیا اور محمد علی ان کے ساتھ رہنے لگے۔

ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ مغلوں اور بیجاپور کی افواج کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جنگ اتنی خوفناک تھی کہ محمد علی کے ساتوں بھائی اس جنگ میں کام آگئے۔ یہ خبر ان کے گھر پہنچی تو ان کی بیوی پر قیامت ٹوٹ پڑی، سات بھائیوں کی ایک ساتھ ہلاکت کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ ان کی بیوی غم کی تصویر بن کر رہ گئی۔ محمد علی نے یہی سوچا کہ بیوی کو اس مقام سے دور لے جایا جائے تاکہ اس کے دل سے غم کے اثرات دور ہوں۔ اس بے بسی کے عالم میں انہیں ''کولار'' کا حاکم شاہ محمد یاد آیا جو کبھی ''الوند'' آیا تھا اور خانقاہ میں اس سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس معمولی سی جان پہچان کو انہوں نے سہارا بنایا اور ''کولار'' چلے گئے۔ حاکم شاہ محمد ان کے زہد واتقا کا قائل تھا لہٰذا ان کی آمد کو اپنے علاقے کے لیے خیر وبرکت قرار دیا اور وسیلۂ روزگار کے لیے اپنی جائداد کا انتظام وانصرام ان کے حوالے کر دیا۔ اس نوکری کے علاوہ وہ کھیتی باڑی بھی کرنے لگے۔

کولار میں فارغ البالی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بیٹوں نے بھی جوانی میں قدم رکھ دیا تھا۔ اب وہ بھی باپ کا ہاتھ بٹا رہے تھے لیکن سب سے چھوٹے بیٹے فتح محمد میں وہ آثارِ بغاوت دیکھ رہے تھے۔ اسے نہ تو کھیتی باڑی میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کسی درگاہ کا خادم بننے میں بلکہ وہ پیشۂ سپاہ گری کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ بات باپ سے کہنے کی ہمت نہیں تھی لیکن باپ تک یہ بات پہنچ ضرور گئی تھی۔ ایک روز انہوں نے فتح محمد کو اپنے پاس بلایا اور تصدیق چاہی۔

''میں سن رہا ہوں کہ تمہیں آبائی پیشے کھیتی باڑی سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ میں سپاہ گری سے رغبت رکھتا ہوں۔''

''صرف اس لیے کہ تم دنیاوی جاہ وعزت کے طلب گار ہو۔''

''اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

''ہمارے آباواجداد نیک اور متقی لوگ تھے۔ وہ اگر چاہتے تو دنیاوی حشمت وجاہ حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنے آپ کو دنیاوی علائق سے بچائے رکھا اور تم آباواجداد سے انحراف کر رہے ہو۔''

''ابا جان، پیشہ کوئی ہو۔ انسان اپنی ذات میں نیک اور متقی ہوسکتا ہے اور پھر سپاہ گری تو مسلمانوں کی شان ہے۔''

''تم زیادہ سے زیادہ سپاہی بن سکتے ہو۔ اپنے آقا کے حکم پر بعض اوقات مسلمانوں کا خون بھی بہاؤ گے۔ اگر مغلوں سے جنگ ہوتی ہے تو کیا مغل مسلمان نہیں؟ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ صرف مرہٹوں کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے۔ میں تمہیں کبھی اس خونریزی کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ تمہارے سات ماموں ایک ہی جنگ میں کام آگئے تھے۔ مجھے تم بہت عزیز ہو۔ میں تمہاری جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔''

فتح محمد زیادہ اصرار نہ کر سکے لیکن انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کے دوسرے بھائی بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ تینوں بھائی پردے سے لگ کر باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے تنہائی ملتے ہی فتح محمد سے صاف کہہ دیا کہ وہ لومڑی کی طرح گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے پر قناعت نہیں کر سکتے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ باپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ اس وقت چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔

یہ خاموشی باپ کے احترام میں باپ کی زندگی تک تھی۔ باپ کی وفات کے بعد فتح محمد نے کولار کو خیر باد کہہ دیا اور ارکاٹ کی راہ لی اور ارکاٹ کے صوبیدار نواب سعادت علی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔

نواب نے انہیں دوسو پیادوں اور پچاس سواروں کا کمان دار بنا دیا۔ فتح محمد حوصلہ مند سپاہی تھے اور آگے بڑھنے کا بے تحاشا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ اس معمولی نوکری سے مطمئن نہ ہوئے، ارکاٹ کو خیر باد کہا اور میسور کا رخ کیا۔ میسور جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ میسور میں ان کا بھتیجا فوج میں خدمات سرانجام دے رہا تھا لہٰذا میسور پہنچتے ہی انہیں براہ راست نائک کا عہدہ مل گیا۔

نائک کا عہدہ گرانقدر اہمیت کا حامل تھا لیکن اس کے باوجود فتح محمد زیادہ عرصہ میسور میں مقیم نہ رہ سکے۔ میسور کے امرا کے باہمی نفاق نے انہیں بدظن کر دیا۔ ریاست کا حال یہ تھا کہ راجا عضو معطل تھا اور امرا کی حکمرانی تھی۔ اس صورت حال سے وہ بہت جلد دلبرداشتہ ہوگئے اور پھر والی سرا نواب درگاہ قلی خان کی ملازمت اختیار کر لی۔

نواب نے چار سو پیادوں اور سو سواروں کا انہیں کماندار مقرر کیا۔ ایک جنگ میں انہوں نے ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا کہ ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دیا۔ والی سرا ان سے ایسا خوش ہوا کہ انہیں قلعہ دود بالاپور کا حاکم بنا دیا۔ فتح محمد اپنے اہل خانہ کے ساتھ دود بالاپور میں سکونت پذیر ہوگئے۔

اسی مقام پر 1721ء میں ان کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس بیٹے کا نام انہوں نے حیدر علی تجویز کیا۔ حیدر علی سے تین سال بڑا ایک بیٹا اور بھی تھا۔ اس کا نام شہباز تھا۔

حیدر علی کی پیدائش کے وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ فرزند دل پذیر ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے گا۔

حیدر علی نامور باپ کا بیٹا تھا۔ دنیاوی عیش وعشرت کے تمام سامان مہیا تھے۔

درگاہ قلی خان کی موت کے بعد فتح محمد نے اس کے بیٹے عبدالرسول خاں کے ساتھ خود کو وابستہ کر لیا۔

حیدر علی پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کا بھائی شہباز آٹھ سال کا تھا کہ ''سرا'' کے صوبہ دار طاہر خاں اور عبدالرسول خاں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ فتح محمد اس جنگ میں ہلاک ہوگئے۔

فتح محمد کیا مرے ان کے خاندان پر افتاد ٹوٹ پڑی۔

انتباہ

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

فتح محمد اپنی وفات کے وقت مقروض تھے۔ اس قرض کو وصول کرنے کے لیے درگاہ قلی کے ایک اور بیٹے عباس قلی نے فتح محمد کے خاندان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ تمام اثاثہ چھین لیا اور کم سن بھائیوں حیدر علی اور شہباز کو قید کرلیا۔

یہ مصیبت کوئی معمولی مصیبت نہیں تھی۔ فتح محمد کے دونوں بیٹے قید میں تھے۔ ان کی بیوہ بھی ایک طرح سے اسیری کی زندگی گزار رہی تھی۔ اسے یہ صدمہ تھا کہ بچوں کی جو عمر تعلیم و تربیت کی ہوتی ہے وہ قید و بند میں گزر رہی ہے۔ ان کا مستقبل کیا ہوگا یہ بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اس مصیبت کی گھڑی میں انہیں فتح محمد کے بھتیجے حیدر کا خیال آیا جو میسور کی فوج میں ملازم تھا اسی کی سفارش پر فتح محمد مرحوم بھی میسور کی فوج میں ملازم ہوئے تھے لیکن ملازمت چھوڑ کر ''سرا'' آگئے تھے۔

فتح محمد کی بیوہ نے کسی نہ کسی طرح اپنی بپتا اپنے خاوند کے بھتیجے تک پہنچادی۔ یہ سرگزشت ہی ایسی تھی کہ حیدر کا دل موم ہوگیا لیکن معاملہ ''سرا'' کے حاکم کے بھائی کا تھا جس سے وہ براہ راست نہیں نمٹ سکتا تھا۔ وہ مختلف تدبیریں سوچتا رہا اور بالآخر ایک درخواست لکھ کر میسور کے حاکم سے مدد کا طالب ہوا۔ یہ درخواست اس نے راجا میسور تک پہنچا دی۔ کئی امرا نے اس کی جانب سے سفارش بھی کی۔ فتح محمد چند برس پہلے میسور کی فوج میں رہ بھی چکا تھا لہٰذا راجا میسور نے ضروری سمجھا کہ فتح محمد کی بیوہ کی مدد کی جائے۔

والی میسور نے سرا کے حاکم کو خط لکھا۔ حاکم کو جونہی حالات کا علم ہوا اور تصدیق ہوگئی، اس نے عباس قلی کو ڈرا دھمکا کر فتح محمد کے خاندان کو آزاد کرالیا۔

رہائی کے بعد فتح محمد کی بیوہ اپنے بچوں کے ہمراہ بنگلور روانہ ہوئی اور بنگلور سے سرنگا پٹم جا پہنچی اور پھر فتح محمد کے بھتیجے نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ دونوں بچوں کی پرورش اپنے بچوں کے مانند کرنے لگے۔ فن سپاہ گری اور گھڑسواری میں تربیت دینے لگے۔

حیدر علی کا خاندان جن نامساعد حالات سے گزرا تھا اس میں کسے اتنی فرصت تھی کہ اس کی تعلیم کی طرف توجہ دیتا۔ دس سال تک وہ خاندان کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا رہا۔ اس آوارہ خرامی نے اسے تعلیم کے حصول کی طرف سے غافل رکھا۔ اس میں کچھ اس کی اپنی کاہلی کا بھی دخل رہا ہوگا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو وہ ناخواندہ رہ گیا۔

اس کا ناخواندہ رہ جانا اس کی آئندہ زندگی کا دیباچہ نہیں تھا قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ حیدر علی ابتدا میں فوجی زندگی کی پابندیوں سے بھی بھاگتا تھا البتہ شکار سے اس کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ یہ شکار ہی اس کی فوجی تربیت کا حصہ تھا۔ اسی شوقِ شکار نے اسے ایک ماہر نشانہ باز بنا دیا تھا اور پھر یہی نشانہ بازی اس کے مستقبل کی شاندار ضمانت بن گئی۔

اس کا بڑا بھائی شہباز خان اپنے خاندان کے ہمراہ دیون ہلی یا دیوان ہالی میں مقیم تھا۔ اس کا خاندان بھی وہیں آگیا تھا۔ حیدر علی کی عمر اس وقت انیس بیس سال تھی۔ بھائی کی نگرانی میں اس نے فوجی تربیت حاصل کرلی تھی۔ نشانہ تو اس کا ایسا تھا کہ دور دور تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ اسی دوران دیون ہلی میں نشانہ بازی کا ایک مقابلہ ہوا۔ شہباز خاں، لاابالی حیدر علی کو بھی اس مقابلے میں لے گیا۔ حیدر علی نے اس مقابلے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کی مہارت سے ریاست میسور کا وزیر مالیات تیج راج اتنا متاثر ہوا کہ اسے ریاست میسور میں باقاعدہ ملازمت دے کر پچاس سوار اور دوسو پیادہ کا افسر مقرر کردیا (بعض مورخوں نے تیج راج کا تلفظ تجاراج بھی لکھا ہے۔ ہم اسے تیج راج لکھیں گے)

اس تقرری کے بعد حیدر علی کی ترقی کی وہ تمام منزلیں روشن ہوجاتی ہیں جن سے گزر کر وہ دنیاوی عزت وجاہ کی آخری منزل سے ہمکنار ہوا۔

حیدر علی اور اس کے خاندان کی حالت بہت سقیم تھی۔ اپنی ترقی میں نہ تو اسے خاندانی وجاہت کی مدد ملی اور نہ دولت کی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا اپنی صلاحیت، لیاقت اور ثابت قدمی سے حاصل کیا اور ان سب کا نقطۂ آغاز میسور کی ملازمت تھی۔

ریاست میسور بہت ہی چھوٹی تھی۔ اس کا کل رقبہ 33 دیہات پر مشتمل تھا۔ اس کی آبادی اور پیداوار وغیرہ بھی اسی تناسب سے بہت محدود تھی لیکن جب اسی مختصر ریاست کو حیدر علی جیسا مدبر حکمران ملا تو اس نے اس کا رقبہ 80 ہزار مربع میل تک پھیلا دیا۔ تاریخ اس کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی کہ اس نے سرنگا پٹم میں سلطنت خداداد جیسی خوش حال ریاست قائم کی لیکن تاریخ کو یہ بھی یاد ہے کہ اس ریاست کو مسلم کش غدار مسلمانوں نے دشمنان وطن سے مل کر ختم کردیا اور اب اس ریاست کا رقبہ صرف 29 ہزار مربع میل رہ گیا ہے۔

ریاست میسور کا حکمران راجا کرشنا راج تھا لیکن وہ محض ایک کٹھ پتلی تھا۔ ریاست کا نظم ونسق دیوراج اور تیج راج کے ہاتھوں میں تھا۔ ان بھائیوں نے تخت شاہی کی

تزئین وآرائی کے لیے راجا کو راج گدی پر برقرار رکھا تھا۔ ورنہ اصل حکمرانی یہ دونوں بھائی کررہے تھے۔

دیوراج ریاست کا سپہ سالار تھا جبکہ تیج راج وزیر مالیات لیکن چونکہ دیوراج بوڑھا ہوگیا تھا لہٰذا اس نے فوجی امور اپنے چھوٹے بھائی تیج راج کو سونپ دیے تھے اور خود شعبۂ مالیات کی دیکھ بھال اور نگرانی سرانجام دیتا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جب حیدر علی نے میسور میں قدم رکھا۔

وہ اس گم نام ریاست میں گم نام پڑا رہتا لیکن ایک واقعے نے اس کی زندگی بدل دی۔ مرہٹوں سے خطرے کے پیش نظر دیوراج اور تیج راج کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ وہ آصف جاہ نظام الملک پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کریں۔ نظام الملک کی وفات (1749ء) کے بعد میسور کی حکومت نے جانشینی کی رسہ کشی میں ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔ تیج راج نے حیدر علی کو میسور کی اس فوج کے ہمراہ روانہ کیا جو نظام الملک کے بیٹے ناصر جنگ کی مدد کے لیے بھیجی گئی تھی۔ ناصر جنگ اقتدار کی یہ جنگ اپنے چچازاد بھائی مظفر جنگ کے ساتھ لڑ رہا تھا۔

اس وقت حیدر علی پانچ سو بندوقچیوں اور پانچ سو سواروں کا افسر تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ماتحت کچھ بے قاعدہ فوجی دستے بھی تھے۔

اس دوران ناصر جنگ کو قتل کردیا گیا اور میسور کی افواج وطن واپس آگئیں۔ اس قتل کے بعد افراتفری پھیل گئی۔ حیدر علی کے بندوقچیوں نے اس افراتفری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے طلائی سکوں سے لدے ہوئے بہت سے اونٹ پکڑ لیے اور حیدر کی رہائش گاہ پر لے آئے۔ نشانِ حیدری کا مصنف بیان کرتا ہے۔

''وطن واپس جاتے ہوئے راستے میں حیدر علی نے ان چار اونٹوں پر قبضہ کرلیا جو شاہی خزانے سے لدے ہوئے تھے اور جن کو باغی پکڑ کر لے جارہے تھے۔ حیدر نے دولت پر قبضہ کرلیا۔''

وہ اس خزانے کے ہمراہ میسور پہنچا اور اپنی فوج کی نفری میں اضافہ کیا اور اسے فرانسیسیوں سے تربیت دلوانے کا بھی اہتمام کیا۔

فرانسیسی اور انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اس وقت آپس میں برسرپیکار تھیں اور حیدرآباد اور ارکاٹ کی حکمرانی کے لیے اپنے اپنے امیدواروں کی حمایت پر کمربستہ تھیں۔ فرانسیسی اس کشمکش میں کامیاب رہے۔ انہوں نے حیدرآباد میں مظفر جنگ اور اس کے قتل کے بعد صلابت جنگ کو مسندِ اقتدار پر بٹھا دیا۔ ارکاٹ میں بھی انہیں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے نواب ارکاٹ انورالدین کو قتل کردیا۔ نواب کا بیٹا محمد علی ترچناپلی بھاگ گیا۔ فرانسیسیوں اور اس کے امیدوار چندا صاحب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ترچناپلی میں اس کا محاصرہ کرلیا۔ جب محاصرے نے طول کھینچا تو محمد علی نے میسور کے تیج رائے سے مدد طلب کی اور اس مدد کے عوض ترچناپلی اور اس سے ملحقہ علاقے میسور کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ تیج راج نے فوراً مدد کی ہامی بھری اور ترچناپلی جا پہنچا۔ حیدر علی بھی اپنی گھڑسوار اور پیادہ فوج کے ساتھ میسور کی فوج کے ہمراہ تھا۔

یہ مہم تو ناکام رہی لیکن تیج راج اپنی عاقبت نااندیشی کی بدولت تین چار کروڑ روپے ضائع کر بیٹھا۔ تین برس ضائع کرنے کے بعد لوٹ آیا، مایوس ونامراد۔

ترچناپلی کی مہم تیج راج کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی لیکن حیدر علی کی قسمت کے دروازے کھل گئے۔ وہ اس جنگ میں نہ صرف شریک ہوا تھا بلکہ بہادری کے ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے کہ تیج راج پر اس کی صلاحیتیں روشن ہوگئیں۔ اس نے حیدر علی کو ''ڈنڈی گل'' کا فوجدار مقرر کردیا جہاں زمینداروں نے شورش برپا کررکھی تھی۔

حیدر علی نے ان زمینداروں کی سرکوبی کی اور امن وامان بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی فوج میں بھی اضافہ کیا اور توپ خانے کی تنظیم نو کی اور فرانسیسیوں کے اشتراک سے اسلحہ خانہ بھی قائم کیا۔

ترچناپلی کی مہم کے اخراجات کی وجہ سے میسور کی ریاست اپنے فوجیوں کی تنخواہیں ادا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ ہر سو انتشار پھیل چکا تھا۔ اب اس انتشار سے فائدہ اٹھانا حیدر علی کا کام تھا۔

❁❁❁

میسور کا راجا کرشنا سنگھا سن سے دور تھا لیکن طاقت نہ ہونے کے باوجود یہ سوچتا ضرور رہتا تھا کہ کسی طرح تیج راج اور دیوراج سے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس وقت بھی وہ اسی فکر میں گم تھا۔ اس کی رانی اس کے سرہانے بیٹھی راجا کے چہرے کے رنگ کو بدلتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''راجا جی، جب سے تیج راج وزیر بنا ہے اداس تو آپ رہتے ہی ہیں لیکن آج تو منہ کچھ زیادہ ہی لٹکا ہوا ہے۔'' رانی نے راجا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''تم دیکھ رہی ہو مجھے کس طرح مکھن سے بال کی طرح نکال دیا گیا ہے۔''

"یہ کوئی آج کی کہانی ہے۔"

"میں تو اس لیے خاموش تھا کہ ملک کا نظام چل ہی رہا ہے لیکن ترچناپلی میں جو تیج راج کو عبرت ناک شکست ہوئی ہے اس سے وہ میرے دل سے اتر گیا ہے۔ اس سے تو میں مرہٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو میری راج گدی مجھے مل جائے۔"

"آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ مرہٹے تاوان کی بقایا رقم کا تقاضا کرنے والے ہیں۔"

"تیج راج نے ریاست کو اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ خزانہ خالی ہے۔ فوجیوں کو تنخواہیں دینے تک کے لیے پیسے نہیں۔"

"پھر ایسے میں آپ نے کیا سوچا ہے مہاراج؟"

"سوچا ہے تیج راج کو اس کے عہدے سے ہٹا دوں اور اس کی جگہ کھانڈے راؤ کو وزیر بناؤں۔"

"یہ کام کیا اتنا ہی آسان ہے جتنا آپ سوچ رہے ہیں؟"

"تیج راج میں تو اب دم خم رہا نہیں، البتہ حیدر علی سے ڈر لگتا ہے۔ تیج راج اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔ حیدر علی اس کی حمایت ضرور کرے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح حیدر علی اور تیج راج کے درمیان بگاڑ پیدا ہو جائے۔ حیدر علی ہمیں تیج راج سے نجات دلا دے۔ اس کے بعد حیدر علی کا پتا بھی صاف کر دیں گے۔"

سوال یہ تھا کہ یہ گھنٹی بلی کے گلے میں باندھے کون؟ حیدر علی کو کون آمادہ کرے کہ وہ تیج راج کی معزولی میں راجا کی مدد کرے۔

اس کام کا ذمہ راجا کی ایک رانی لکشمی نے اٹھایا کیونکہ کچھ دنوں سے اسے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ نوجوان حیدر علی اس کی طرف ملتفت ہے، یہ گمان اس لیے بھی پیدا ہوا تھا کہ حیدر علی کی بیوی ایک بچی کی پیدائش کے بعد معذور ہو گئی تھی۔ حیدر علی خود کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ اس کی بیوی خود اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی ہے کیونکہ اب وہ ازدواجی تعلق رکھنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ رانی لکشمی اتنی بے حجاب تھی کہ حیدر علی کو کھلے لفظوں میں دعوت گناہ دیتی رہتی تھی۔ حیدر علی یہ باتیں سنتا اور مسکرا کر چپ ہو جاتا تھا۔ بس اسی کو رانی اس کا ملتفت ہونا کہتی تھی۔

جس وقت رانی، راجا سے محو گفتگو تھی اس سے ایک دن پہلے ہی حیدر علی سے اس نے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔

"نائیک جی، آپ کیسے نوجوان آدمی ہیں، بیوی کے بغیر رہ رہے ہیں اور ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔"

"رانی جی، اب اللہ نے میری بیوی کو معذور کیا ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں دل بہلانے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔"

"آپ جن ذرائع کی بات کر رہی ہیں وہ سب گناہ میں شامل ہیں۔"

"نائیک جی، جوانی میں کیا گناہ کیا ثواب۔ راجا جی اولاد سے محروم ہیں ان کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

حیدر علی جیسا پاکباز مسلمان اس گناہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جس کی دعوت اسے رانی دے رہی تھی۔

رانی ہر مرتبہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ حیدر علی کو تیج راج کا تعاون حاصل ہے اسی لیے وہ اس کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ اب جو راجا سے گفتگو ہوئی تو رانی لکشمی کے دل میں ایک شمع سی روشن ہو گئی۔ اگر وہ تیج راج اور حیدر علی کے درمیان اختلافات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو حیدر علی اکیلا رہ جائے گا۔ اسی لیے اس نے اس کام کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

رانی نے حیدر علی پر مہربانی ظاہر کرنے کے لیے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا بلکہ خود اس سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔

حیدر علی کی معذور بیوی اپنے بستر پر تھی۔ رانی نے کچھ دیر اس کی خیریت دریافت کی اور پھر حیدر علی کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھ گئی۔

"نائیک جی، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ آپ کی سمجھ بوجھ کے بھی قائل ہوں اور آپ کے پہاڑ جیسے شریر (جسم) کی بھی۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ وہ کہیے۔"

"میری یہی پسندیدگی ہے جو آپ کی ترقی دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے مہاراج کو قائل کیا ہے اور انہی کا پیغام لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔"

"کیسا پیغام؟"

"میری بات دھیان سے سننا۔ تمہارے سامنے کی بات ہے کہ تیج راج نے ریاست کا کیا حال کر دیا ہے۔ پچھلے سالوں میں راجا نے دو کروڑ روپے کے عوض مرہٹوں سے صلح کی تھی۔ ایک کروڑ ادا کر دیا گیا تھا۔ اب مرہٹے باقی رقم کا تقاضا کر رہے ہیں۔ تیج راج نے خزانے میں ایک کوڑی نہیں چھوڑی ہے۔ اگر رقم ادا نہیں کی گئی تو وہ میسور پر حملہ کر

دیں گے۔"

رانی یہاں تک کہنے پائی تھی کہ حیدر علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "رانی جی، آپ اتنی سی بات پر پریشان ہو گئیں۔ آپ فکر چھوڑ دیں، مرہٹوں سے میں نمٹ لوں گا۔"

"بات صرف اتنی نہیں ہے۔" رانی نے کہنا شروع کیا۔ "مہاراج یہ چاہتے ہیں کہ تیج راج کو معزول کر دیا جائے، اور اس کی جگہ کھانڈے راؤ کو وزیر مقرر کیا جائے۔ کھانڈے راؤ آپ کا دوست بھی ہے اور آپ کا ملازم بھی رہا ہے۔ اس کے پردے میں آپ ہی سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔"

حیدر علی نہایت زیرک شخص تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تیج راج کو درمیان سے ہٹا کر یہ لوگ اسے تنہا کرنے کے درپے ہیں۔ تیج راج سے پیچھا چھڑانے کے بعد یہ لوگ مجھے بھی برداشت نہیں کریں گے۔ تیج راج ہندو ہونے کے باوجود راجا کو برداشت نہیں۔ میں تو پھر مسلمان ہوں۔

یہ بات سب کو معلوم تھی۔ رانی بھی جانتی تھی کہ حیدر علی، تیج راج کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ میسور کے لوگ بھی تیج راج کے غلط فیصلوں کا ذمے دار حیدر علی کو قرار دیتے تھے۔ حیدر علی کے لیے اچھا موقع تھا کہ وہ اپنی نیک نامی میں اضافہ کرے اور تیج راج کو منظر نامے سے ہٹا دے لیکن یہ اقدام وطن کے لیے اچھا نہیں تھا۔ مرہٹے تاک میں لگے ہوئے تھے اور کھانڈے راؤ پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حیدر علی نے کمال ہوشیاری سے رانی کو ٹال دیا۔

"ابھی آپ کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ میں تیج راج سے خود بات کروں گا۔"

رانی کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تیج راج اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں اور اگر راجا نے زبردستی کی تو خانہ جنگی یقینی ہے۔ ریاست بدنظمی کا شکار ہو جائے گی۔ مرہٹے تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس صورتِ حال سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ اسے وطن کی سلامتی عزیز تھی۔ اس نے یہی سوچا کہ وہ اس معاملے کو جب تک ٹال سکتا ہے ٹالتا رہے گا۔ اس نے رانی کے نام پیغام بھیجا کہ آپ لوگ اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے رہیں۔ جب تک میں نہ کہوں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔

یہ پیغام دینے کے بعد حیدر علی ڈنڈی گل چلا گیا۔

یہ تو سیاسی معاملات تھے۔ حیدر علی رانی کی طرف سے یوں بھی خوف زدہ تھا۔ انسان تھا، سوچتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ رانی کا جادو اس پر چل جائے اور وہ گناہ میں ملوث ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ میں شادی کر لوں، رانی کا منہ بند ہو جائے گا۔ یہ شادی جلدی ہونا چاہیے، بعد میں نہ جانے کیا حالات پیدا ہوں۔ اس نے اپنے ایک سالار میر رضا علی خاں کی ہمشیرہ فاطمہ بیگم عرف فخر النسا سے شادی کر لی۔ اسی بیوی سے اللہ نے انہیں ایک بیٹے سے نوازا۔ اس بیٹے کا نام ٹیپو سلطان رکھا گیا۔ جوان ہونے کے بعد اسی بیٹے نے باپ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

حیدر علی نے رانی کو باور کرا دیا تھا کہ جب تک وہ نہ کہے تیج راج کو نہ چھیڑا جائے۔ رانی نے یہ پیغام راجا تک پہنچا بھی دیا تھا لیکن وہ جلدی میں تھا۔ راجا نے تیج راج اور دیوراج سے پیچھا چھڑانے کے لیے سازشوں کا جال بچھا دیا۔ ان سازشوں کا مرکزی کردار کھانڈے راؤ تھا اور بعض رانیاں بھی راجا کے ساتھ شامل تھیں۔

تیج راج اپنی جاگیر ستی منگل گیا ہوا تھا۔ حیدر علی ڈنڈی گل میں تھا کہ راجا کو موقع مل گیا اور اس نے تیج راج کی معزولی کے احکام صادر کر دیے۔ معزولی کی خبر تیج راج کو ہوئی تو وہ ستی منگل سے دوڑا چلا آیا۔ اس کے ساتھ معمولی سی فوج تھی۔

راجا کے براہ راست ماتحت تقریباً ایک ہزار فوجی تھے۔ راجا ان کے ہمراہ قلعے سے باہر نکلا۔ ان فوجیوں نے جان پر کھیل کر تیج راج کا مقابلہ کیا لیکن وہ گولہ باری کا سامنا نہ کر سکے۔ اس گولہ باری سے راجا کے ذاتی خدمت گار اور دیگر مرد و خواتین ہلاک ہو گئے۔ تیج راج کے آدمیوں کو موقع مل گیا کہ وہ محل میں داخل ہو جائیں۔

تیج راج بضد تھا کہ راجا کو بھی قتل کر دیا جائے لیکن بڑے بھائی دیوراج نے مخالفت کی بالآخر دونوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ راجا اور اس کے اہل خانہ کو قید کر دیا جائے، قتل نہ کیا جائے۔

دیوراج بہت مجبوری کی حالت میں راجا کو قید کرنے پر تیار ہوا تھا ورنہ وہ تو مکمل پسپائی کے اختیار میں تھا۔ تیج راج اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اختلافات اتنے بڑھے کہ دیوراج اپنے اہل خانہ اور ذاتی سپاہ کے ساتھ ستی منگل چلا گیا۔

راجا کے قید ہو جانے کے بعد میسور کی ریاست تیج راج کے قدموں میں تھی اور وہ اس ریاست کا واحد مالک تھا۔

راجا کی رہائی ناممکن تھی۔ دیوراج بھی جا چکا تھا۔ حیدر علی کی طرف سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔

تیج راج کو خود مختار ہوئے ابھی ایک مہینا ہوا تھا اور ابھی استحکام کی منزلیں دور تھیں کہ مرہٹوں نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میسور کو نشانہ بنایا اور سرنگا پٹم کا محاصرہ کرلیا۔

تیج راج اس وقت مرہٹوں سے لڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ مرہٹوں کی توپوں نے گولے برسانے شروع کیے تو وہ بڑی مشکل سے چند دن ان گولوں کے سامنے ڈٹا رہا۔ وہ بھی اس اُمید پر کہ حیدر علی اس کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ حیدر علی پہنچ بھی جاتا لیکن مرہٹوں کی حکمتِ عملی نے اسے بروقت نہیں پہنچے دیا۔ دراصل مرہٹوں نے میسور کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرنے سے قبل مالابار کے سربراہوں کو پالاگھاٹ کے حاکم پر چڑھا دیا تاکہ حیدر علی ادھر الجھ جائے اور سرنگا پٹم پہنچنے میں اسے دیر ہو جائے۔

تیج راج مرہٹوں کی گولہ باری سے تنگ آکر صلح کے لیے مجبور ہوگیا۔ اس نے 22 لاکھ ہرجانہ ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے 2 لاکھ نقد ادا کردیے اور بقایا رقم کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر 13 تعلقے دشمن کے حوالے کردیے۔

حیدر علی سرنگا پٹم پہنچا تو اس وقت تک مرہٹے محاصرہ اٹھا کر جا چکے تھے۔ تیج راج لٹے ہوئے مسافر کی طرح بے دست و پا بیٹھا تھا۔

حیدر علی نے مشورہ دیا۔ ”برسات کے آنے تک ہمیں صبر کرنا چاہیے۔ موسم برسات کے آتے ہی مرہٹہ کارندوں اور مرہٹہ فوجوں کو ان اضلاع سے نکال باہر کرو جو انہیں ضمانت کے طور پر دیے گئے ہیں۔ اس زمانے میں دریا چڑھے ہوئے ہوں گے اور مرہٹے اس وقت تک کرشنا اور تنگ بھدرا پار نہ کرسکیں گے جب تک کہ پانی کی سطح کم نہ ہوجائے۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ تیج راج نے مردہ آواز میں کہا۔ ”جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا ہوگا۔“

”مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ میں ڈنڈی گل سے امدادی کمک لاسکوں۔“

حیدر علی کا یہ مشورہ نہایت مناسب تھا کیونکہ خزانہ خالی پڑا تھا۔ حکومت دیوالیا ہوگئی تھی۔ یہ موقع تاوان ادا کرنے کا نہیں تاوان بٹورنے کا تھا۔ اس کے لیے مہلت درکار تھی۔

یہ مشورہ دینے کے بعد حیدر علی ڈنڈی گل روانہ ہوگیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی تیج راج کے خلاف فوجی بغاوت ہوگئی۔ ان سپاہیوں نے جنہیں تنخواہیں نہیں ملی تھیں تیج راج کے محل کا محاصرہ کرلیا تاکہ اشیائے خورد و نوش کی فراہمی روکی جاسکے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ تنخواہیں ادا کرے۔

حیدر علی کو ڈنڈی گل میں اس کی خبر پہنچی تو اس کی وطن پرستی نے جوش مارا۔ وہ اس موقعے سے بہت بڑا فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اس نے تیج راج کی مدد کا فیصلہ کیا اور دیوراج کے پاس ستیا منگلم پہنچ گیا۔ اسے وطن کا واسطہ دیا اور سمجھایا کہ وہ تیج راج سے صلح کرلے اور اس کی مدد کرے تاکہ بغاوت ختم ہو۔ اس وقت دیوراج سخت علیل تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھائی سے صلح کرلے گا۔

حیدر علی سرنگا پٹم آیا اور تیج راج کو مشورہ دیا کہ وہ راجا کو قید سے رہا کردے اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرلے۔

تیج راج شاید اس مشورے کو تسلیم نہ کرتا لیکن دیوراج کے انتقال کی خبر آگئی۔ فوجیوں کی تنخواہ تلوار بن کر سر پر لٹک رہی تھی۔ ایسے میں راجا ہی کچھ کام آسکتا تھا لہٰذا تیج راج مجبور ہوگیا۔ تیج راج نے محل پر حاضری دی اور راجا کرشنا سے معافی طلب کی۔ راجا، تیج راج سے خوش نہیں تھا لیکن حیدر علی درمیان میں تھا اور ریاست کے معاملات دگرگوں تھے۔ راجا نے دربار عام منعقد کیا اور تیج راج کو معاف کردیا۔

سپاہیوں کا مطالبہ اب بھی اپنی جگہ تھا۔ وہ تیج راج کے وعدوں پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ حیدر علی نے پھر دوستی نبھائی۔ سپاہیوں کو ایک بڑے میدان میں جمع کیا اور ناراض فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی اپنے ذمے لے لی۔

”بے بدل سپاہیو! میری بات غور سے سنو۔ میسور کی طاقت تم ہو۔ تمہارے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ تمہاری تنخواہیں ابھی تک ادا نہیں ہوئیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری تنخواہیں میں ادا کروں گا۔ تیج راج کا اس میں کوئی دخل نہیں، تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ خزانہ خالی ہے لیکن میں نے بندوبست کرلیا ہے۔ بہت جلد رقم کا انتظام ہوجائے گا۔“

سپاہیوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے۔ سب حیرت زدہ تھے کہ حیدر علی اتنی رقم کا بندوبست کیسے کرے گا۔

وہ راجا سے بات کرنے کے لیے محل میں گیا تو ایک مرتبہ پھر رانی لکشمی اس کے سامنے تھی۔ وہ حیدر علی کو کئی سال بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کی محبت اس کی آنکھوں میں آگئی۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”نائیک جی، دوسری شادی مبارک ہو۔ اب تو سنا ہے ایک بیٹا بھی تمہاری بیوی کی گود میں آگیا ہے۔ میری گود ابھی تک خالی ہے اور اب کیا بھرے گی۔ اب تو تم میرے نہیں پورے میسور کے محبوب ہو۔ تمہیں اتنی فرصت کہاں کہ میری طرف آنکھ بھر کر دیکھو۔“

”رانی جی، یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ ہمیں اپنے سے زیادہ وطن کی فکر کرنی چاہیے۔ مجھے مہاراج سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”ہائے رام، کتنے کٹھور ہو۔ راجا جی تو چھپر کھٹ سے نہیں اٹھتے تم سے بات کیا کریں گے۔ پھر بھی میں تمہیں روک تو نہیں سکتی۔ میری پرارتھنا ہے کہ تم خوش رہو۔“

وہ راستے سے ہٹ گئی۔

راجا کرشنا ہمیشہ سے اسے پسند کرتا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اس پر بھروسا کرتا تھا۔ اسے دیش بھگت کہتا تھا اور اب تو وہ اس کا نجات دہندہ تھا۔ اسے قید سے رہائی دلائی تھی اور سینہ ٹھونک کر کہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے تیج راج اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔

اسے دیکھتے ہی راجا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

حیدر علی راج محل سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر وہ اطمینان تھا جو کسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بعد ہوتا ہے۔

حیدر علی نے راجا کے احکامات کی بجاآوری کرتے ہوئے رقم کے بجائے وہ تمام سرکاری جائداد تقسیم کردی جو قابلِ تقسیم تھی۔ اس میں راجا کے ہاتھی اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ یہ سب کچھ اتنا تھا کہ چار ہزار گھڑسواروں کی تنخواہوں کی مکمل ادائی ہوگئی۔

حیدر علی اس وقت میسور کا سب سے مقبول آدمی تھا۔ راجا کے نزدیک وہ اس کا یکہ و تنہا محافظ تھا۔ سپاہی اسے اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے کہ ان کی تنخواہوں کی ادائی اسی کی سعی و کاوش کی بدولت ہوئی تھی۔ حیدر علی کو اپنی مضبوط حیثیت کا احساس تھا مگر اس وقت وہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور نہیں سمجھتا تھا کہ تیج راج کو اقتدار سے بے دخل کرسکے۔ اس کو اس معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی تھی لیکن تیج راج کی نامقبولیت اسے اکسا ضرور رہی تھی۔

حالیہ انتشار میں حیدر علی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسے بنگلور کا قلعہ اور ضلع جاگیر کے طور پر عطا کیا گیا۔ حیدر علی کو اپنی اہمیت کا احساس اسی سال نہایت شاندار طریقے سے ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے میسور کی سرحد پار کرلی اور تاوان کی بقایا رقم کا مطالبہ کرنے لگے جو تیج راج نے ان سے معاہدہ کیا تھا۔

مرہٹے ان اضلاع میں پہنچ گئے تھے جو گزشتہ معاہدے کے مطابق ان کے پاس گروی رکھے گئے تھے۔ راجا میسور اور تیج راج نے فوجی عہدے داروں کو حکم دیا کہ وہ مرہٹہ سرداروں کا راستہ روکنے کے لیے کارروائی کریں لیکن کوئی فوجی عہدے دار اس کے لیے آمادہ نہ ہوا لہٰذا حیدر علی کو میسور کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ راجا نے اسے خان بہادر کا لقب دیا۔ اس کے علاوہ ذاتی علم، ذاتی ہاتھی اور ذاتی مسند شاہی بھی عطا کی۔

مرہٹہ سرداروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے لکھا۔ ”ہم حیدر کو بنگلور میں داخل ہونے دیں گے اور تب اپنی توپیں نصب کریں گے اور پھر دیکھیں گے کہ وہ کیسے ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔“

حیدر علی نے پیش قدمی کا آغاز کیا اور ان تمام قلعوں کی طرف فوجی دستے متعین کردیے جہاں سے مرہٹے پایۂ تخت کی طرف آسکتے تھے۔ گویا تمام راستوں کی ناکا بندی کردی۔

مرہٹے جلد ہی اتنے مجبور ہوگئے کہ حیدر علی سے مقابلے کے لیے کوچ کرنے لگے۔

مرہٹوں کے پاس حیدر علی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ فوج تھی لہٰذا وہ مرہٹوں کو کھلے میدان میں شکست دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک ایسے پہاڑی خطے میں اپنا پڑاؤ کیا جو سواروں کے لیے ناقابلِ عبور تھا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ دن کے اوقات میں باہر نہ نکلیں اور رات ہوتے ہی شب خون مارنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔

”ہم کھلے میدان میں مقابلہ نہیں کرسکتے لیکن اگر شب خون کا سلسلہ جاری رہا تو ہم انہیں تھکا سکتے ہیں۔ وہ واپس پلٹنے پر مجبور ہوجائیں گے۔“

دو مہینے کی لگاتار محنت کے بعد وہ مرہٹوں کو میسور کی حدود سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ حیدر علی نے مقبوضہ قلعوں کو اپنی فوج کے حوالے کیا اور بذات خود سرنگا پٹم کی طرف لوٹ گیا۔

حیدر علی کو بڑی بڑی جاگیریں اور مرہٹوں کو بڑی رقوم کی ادائی نے ریاست کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ ریاستی اخراجات کی متحمل ہوسکے۔ کچھ کھانڈے راؤ کی سازشیں بھی تھیں جو ریاست کو مالی بحران سے نکلنے نہیں دے رہی تھیں۔ وہ راجا کو اس توہین اور ہتک کی یاد دہانی بھی کراتا رہتا تھا جو تیج راج کے ہاتھوں راجا کو اٹھانی پڑی تھی۔ یہ بھی باور کراتا رہتا تھا کہ تیج راج ہی اس مالی بحران کا ذمے دار ہے۔

حیدر علی عملی طور پر سپہ سالار اعظم بن چکا تھا لہٰذا راجا

کو اب تیج راج کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ راجا نے حیدر علی سے کہا۔ ''تم تیج راج سے اپنے تمام تعلقات توڑ لو۔''

حیدر علی اس حکم کو مانتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ ایسا کرتے ہوئے آئندہ فوجوں کو باقاعدہ تنخواہوں کی ادائی کی ذمے داری اس پر آجاتی تھی اور خزانے کی حالت اس پر ظاہر تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک روز یہی سپاہی اس کے محل کے سامنے دھرنا دیے بیٹھے ہوں گے۔ اس کا حال بھی تیج راج جیسا ہی ہوگا۔

''کیا سوچ رہے ہو حیدر علی۔''

''مہاراج میں سوچ رہا ہوں سپاہی آج تیج راج سے تنخواہوں کا مطالبہ کر رہے ہیں کل مجھ سے کریں گے۔''

''اس کا انتظام ہو جائے گا۔''

تنخواہوں کی ادائی کے لیے حیدر علی کو مزید علاقے دیے گئے۔ اس طرح نصف سلطنت سے زیادہ علاقہ براہ راست اس کے قبضے میں آگیا۔

حیدر علی سکدوشی کی بات چیت کرنے کے لیے جیسے ہی تیج راج کے دروازے پر پہنچا وہ سمجھ گیا کہ منصوبہ تیار ہے۔ وقت آچکا۔ اس نے دروازے کھول دیے۔ حیدر علی نے تمام واقعات وحقائق کھول کر اس کے سامنے بیان کر دیے۔

''اب آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وزارت سے دست کش ہو جائیں۔ راجا کی حماقت سے ملک میں شورش پھیلی ہوئی ہے اور نام آپ کا ہو رہا ہے۔''

''اچھا ہوا یہ مطالبہ آپ کی طرف سے ہوا ورنہ میں تو خود اس جھنجٹ سے نجات پانا چاہتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ ریاست پر اس احسان کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟''

''میں اس سلسلے میں راجا سے بات کروں گا۔ آپ کو جتنی رعایت مل سکتی ہے ضرور ملے گی۔''

تیج راج کو ایک جاگیر دی گئی جس کی آمدنی تین لاکھ پگوڈا تھی۔ اس کو ایک ہزار سوار اور تین ہزار پیادے رکھنے کی اجازت بھی دی گئی لیکن بعد میں راجا میسور نے کھانڈے راؤ کے مشورے سے اس کی جاگیر میں کٹوتی کر دی۔ راجا کی طرف سے حکم نامہ جاری کیا گیا۔

''تیج راج کو فوج رکھنے کی ضرورت نہیں اور اسے تین لاکھ پگوڈا کی آمدنی کی حامل جاگیر کے بجائے ایک لاکھ پگوڈا کی جاگیر عطا کی جائے اور حکم دیا جائے کہ وہ فی الفور میسور سے نکل جائے۔''

تیج راج نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی سے کہا گیا کہ وہ میسور کا محاصرہ کر لے۔ حیدر علی نے میسور کا محاصرہ کر لیا۔

اقتدار کی بھول بھلیاں بھی عجیب سبق آموز ہوتی ہیں۔ تیج راج اپنی زندگی کی آخری لڑائی اس شخص کے خلاف لڑ رہا تھا جس کی اب تک کی ترقی تیج راج کی مہربانیوں کی مرہون منت تھی۔

جب برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ تیج راج کے سفید فام دستے کے سالار اعلیٰ نے غداری کی اور حیدر علی سے مل گیا۔ تیج راج کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

رانی لکشمی اور راجا کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی تھی۔ تیج راج کا وجود ریاست میسور سے الگ ہو گیا تھا۔ دیوراج پرلوک سدھار گیا تھا۔ کھانڈے راؤ کو وزیر سلطنت بنا دیا گیا تھا۔

کھانڈے راؤ کو ریاست کے اس حصے کا وزیر اعظم بنایا گیا تھا جو حصہ ابھی حیدر علی کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ یہ حصہ کل سلطنت کے آدھے سے زیادہ نہیں تھا۔ کھانڈے راؤ کو یہ کمی بری طرح کھٹکتی تھی کہ سلطنت کا آدھا حصہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس پر حیدر علی قابض ہے۔ حیدر علی کے مطالبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ کھانڈے راؤ کو یہ فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ اگر یہی حال رہا تو تمام ریاست پر حیدر علی کا قبضہ ہو جائے گا۔ وہ حیدر علی سے ٹکر لینے کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

حیدر علی کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے راجا بھی نالاں رہنے لگا تھا۔ اس کا تو وہی حال ہوا تھا کہ آسمان سے گرا کھجور بھی اٹکا۔ پہلے تیج راج کے مطالبوں سے پریشان تھا اب حیدر علی کے مطالبے پریشان کر رہے تھے۔ حیدر علی اب اتنی طاقت پکڑ چکا تھا کہ کوئی اس کے خلاف نہیں بول سکتا تھا۔ وہ سپہ سالار تھا لیکن وزیر کھانڈے راؤ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

جب سے حیدر علی نے دوسری شادی کی تھی رانی لکشمی سمجھنے لگی تھی کہ حیدر علی اب اس کے ہاتھ آنے والا نہیں۔

طاقت پکڑتے ہی حیدر علی کے رویے میں بھی ایسی سرد مہری آگئی تھی جس نے رانی کو مایوس کر دیا تھا۔

محبت جب نفرت میں بدلتی ہے اور انتقام لینے پر اتر آتی ہے تو بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ رانی لکشمی بھی ایسے ہی مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ناکامی نے اس کے دل میں آگ سی لگا دی تھی۔ اب وہ راجا کو بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ حیدر علی سے تنگ آنے لگا تھا۔ اس کی طرف سے مخالفت کا امکان نہیں تھا لیکن کھانڈے راؤ کی طرف سے اسے شک تھا

کیونکہ وہ حیدر علی کا نائب رہ چکا تھا۔ اس کی وفاداری خریدنے کی ضرورت تھی۔ رانی نے کھانڈے راؤ کو بلا بھیجا۔

رانی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ خود حیدر علی سے دامن چھڑانے کو تیار بیٹھا ہے۔ اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اسے رانی کی صورت میں میسر آگیا۔ اس منصوبے میں کھانڈے راؤ کے شامل ہونے کی دیر تھی، راجا کے دوسرے وفادار بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔

جب سازش پک کر تیار ہو گئی تو کھانڈے راؤ نے تجویز پیش کی۔

''ہم حیدر علی سے تنہا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں مرہٹہ سردار وساجی پنڈت کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔ ایک طرف سے ہم حیدر علی پر حملہ کریں دوسری طرف سے مرہٹے اس پر چڑھ دوڑیں۔ اس طرح ہم بہ آسانی حیدر علی کو سلطنت سے باہر نکال سکتے ہیں۔''

''مرہٹوں کو اس حملے کے لیے تیار کون کرے گا؟'' ایک وزیر نے سوال کیا۔

''اس کے لیے تو ہمیں راجا کی مدد کی ضرورت ہوگی۔'' ایک وزیر نے کہا۔

''راجا جی ہم سے باہر نہیں ہیں۔'' کھانڈے راؤ نے کہا۔ ''جو ہم کہیں گے انہیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اگر نہیں کریں گے تو ہم انہیں گدی سے اتارنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔''

مختصر یہ کہ کھانڈے راؤ نے راجا سے ملاقات کی اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اسے اس منصوبے سے تو اتفاق تھا لیکن وہ مرہٹوں کو بلانے سے ہچکچا رہا تھا لیکن جب اس نے کھانڈے راؤ کے تیور دیکھے تو وہ مرہٹوں کو خط لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔

خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا اور یہ سازشی ٹولہ مناسب موقعے کا انتظار بھی کرتا رہا۔

راجا کی اجازت ملتے ہی کھانڈے راؤ نے اپنی طرف سے بھی مرہٹوں کو ایک چٹھی لکھی۔

''حیدر علی میسور کی تاک میں ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو ہندو حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ اسلامی ریاست ہمیشہ آپ کے لیے خطرہ بنی رہے گی۔ اگر حیدر علی کو گرفتار کرنے میں آپ ہماری مدد کریں تو ہم ہمیشہ آپ کے وفادار رہیں گے اور ایک معقول رقم کے علاوہ ہمیشہ ''چوتھ'' بھی دیتے رہیں گے۔''

کھانڈے راؤ نے اپنے اقتدار کے لیے ریاست کو مرہٹوں کی باجگزار بنانے کی پوری کوشش کی۔

یہ حیدر علی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بہ مشکل 33 دیہات پر مشتمل یہ ریاست دریائے کرشنا کے جنوب میں پورے جنوبی ہند تک پھیل چکی تھی اور اب کھانڈے راؤ اس کے ٹکڑے کرنے پر بضد تھا۔

حیدر علی کی زیادہ تر فوج فرانسیسیوں کی مدد کے لیے گئی ہوئی تھی۔ فوج کا ایک حصہ ارکاٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ حیدر علی کے پاس محض پندرہ سو افراد کی نفری موجود تھی۔ حیدر علی اس سازش سے بے خبر بیوی بچوں کے ساتھ سرنگا پٹم میں تھا کہ دشمن نے سرنگا پٹم کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور گولے برسانا شروع ہو گئے۔ حیدر علی نے بیوی کو جھنجوڑا۔

''ہمارے خلاف سازش ہو گئی ہے۔ میرے پندرہ سو افراد کب تک مقابلہ کریں گے۔''

''آپ کی وفاداری کا یہ صلہ؟''

''یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں۔ مجھے اپنا دفاع کرنا ہے۔''

''اب دفاع ممکن نہیں۔'' بیوی نے کہا۔ ''آپ اپنی جان بچا کر سرنگا پٹم سے نکل جائیں۔ دشمن کو آپ کی تلاش ہوگی ہماری نہیں۔ آپ زندہ رہے تو فوجیں جمع کر کے دوبارہ سرنگا پٹم آسکتے ہیں۔''

برسات کی اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے سرنگا پٹم سے نکلنا تھا لیکن وہ کہاں جائے گا یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ گرفتاری سے اچھی تو موت ہے، اس نے سوچا۔ بیوی، بچوں کو خدا کے سپرد کیا اور گھر سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ دو سو کے قریب گھڑ سوار تھے اور سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیلیاں تھیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح دریائے کاویر کے سامنے پہنچ گیا۔ چڑھے ہوئے دریا کی موجیں دل دہلا رہی تھیں۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور دریا میں کود پڑا۔ موجوں کو چیرتا ہوا دریا کے پار چلا گیا۔

اب وہ محفوظ تھا لیکن محفوظ منزل کی تلاش میں تھا۔ بنگلور میں اس کی طرف دار فوج کا ایک دستہ موجود تھا۔

وہ بنگلور کی طرف چل دیا۔ بیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ بنگلور پہنچ گیا۔ اس کی طرف دار فوج کے سرداروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

حیدر علی کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ بنگلور میں رہ کر اپنا دفاع اس وقت تک کرتا رہے، جب تک وہ فوج واپس نہیں آجاتی جو مخدوم علی کی نگرانی میں فرانسیسیوں کی مدد کو گئی ہوئی تھی۔

کھانڈے راؤ، مرہٹوں کو لے کر سرنگا پٹم میں داخل

ہوا تو اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ حیدر علی فرار ہو چکا ہے۔ صبح تک فوجیوں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ حیدر علی بنگلور کی طرف گیا ہوگا کیونکہ وہاں اس کا ایک فوجی دستہ تھا۔

حیدر علی نے بنگلور پہنچتے ہی مخدوم علی کو خط لکھ دیا تھا کہ جس فوج کو لے کر فرانسیسیوں کی مدد کو جا رہے ہو اسے لے کر فوراً واپس آ جاؤ۔

مرہٹے بھی حیدر علی کے تعاقب میں بنگلور کی طرف روانہ ہوئے۔

مخدوم علی کو جیسے ہی حیدر علی کا پیغام موصول ہوا اس نے برق رفتاری سے واپسی کا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انیکل کے مقام پر تھا کہ مرہٹوں اور کٹھ پتلی راجا کی مشترکہ افواج نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ مرہٹے تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ مخدوم علی بنگلور کی طرف بڑھنے سے قاصر ہو گیا۔ اس نے پسپائی اختیار کی اور ایک مقام پر محصور ہو کر رہ گیا۔

حیدر علی کو معلوم ہوا تو اس نے تھوڑی سی فوج بنگلور کے دفاع کے لیے اپنے پاس رکھی اور بقایا فوج کو مخدوم علی کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔ اس امدادی فوج کی کمان میر فیض اللہ کے پاس تھی۔ یہ فیض اللہ امدادی فوج لے کر جا رہا تھا کہ مرہٹوں نے اسے راستے میں دھر لیا۔ وہ کھلے میدان میں جنگ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جلد ہی اپنے نو سو سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کچھ قتل ہوئے کچھ قید ہو گئے۔

حیدر علی کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ مخدوم علی دشمن کے گھیرے میں تھا۔ امدادی فوج کٹ چکی تھی، بنگلور کے دفاع کی اب کوئی صورت نہیں تھی۔ اب اپنے مستقبل کی ضمانت تک اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ مجبور ہو گیا کہ مرہٹوں سے صلح صفائی کی بات کرے۔

صلح کی بات کئی روز جاری رہی اور بالآخر مرہٹوں نے صلح کے عوض پانچ لاکھ کا مطالبہ کر دیا۔ مرہٹے پانچ لاکھ روپے لے کر اپنی فوج کو واپس لے گئے۔

اب حیدر علی کے لیے مہم آسان ہو گئی تھی۔ اس کے مقابل صرف کھانڈے راؤ رہ گیا تھا جس سے بہ آسانی مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی فوج اِدھر اُدھر سے جمع کی اور سرنگاپٹم جانے کے لیے دریائے راوی پار کر گیا۔ کھانڈے راؤ اس سے مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ کھانڈے راؤ کی فوج چار ہزار سپاہ پر مشتمل تھی جو یورپی بندوقوں سے مسلح تھی۔ اس کے مقابلے میں حیدر علی کی فوجی نفری انتہائی کم تھی لیکن حیدر علی نہایت اعلیٰ جنگی قابلیت کا مالک تھا۔ کثرت و قلت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

حیدر علی نے اسی حکمت عملی کا سہارا لے کر چند خطوط ایک ہی مضمون کے تحریر کیے۔ مضمون یہ تھا۔

''اگر آپ اپنے سپہ سالار کھانڈے راؤ کو ہلاک کر دیں گے تو حیدر علی سے قرار واقعی انعام پائیں گے۔''

یہ خطوط کھانڈے راؤ کے فوجی افسران کے نام تحریر کیے گئے تھے۔ پیغام بر سے کہا گیا تھا کہ وہ کھانڈے راؤ کے لشکر میں پہنچ کر جان بوجھ کر گرفتار ہو جائے۔ اس کے بعد اسے کیا کرنا ہے وہ بھی بتا دیا گیا تھا۔

یہ پیغام بر منصوبے کے مطابق کھانڈے راؤ کے فوجی افسران کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اسے پکڑ کر کھانڈے راؤ کے پاس لے گئے۔ کھانڈے راؤ نے اس کی تلاشی لی تو وہ خطوط برآمد ہوئے۔

''یہ کیا ہے؟''

''جو آپ دیکھ رہے ہیں۔''

''تم اور تمہارا مالک میرے افسروں کو بہکا رہا ہے۔''

''آپ بہت بھولے ہیں کھانڈے راؤ۔ آپ کے لشکر میں یہ میرا تیسرا پھیرا ہے۔ آپ کے کئی افسروں نے ان خطوط کا مثبت جواب دیا ہے۔ مجھے تو آپ قتل کر ہی دیں گے لیکن آپ کے کئی افسروں نے آپ کو ہلاک کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آپ اپنی فکر کریں۔''

کھانڈے راؤ نے اس خدشے کے پیش نظر کہ قاصد کو قتل کرنے سے راز نہ کھل جائے، اسے جانے دیا لیکن خود بھی اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنی فوج کو چھوڑ کر سرنگاپٹم کی طرف بھاگ نکلا۔

وہ عجیب عالم تھا کہ جب رات گزری اور صبح فوج کو معلوم ہوا، ان کا سپہ سالار انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ نکلا ہے۔ وہ ابھی اس حیرت سے نکلنے نہ پائے تھے کہ حیدر علی کی فوج نے سامنے اور عقب سے بھرپور حملہ کر دیا۔ سپہ سالار کے بغیر فوج کیا لڑتی محض چند گھنٹوں میں دشمن کی فوج، توپیں، جنگی ساز و سامان حیدر علی کے قبضے میں آ گیا۔

کھانڈے راؤ کے جنگی قیدیوں نے حیدر علی کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی جس سے حیدر علی کی فوجی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد حیدر علی نے سرنگاپٹم پر چڑھائی کر دی۔ شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شاہی محل پر گولہ باری شروع کر دی۔ کھانڈے راؤ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ مقابلہ کرتا۔ محل میں کھلبلی مچ گئی۔ گولوں کے جواب میں مستورات کی چیخیں محل سے باہر آ رہی تھیں۔

راجا نے بدحواس ہو کر ایک معتمد کو حیدر علی کے پاس بھیجا اور صلح کا طالب ہوا۔

''راجا سے کہنا، مجھے تم سے کوئی پرخاش نہیں۔ جس کھانڈے راؤ کو محل میں چھپا کر رکھا ہے اسے میرے حوالے کر دو۔ میں گولہ باری بند کر دوں گا۔''

راجا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کھانڈے راؤ کو حوالے کر دے۔ راجا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ حیدر علی نے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے گولہ باری شروع کر دی۔ محل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہی رانیاں جو کھانڈے راؤ کو وزیر اعظم بنانے کے جرم میں شریک تھیں اب راجا کے پاؤں پڑ رہی تھیں کہ وہ کھانڈے راؤ کو حیدر علی کے حوالے کر کے ان کی جان بچا لے۔

سیاہ چادر میں ملبوس ایک عورت حیدر علی کے افسروں کے پاس آئی اور ملتمس ہوئی کہ وہ اسے حیدر علی کے پاس لے چلیں۔ یہ تو ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ عورت محل سے نکلی ہے یقیناً کوئی اہم شخصیت ہوگی لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہے۔ اسے ضروری پوچھ گچھ کے بعد حیدر علی کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے حیدر علی کے سامنے پہنچ کر اپنا منہ کھول دیا۔

''رانی جی، آپ!'' حیدر علی نے چونک کر کہا۔

''ہاں میں۔ آپ کو محل میں بلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی اس لیے خود حاضر ہو گئی۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں کس لیے؟''

''مجھے ہمیشہ میری ضرورت تمہارے سامنے لائی ہے۔ اس وقت بھی میں اپنے مطلب سے آئی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں، اسی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ آپ محل پر گولہ باری بند کر دیں۔''

''میں نے ہمیشہ آپ کی خواہشات کو ٹھکرایا ہے لیکن آج نہیں ٹھکراؤں گا کیونکہ اس میں مجھے کوئی گناہ نہیں ملے گا۔''

''گولہ باری بند کر دیں گے؟''

''ایک شرط پر۔'' حیدر علی نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ ''کھانڈے راؤ کو میرے حوالے کر دو۔''

''تم وعدہ کرو کہ اس کی جان بخش دو گے۔''

حیدر علی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر تبسم ابھر آیا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

رانی نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن حیدر علی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''میرے مذہب میں اس کی ممانعت ہے۔ آپ میرے لیے غیر ہیں۔''

''تم نے میری بات کی لاج رکھ لی۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' رانی نے کہا اور جس طرح آئی تھی اسی طرح منہ ڈھانپ کر باہر نکل گئی۔

حیدر علی نے گولہ باری بند کر دی۔

کھانڈے راؤ مجرم کی طرح اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ حیدر علی نے اپنا قول پورا کیا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ہلاک نہیں کرے گا یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ قید بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کھانڈے راؤ کو لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں قید کر دیا۔ اس پنجرے میں اسے کھانا ڈال دیا جاتا تھا۔

کھانڈے راؤ سمیت اس پنجرے کو اس نے بنگلور بھیج دیا۔ تقریباً ایک سال بعد وہ بدنصیب اسی پنجرے میں اپنی زندگی کے دن پورے کر کے مر گیا۔

ہندو امرا میں حیدر علی اب بھی اتنا ہی مقبول تھا جتنا پہلے تھا۔ اس نے ان امرا کو ساتھ لیا اور راجا سے ملنے چلا گیا۔ اس کی رانیوں نے اسے پھر مشورہ دیا کہ وہ حیدر علی سے ملاقات نہ کرے۔ راجا نے انکار کر دیا لیکن وہ حیدر علی تھا۔ کسی کے روکے رکنے والا نہیں تھا بلکہ اب تو وہ فاتح تھا۔ ایک دستہ فوج کا اس کے ساتھ تھا۔ وہ زبردستی اندر گھس گیا اور دروازے پر پہرا بٹھا دیا۔

وہ راجا کے ساتھ نہایت ادب سے پیش آیا اور تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔

''میرے ساتھ ساتھ آپ کے امرا کا بھی یہ خیال ہے کہ اب ریاست کے معاملات مضبوط ہاتھوں میں ہوں اور آئے دن کی سازشوں سے چھٹکارا ملے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' راجا نے کہا۔

''کھانڈے راؤ نے سخت نادانی کی کہ تمہیں ناراض کر دیا۔ اب تم آ گئے ہو، تمہارے ساتھ مل کر سب ٹھیک کر لوں گا۔''

''آپ سے کیا امید رکھوں جبکہ آپ خود مجھے ہٹانے کی سازش میں شریک تھے۔''

''یہ مجھ پر بہت بڑا الزام ہے۔ میں کسی سازش میں شریک نہیں تھا۔''

''یہ مت بھولیے کہ کھانڈے راؤ میرے قبضے میں ہے۔ اس نے تفتیش کے دوران سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''وہ جھوٹا ہے، اپنا جرم میرے سر تھوپنا چاہتا ہے۔''

''اگر وہ جھوٹا ہے تو پھر یہ کیا ہے؟''

حیدرعلی نے چند خطوط اس کے سامنے رکھ دیے۔ راجا کی طرف سے مرہٹوں کے نام لکھے گئے یہ خطوط مرہٹوں سے ایک جھڑپ کے دوران اس کے ہاتھ لگ گئے تھے۔

''میں نے جس ریاست کی ترقی کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے، آپ اسی ریاست کو مرہٹوں کے ہاتھوں نیلام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔''

اس کے ساتھ آئے ہوئے ہندو امرا نے بھی ان خطوط کو پڑھا۔ ان پر بھی راجا کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ راجا لاکھ کہتا رہا کہ وہ بہکاوے میں آگیا تھا لیکن ان امرا نے اس سے دست برداری کا مطالبہ کر دیا۔

''آپ کمزور تھے اسی لیے سازشیوں کے بہکاوے میں آگئے۔ آئندہ پھر آسکتے ہیں۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ آپ حیدرعلی کے حق میں دست بردار ہوجائیں کیونکہ اس وقت ریاست میں حیدرعلی کے سوا کوئی نہیں جو انتظامات سنبھال سکے اور ریاست کو مرہٹوں کے دست برد سے بچا سکے۔'' امرا نے پرزور مطالبہ کیا۔

راجا نے ہوا بدلی دیکھی تو حیدرعلی کی خوشامد پر اتر آیا۔

''حیدرعلی میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست کہا اور سمجھا ہے۔ کیا تم بھی ان امرا کی ہاں میں ہاں ملاؤ گے۔''

''راجا جی، یہ سردار جو آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں اس میں میری خواہش کو دخل نہیں لیکن کہہ یہ ٹھیک رہے ہیں۔ وطن کی سلامتی کی خاطر آپ کو ان کا مطالبہ تسلیم کر لینا چاہیے۔''

راجا اب سمجھ گیا تھا کہ چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر کچھ شرائط طے ہوجائیں تو آئندہ زندگی آرام سے گزر جائے گی۔

''میں نے اس دیش کی خدمت کی ہے۔ کیا میں اسی سلوک کا مستحق ہوں کہ بھوکا مار دیا جاؤں؟''

''ہم آپ کو بھوکا کیسے مار سکتے ہیں۔'' حیدرعلی نے تسلی دی۔ ''آپ کو وظیفہ ملتا رہے گا اور ایک جاگیر گزارے کے لیے مل جائے گی۔''

''اس کا مطلب ہے مجھے محل چھوڑنا پڑے گا؟''

''محل اس کا ہوگا جس کی حکومت ہوگی۔ اب یہاں کا حکمران میں ہوں۔''

''اگر میرے دیش کی بہتری اسی میں ہے تو میں سلطنت کے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔'' راجا نے اس طرح کہا جیسے وہ ان سب پر کوئی احسان کر رہا ہو۔

''آپ اس مضمون کی ایک تحریر لکھ دیں تاکہ میں مشتہر کرا دوں۔ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ راجا کی جگہ حیدرعلی نے سنبھال لی ہے۔''

راجا نے تحریر لکھ دی۔ حیدرعلی نے اس کا اعلان ریاست میں نشر کرا دیا۔

''میں راجا میسور اعلان کرتا ہوں کہ آج تاریخ 4 مئی 1761ء سے حیدرعلی ریاست کے مالک ہوں گے۔ ریاست کے لوگوں کو چاہیے کہ حیدرعلی کے حکم کو میرا حکم سمجھیں اور مانیں۔''

حیدرعلی، راجا سے تحریر لکھوانے کے بعد دیوان خانے سے باہر نکل رہا تھا کہ رانی لکشمی راہ میں آگئی۔

''مہاراج حیدرعلی، مجھے محل کب خالی کرنا ہے؟''

''رانی جی، آپ مجھ پر طنز کر رہی ہیں۔''

''میں نے کوئی غلط سوال کر لیا؟''

''رانی جی، یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ میں نے جو کچھ کیا اس پر میں مجبور کر دیا گیا تھا۔''

''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو صرف آپ کو دیکھنے چلی آئی تھی کہ کیا خبر پھر کبھی آپ کے درشن ہوتے ہیں یا نہیں۔''

حیدرعلی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کچھ دیر رانی کے سامنے رکا رہا تو اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

⊕⊕⊕

حیدرعلی کچھ دنوں سرنگاپٹم کے انتظام و انصرام میں مشغول رہا اور پھر بنگلور چلا گیا۔ وہ ابھی بنگلور میں تھا کہ بصالت جنگ کا سفیر ادرنی سے اس کے پاس آیا اور عرض کی کہ ہوسکوٹ کے محاصرے میں بصالت جنگ کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

بصالت جنگ حیدرآباد کے حکمران صلابت جنگ کا بھائی تھا۔ وہ کچھ دنوں تک تو صلابت جنگ کا دیوان رہا اور پھر ایک دوسرے بھائی کی سازش کا شکار ہوکر معزول ہوگیا۔ پھر وہ اپنے علاقے ادرنی چلا گیا جہاں کا وہ نواب تھا۔ جب مرہٹوں کو پانی پت میں شکست ہوئی تو بصالت جنگ کو جنوب کی جانب علاقوں میں توسیع کا خیال آیا کیونکہ اس وقت مرہٹوں میں انتشار تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ''ہوسکوٹ'' کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا اور ہوسکوٹ فتح ہونے میں نہ آتا تھا۔

حیدرعلی بنگلور میں مقیم تھا جو ہوسکوٹ سے صرف 18 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ بصالت جنگ کے وسائل جواب دے چکے ہیں۔

بصالت جنگ کو مشکل میں دیکھ کر حیدرعلی کے سینے میں دبے ہوئے انتقام کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ ہوسکوٹ کے راستے ہی میں ''سرا'' پڑتا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس کے باپ فتح علی نے کبھی ملازمت کی تھی، قریب ہی دودبالاپور تھا۔ یہاں اس نے بچپن میں قید کے دن گزارے تھے۔ عباس قلی خاں جس نے اس پر مظالم کیے تھے اب بھی اسی علاقے میں مقیم تھا۔ اسی نام کے ساتھ اسے وہ سب مظالم یاد آگئے جن سے اس کا خاندان گزرا تھا۔ 32 برس قبل کے واقعات اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ اب وہ کمسن بچہ نہیں تھا۔ وہ اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ اس نے ایک مانوس ارادے کے ساتھ اپنے ایک پیغام رساں کو بصالت جنگ کی چھاؤنی روانہ کیا اور اس شرط پر تین لاکھ فراہم کرنے کی پیشکش کی کہ اسے سرا کے نواب کے خطاب سے نوازا جائے گا۔

بصالت جنگ نے یہ شرط منظور کر لی۔

سندیں تیار ہوئیں اور حیدرعلی ''سرا'' کا نواب بن گیا۔

وہ اپنی فوجیں لے کر بصالت جنگ کی خدمت میں پیش ہوگیا اور ایک ہی جھٹکے میں ہوسکوٹ کا قلعہ فتح کر لیا۔

ہوسکوٹ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد حیدرعلی نے دودبالاپور کی جانب پیش قدمی کی جہاں اس کا پرانا دشمن عباس قلی مقیم تھا۔

عباس قلی خاں نے جو سنا کہ حیدرعلی آرہا ہے تو اس نے حرم کی مستورات اور قیمتی اسباب کے ساتھ ارکاٹ کی جانب راہ فرار اختیار کی۔ اس کے فرار کی خبر سن کر ''سرا'' کے محاصرے کے لیے پیش قدمی کی۔ محصور فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی۔

حیدرعلی اب ''سرا'' کا مطلق العنان حاکم بن چکا تھا۔ اس نے بتدریج ''سرا'' کے ماتحت علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

حیدرعلی ابھی ''سرا'' میں مقیم تھا کہ اس کے سامنے ایک ہندو نوجوان چینن بسویا کو پیش کیا گیا۔ یہ نوجوان حیدرعلی سے ملنے کا مشتاق تھا۔

یہ خوبرو نوجوان حیدرعلی کے سامنے آیا تو حیدرعلی نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

''میں راجا بدنور (یا یدنور) کا متبنیٰ ہوں۔ راجا کے مرنے پر اس کی رانی نے اپنے برہمن وزیر سے ناجائز تعلقات پیدا کر لیے ہیں۔ ان دونوں نے مل کر مجھے میرے حق سے محروم کر دیا اور خود حکومت پر قابض ہوگئے۔ اگر آپ مجھے میری ریاست واپس دلا دیں تو گراں قدر نذرانہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا اور ہمیشہ آپ کا باجگزار ہوں گا۔''

''نوجوان مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہارا حق تمہیں دلواؤں گا لیکن شرط یہ ہے کہ بدنور کی فتح تک تمہیں میرے پاس رہنا ہوگا تاکہ بدنور کی فتح کے بعد تمہارے دعوے کی تصدیق ہوسکے۔''

''میں آپ کی حراست میں رہنے کو تیار ہوں۔ جب آپ بدنور فتح کر لیں گے تو وہاں کا بچہ بچہ میری گواہی دے گا۔ اگر عیاش رانی آپ کے ہاتھ لگ گئی تو وہ خود قبول کر لے گی کہ میں کون ہوں۔''

بدنور کا قلعہ زیادہ دور نہیں صرف پچاس میل کی مسافت پر تھا لیکن اس قلعے تک پہنچنے کے لیے گھنے جنگلات سے گزرنا پڑتا تھا۔

حیدرعلی نے نوجوان کو ہمراہ لے کر فوج کو کوچ کا حکم دیا۔

وہ جنگل میں اس احتیاط سے داخل ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ ابھی اس نے چند میل کی مسافت طے کی تھی کہ ریاست کا اولین قلعہ ''سمپوگا'' دکھائی دیا۔ حیدرعلی نے بہ آسانی قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس قلعے سے حیدرعلی کو قیمتی اشیا کے علاوہ ایک لاکھ پگوڈا کا خزانہ بھی ہاتھ لگا۔ اس مقام پر ریاست بدنور کی رانی کی جانب سے ایک سفیر حیدرعلی سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا اور چار لاکھ پگوڈا حیدرعلی کے حضور بہ طور نذرانہ پیش کرنے کی پیشکش کی لیکن حیدرعلی نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور آگے بڑھتا رہا اور راستے کے قلعوں پر قبضہ کرتا ہوا بدنور پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ رہنمائی کے لیے نوجوان چینن بسویا ساتھ تھا۔

حیدرعلی نے رانی سے کہلوایا کہ وہ قلعہ اس کے حوالے کر دے لیکن وہ جنگ کرنے کو تیار تھی اور جنگ ہوئی لیکن انجام یہ ہوا کہ حیدر کا ایک جانباز دستہ فصیل پر چڑھا اور قلعہ فتح ہوگیا۔ رانی کو گرفتار کر کے حیدرعلی کے پاس لایا گیا۔

اس موقعے پر ایک مغربی مورخ میچاند (MICHAND) نے یہ کہانی بیان کی ہے۔

''نوجوان چینن بسویا جس کی عمر صرف سولہ سال تھی اور جو اپنی جوانی میں حسن و عشق کے فریب کا مارا تھا۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا تھا وہ بھی بدنور میں تھی چنانچہ بدنور کی مکمل فتح کے بعد اسے بھی حیدرعلی کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ حیدرعلی اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس

نے نوجوان سے وہ لڑکی طلب کی۔

''میں نے تجھے تیری ریاست دلوائی ہے اس کی قیمت کے طور پر یہ لڑکی مجھے دیدے۔''

چین بسویا یہ سنتے ہی مشتعل ہوگیا۔ ''جب میری محبوبہ ہی مجھے نہ ملے تو تاج وتخت بیکار ہے۔ آپ یہ سلطنت اپنے پاس رکھیں، میں فقیر بن کر رہ لوں گا لیکن محبوبہ نہیں گنوا سکتا۔''

حیدر علی برافروختہ ہوگیا اور اس نے زبردستی نوجوان کی محبوبہ کو اس سے چھین لیا۔''

اس کہانی پر مکمل اعتماد نہیں کیا جاسکتا لیکن اس نے چین بسویا سے بے وفائی ضرور کی۔ بدنور کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سونے کی سرزمین ہے۔ حیدر علی اسے ایک بار دیکھنے کے بعد چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ حیدر علی ایسی سرزمین سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا خصوصاً ایسی حالت میں کہ ریاست میسور زبردست مالی بحران کا شکار تھی۔

حیدر علی نے چین بسویا، بیوہ رانی اور اس کے بھائی کو دواگیری روانہ کردیا اور اس طرح اپنے اقتدار کا اعلان کیا جیسا اس نے اپنی سلطنت کے کسی حصے میں نہیں کیا تھا۔ بدنور کا نام حیدر نگر رکھا گیا اور وہ اس کی راجدھانی قرار پایا۔ یہاں اس نے پہلی بار سکے کے اجرا کے حق کو استعمال کیا اور اپنا سب سے پہلا سکہ ''بہادری پگوڈا'' کے نام سے جاری کیا۔

بدنور کے لوگوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ چین بسویا کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لہٰذا کئی سازشوں نے جنم لیا۔ حیدر علی نے ان سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تقریباً ایک ہزار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ان سازشوں سے نمٹنے کے بعد اردگرد کے بیشتر علاقے فتح کرلیے۔

ان علاقوں کی فتح کے بعد حیدر علی نے سرنگاپٹم کا رخ کیا۔

کئی برس کے وقفے کے دوران مادھوراؤ مرہٹہ اپنے باپ بالاجی کی جگہ مرہٹوں کا پیشوا بن چکا تھا اور مرہٹوں نے اپنی پیش قدمی کا آغاز کردیا تھا۔

مرہٹے مسلسل پیش قدمی کر رہے تھے اور خطے میں تباہی مچائے ہوئے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے حیدر علی نے فوجی دستے روانہ کیے اور پھر خود بھی روانہ ہوگیا۔

ایک مقام راٹ ہالی پر فریقین کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی لیکن یہ ایک فریب تھا، حیدر علی اس کا شکار ہوگیا۔ دشمن کی تعداد چار ہزار سے کسی طور بھی زیادہ نہیں تھی اور وہ بھی جلد بھاگ کھڑی ہوئی۔ حیدر علی نے تعاقب شروع کردیا۔ مرہٹے بھاگتے رہے حیدر علی ان کے پیچھے تھا۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب اس نے خود کو پچاس ہزار مرہٹہ فوج کے سامنے پایا۔ بھاگنے والے مرہٹے اسے اپنی اصل فوج تک لے آئے تھے۔ اب نہ آگے بڑھنے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی۔ اس نے ایک خشک ندی کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ دونوں طرف سے توپوں کی گولہ باری کے تبادلے کا آغاز ہوگیا۔

غروب آفتاب کے وقت مرہٹوں کی گولہ باری ختم ہوئی تو حیدر علی کی فوج کی ایک ہزار سپاہ ہلاک ہوچکی تھی۔

دوسرے دن پھر گولہ باری شروع ہوگئی۔ اسی گولہ باری کے دوران مادھوراؤ نے حیدر علی کو خط روانہ کیا۔

''ہم آپ سے دو دو ہاتھ کرنے آئے ہیں لہٰذا آپ ہمارے ساتھ دو دو ہاتھ کرلیں ورنہ ہم یہ تصور کریں گے کہ حیدر علی ایک سپاہی ہرگز نہیں ہے۔''

اب حیدر علی کا توقف کرنا خود کو بزدل کہلوانے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس نے پیش قدمی کی اور کھلے میدان میں مرہٹوں سے جا بھڑا۔ اس معرکہ آرائی میں مرہٹوں کا پلہ بھاری رہا۔ حیدر علی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ حیدر علی بھیس بدل کر اپنے خیمے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

مرہٹوں نے پڑاؤ اٹھایا اور بدنور کی جانب پیش قدمی شروع کردی۔ حیدر علی نے بھی بدنور کا رخ کیا اور شکار پور کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اس مقام پر بھی مرہٹوں نے معرکہ آرائی کی اور حیدر علی مسلسل پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوا اور صلح پر بھی۔

حیدر علی کو بہ طور تاوان جنگ 8 لاکھ ادا کرنے پڑے۔

مادھوراؤ اپنے دارالحکومت پونا چلا گیا۔

یہ خطرہ ٹل ضرور گیا تھا لیکن حیدر علی جانتا تھا کہ مرہٹے جارحانہ عزائم رکھتے ہیں اور وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی ضرور کوشش کریں گے۔

اگر حیدر علی چاہتا تو مرہٹوں سے نمٹنے کے لیے نظام یا انگریزوں سے معاہدہ کرسکتا تھا لیکن اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔

اس نے انگریزوں کو کبھی دوست نہیں بنایا۔ اسی لیے مدراس کے گورنر نے لکھا تھا۔

''یا تو ہم حیدر کو اپنا دوست بنالیں یا اس کو ایک دشمن سمجھ کر تباہ کردیں لیکن اسے دوست بنانے کے سلسلے میں اب تک تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئی ہیں۔''

حیدر علی تو انگریزوں سے معاہدہ نہ کرسکا لیکن نظام علی (حیدرآباد) نے انگریزوں سے مدد مانگ لی۔ پیشوا نے نظام علی کے ساتھ اتحاد کرلیا تھا۔ نظام علی نے مسلمان ہوتے ہوئے ایک مسلمان (حیدر علی) کے خلاف مرہٹوں سے نہ صرف اتحاد کیا بلکہ برطانوی راج کو بھی مطلع کیا کہ ہمیں حیدر علی کے خلاف برطانوی فوج کی مدد درکار ہے۔ برطانوی فوج ایک ماہ کے اندر اندر مدد کو پہنچ جائے۔

مرہٹے اتنی جلدی میں تھے کہ انہوں نے اپنے حلیف کا انتظار بھی نہیں کیا اور دریائے کرشنا عبور کرلیا۔ مرہٹوں نے سرا کے قلعے کا رخ کیا۔ حیدر علی کا برادر نسبتی یہاں مقیم تھا۔ اسے مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی۔ دواگیری کا وہ قلعہ جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا مرہٹوں کے تسلط میں آگیا۔ دیگر کئی علاقے بھی ہاتھ سے چلے گئے۔

یہ فتوحات اپنی جگہ لیکن حیدر علی یہ بھی سن رہا تھا کہ نظام علی بس پہنچنے ہی والا ہے لہٰذا اسے صلح کی طرف راغب ہونا پڑا۔

مرہٹہ سردار بھی اس کوشش میں تھا کہ نظام کی آمد سے قبل صلح ہوجائے ورنہ وہ بھی اپنا حصہ طلب کرے گا۔

حیدر علی کو 31 لاکھ بہ طور تاوان ادا کرنے کا وعدہ کرنا پڑا۔ جو علاقے مرہٹوں نے فتح کیے تھے انہی کے پاس رہے۔

نظام کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

اس شکست کے بعد اس نے نظام کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تاکہ انگریزوں کا مقابلہ کرسکے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگیا اور نظام نے اس کے ساتھ انگریزوں سے لڑنے کا معاہدہ کرلیا۔ یہ ایک نئی صورت حال تھی جس کا مقابلہ انگریزوں کو کرنا تھا۔

حیدر علی اور نظام کی افواج ارکاٹ کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں۔

انگریزی افواج کا کمانڈر کرنل اسمتھ تھا۔

چوہے بلی کا کھیل چلتا رہا۔ کہیں حیدر اور نظام کی فوجوں کو فتح حاصل ہوئی کہیں انگریز فتح یاب ہوئے۔ جو فوج شکست یاب ہوتی، کسی دوسری جانب پیش قدمی کرلیتی۔ یہ کھیل ایک سال تک جاری رہا۔ اس موقعے پر نظام نے حیدر علی سے بے وفائی کی۔ اس نے خفیہ طور پر انگریزوں کو صلح کی پیشکش کی۔ مدراس حکومت نے نظام کو مجبور کیا کہ وہ حیدر علی کا ساتھ چھوڑ کر کرنل اسمتھ کے ساتھ مل جائے تو صلح ہوسکتی ہے۔

حیدر علی اور نظام اتحادی تھے۔ صلح ہوتی تو دونوں سے ہوتی۔ نظام کو یہ شرط مسترد کردینی چاہیے تھی لیکن وہ حیدر علی کو چھوڑ کر یہ شرط ماننے پر تیار ہوگیا۔

مدراس حکومت اور نظام علی کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

حیدر اب انگریزوں سے لڑنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ اس کو جزیرہ نما کے مشرقی حصے سے نکل کر مغربی حصے مالابار میں انگریزوں کے حملے روکنے کے لیے جانا پڑا۔

مشرق میں کرنل اسمتھ کو جارحانہ حملے کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

حیدر علی بنگلور پہنچ گیا۔ جاتے جاتے وہ تین ہزار گھڑ سوار فوج کرنل اسمتھ سے برسرپیکار رہنے کے لیے چھوڑ گیا تھا جو ایک ڈویژن انگریزی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم تھی۔ اس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا تھا کہ انگریزی فوج کو بنگلور تک پہنچنے میں رکاوٹ ڈالی جائے۔

حکومت بمبئی نے مالابار ساحل پر اپنی فوج روانہ کی تاکہ اس ساحل پر واقع حیدر علی کے مقبوضات تسخیر کیے جاسکیں۔

انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ بنگلور کے محاصرے سے حیدر علی کو جنوب کی جانب سے رسد کی فراہمی کا سلسلہ کاٹ دیا جائے۔

ادھر کرنل اسمتھ کو یہ حکم ملا کر انگریز فوج میسور میں داخل ہوجائے۔ اس حکمت عملی کے مطابق میسوری علاقوں پر حملہ آور ہونا اور بنگلور کو محاصرے میں لینا تھا۔

کرنل وڈ ''ڈنڈی گل'' پر قبضہ کرچکا تھا اور اب اسے مطلع کیا گیا تھا کہ وہ جلد از جلد مرکزی فوج کے ساتھ آن ملے۔

گوئی کا مرہٹہ سردار مرار راؤ انگریزی افواج سے ملنے کے لیے چلا۔ اس کے پاس تین ہزار گھڑسوار اور 2 ہزار پیادہ سپاہ تھی۔ چند توپیں بھی ہمراہ لایا تھا۔ وہ انگریزی فوج سے نصف میل دور خیمہ زن تھا کہ نصف شب کے وقت حیدر علی اس پر حملہ آور ہوگیا لیکن ایک اتفاقی حادثے نے اسے ناکامی میں بدل دیا۔ حیدر علی کا گھوڑا ایک خیمے سے الجھ کر گر پڑا۔ چاروں طرف سے حملہ ہوگیا۔ حیدر علی کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ حیدر علی بھی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔

حیدر علی کو کسی اور مہم کی طرف جانے کے لیے تقریباً ایک ماہ انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ شب خون کے دوران زخمی ہوگیا تھا۔

اسی دوران انگریزی افواج مختلف علاقوں پر قبضے

کرتی رہیں اور اسے معلوم ہوا کہ کرنل وڈ اپنی مرکزی فوج سے ملنے کے لیے پیش قدمی کر چکا ہے۔ وہ ایک بڑی فوج لے کر کرنل وڈ کو روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ کرنل اسمتھ کو معلوم ہوا تو وہ ''ہوسکوٹ'' حیدر علی کے تعاقب کے لیے نکلا لیکن وہ حیدر علی کا مقابلہ نہ کرسکا اور اس بری طرح پسپا ہوا کہ اپنا تمام ساز وسامان حتیٰ کہ خیمے تک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ اس دوران کرنل وڈ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی مرکزی فوج سے جا ملے۔

حیدر علی کی اس مہم جوئی کا مقصد اپنی فوج کے لیے نئی بھرتی کا اہتمام کرنے کے علاوہ اپنے ماتحت سرداروں پر اپنا رعب قائم کرنا تھا جو مسلسل شکستوں کی وجہ سے بددل ہوگئے تھے۔

یہ رعب اس کے سرداروں پر تو طاری ہونا ہی تھا، انگریزوں پر بھی طاری ہوا۔ مدراس پریذیڈینسی نے کرنل اسمتھ کی خراب کارکردگی کو جواز بنا کر واپس بلالیا۔ اب اعلیٰ قیادت کرنل وڈ کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ انگریز فوج پیش قدمی کرنے اور واپسی اختیار کرنے تک محدود رہی۔

کرنل اسمتھ کی واپسی نے حیدر علی کی فوج کے حوصلے مزید بڑھا دیے۔

حیدر علی نے اچانک کرنل وڈ پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوج کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ کرنل کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

کرنل وڈ نے ابھی خیمے نصب ہی کیے تھے اور فوجی ترتیب درست کرنے میں مصروف تھا کہ حیدر علی کی فوج گولے برسانے لگی۔ یہ سلسلہ دوپہر سے شام تک جاری رہا۔ انگریز فوج کے دوسو سپاہی ہلاک ہوگئے۔ حیدر علی کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر واپس لوٹ آیا۔

اس حملے نے انگریزوں کو ایسی بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا کہ مدراس کی حکومت نے کرنل وڈ کو بھی واپس بلا لیا۔ وجہ؟ وہی خراب کارکردگی۔

کرنل اسمتھ پہلے ہی واپس بلایا جاچکا تھا۔ کرنل وڈ کی واپسی کے بعد فوجی قیادت کرنل لینگ کے سپرد کر دی گئی۔ اس نے کمان سنبھالتے ہی اپنی فوجوں کو وینکٹ گری میں مقیم کیا۔

اب حیدر علی جنوب کی طرف یلغار کرنے کے لیے آزاد تھا۔

اس نے تن تنہا انگریزوں کو اس حال پر پہنچا دیا، یہ اس کی بہادری کا بیّن ثبوت تھا۔

اس نے حسب توقع جنوب کا رخ کیا۔ دھرم پوری پر دوبارہ قبضہ جمانے کے بعد ان دیگر علاقہ جات کی جانب پیش قدمی کی جو کرنل وڈ نے فتح کر لیے تھے۔

اس کے باوجود کہ انگریزی فوج تعاقب میں تھی، اس نے اتنی تیزی سے راستے میں پڑنے والے تمام تر قلعے فتح کر لیے کہ انگریزی دستے اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

ڈنڈی گل پر بھی اس نے دوبارہ تسلط قائم کر لیا۔

انگریزوں کی تمام محنت پر پانی پھر گیا۔ اس نے جو علاقے ایک ہاتھ سے گنوائے تھے دوسرے ہاتھ سے چھین لیے۔ انگریز تمام مقبوضہ علاقوں سے محروم ہوگئے۔

اب حیدر نے کرناٹک کی جانب کوچ کیا۔

انگریز حکومت پھر بوکھلاہٹ کا شکار نظر آئی۔ انگریز فوج کی کمان دوبارہ کرنل اسمتھ کے حوالے کر دی گئی، بار بار کی یہ تبدیلیاں فائدے کے بجائے نقصان ہی پہنچا رہی تھیں۔

کرنل اسمتھ نے کمان سنبھالتے ہی حیدر علی کا تعاقب کیا جو پیش قدمی کرتا ہوا ''ترناملی'' تک پہنچ گیا تھا لیکن جب تک اسمتھ پہنچتا حیدر علی ترکالور میں تھا۔

انگریز اتنے زچ ہوگئے تھے کہ مذاکرات پر مجبور ہوگئے۔ انگریز قیادت نے تجویز پیش کی کہ چالیس دن کے لیے جنگ بندی کی جائے۔ حیدر علی اس وقت کسی دباؤ میں نہیں تھا۔ اسے برابر فتوحات مل رہی تھیں لہٰذا یہ مذاکرات ناکامی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ حیدر علی زیادہ سے زیادہ سات دن کے لیے جنگ بندی پر تیار تھا۔

دونوں افواج پھر کوچ پر کوچ کرتی رہیں۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف۔

حیدر علی چاہتا تھا کہ تعاقب سے بچ کر میسور کی جانب جانے والی شاہراہ تک رسائی حاصل کر لے۔ کرنل اسمتھ بھی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

یہ آنکھ مچولی جاری رہی حتیٰ کہ انگریز ایک مرتبہ پھر صلح کے لیے رجوع کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس معاہدے کی رو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے گئے۔ یہ شرط بھی طے پائی کہ معاہدے کے تحت فریقین ایک دوسرے پر کسی دشمن کے حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہوں گے۔

حیدر علی انگریزوں کے ساتھ دفاعی معاہدے میں شامل ہو چکا تھا لہٰذا حیدر علی کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے وہ چند سردار بھی واپس آگئے تھے جو برے

وقتوں میں مجبوراً مرہٹوں سے مل گئے تھے۔

اب اس نے مرہٹوں سے معرکہ آرائیوں کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ مرہٹے تو یہ چاہتے تھے کہ سرنگا پٹم پہنچ جائیں لیکن حیدر علی کمال ہوشیاری سے انہیں مرہٹہ علاقوں میں لے کر گھومتا رہا اور ناکوں چنے چبانے پر مجبور کرتا رہا۔ پیشوا اس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے سے محروم ہی رہا۔ یہاں تک کہ بیمار پڑ گیا۔ اب اس کا جانشین ترمیک راؤ حیدر علی کے مقابل تھا۔

حیدر علی بھی اپنے قلعوں کو خیرباد کہہ کر باہر نکل پڑا۔

معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مرہٹوں کے نزدیک روئے زمین پر حیدر علی سے بڑا ان کا کوئی دشمن نہیں۔ ایک موقع تو ایسا آیا کہ مرہٹہ فوج کا ایک حصہ کرشنا راؤ کی قیادت میں سرنگا پٹم پہنچنے ہی والا تھا۔ میسوری فوج کو شکست ہوئی اور حیدر علی محض چند سو گھڑ سوار دستوں کے ہمراہ سرنگا پٹم پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

حیدر علی کو شکست ہو چکی تھی لیکن مرہٹے اس فتح کو فیصلہ کن نہ بنا سکے۔ وہ مال غنیمت کی تقسیم میں لگ گئے اور حیدر علی کو سرنگا پٹم پہنچ کر دفاع کا موقع مل گیا۔ اگر مرہٹے پہلے پہنچ گئے ہوتے تو سرنگا پٹم میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں تھا۔

سرنگا پٹم حیدر علی کا دارالخلافہ تھا۔

مرہٹوں نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا لیکن حیدر علی اردگرد کے علاقے کو کچھ اس طرح نیست و نابود کر چکا تھا کہ وہ قحط کا شکار ہو سکتے تھے۔ دوسری جانب کاویری میں سیلاب کی بھی آمد آمد تھی۔ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک سرنگا پٹم کا محاصرہ جاری رکھنے کے بعد بالآخر ترمیک راؤ نے محاصرہ اٹھا لیا اور سرنگا پٹم سے دس میل دور پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا۔ یہاں ترمیک راؤ کو یہ روح فرسا خبر ملی کہ حیدر علی کا بیٹا ٹیپو اپنی فوج کے ہمراہ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر ملی کہ حیدر علی کی کثیر تعداد فوج نے نرائن گڑھ کو..... اپنے محاصرے میں لے لیا ہے۔ یہ متضاد خبریں اس پر بجلی بن کر گریں۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا اور بالاپور پہنچ گیا۔

حیدر علی کے پاس اب صرف بنگلور، سرنگا پٹم اور بدنور رہ گیا تھا۔ ترمیک راؤ بدنور کی فتح اور تمام علاقے کی پامالی کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن پیشوا علیل تھا۔ اس نے ترمیک راؤ کو لکھا کہ جلد از جلد مہم ختم کر دے۔ ترمیک راؤ کو اس حکم کے سامنے مجبور ہونا پڑا اور اسے حیدر علی سے مذاکرات کرنے پڑے۔

اس معاہدے کے مطابق مرہٹے چند علاقوں کو چھوڑ کر باقی علاقے واپس کرنے کو تیار ہو گئے لیکن حیدر علی کو ساٹھ لاکھ کی ادائی کرنی پڑی۔

اس معاہدے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان معاہدہ ہو گیا اور مرہٹہ افواج نے گجرات سے جنوب کی جانب پیش قدمی کا آغاز کر دیا۔ اسی دوران نظام نے بھی مرہٹوں سے اتحاد کر لیا اور یہ طے پایا کہ مفتوحہ علاقے، پونا حکومت اور نظام کے درمیان مساوی تقسیم ہوں گے۔

ایک مرتبہ پھر معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حیدر علی نے مرہٹوں کے کئی علاقے فتح کر لیے۔ اس موقع پر قدرت نے حیدر علی کی مدد کی۔ پونا میں سازشیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور مرہٹوں کو ان سازشوں کے خاتمے کے لیے واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔

حیدر علی کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے بتدریج تنگ بھدرا کے تمام علاقے اپنے قبضے میں کر لیے۔ تمام علاقے حیدر علی کی اطاعت قبول کر کے اس کے باجگزار بن گئے۔

اب حیدر علی کی فتوحات کی داستان مکمل ہو گئی تھی۔

ان فتوحات کے لیے حیدر علی کو اپنا دیرینہ خواب پورا کرنا تھا اور یہ خواب تھا مالابار کے ساحل کی فتح۔

بدنور اور سندا کی فتح کے بعد کم از کم چار بندرگاہیں اس کے تسلط میں آ چکی تھیں لیکن یہ اس وقت تک بے کار تھیں جب تک اس کے پاس بحری بیڑا نہ ہو۔ بحری بیڑے کے بغیر انگریزوں اور پرتگالیوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا اس نے جنگی جہاز تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

جب بحری بیڑا تیار ہو گیا تو وہ منگلور پہنچا۔ چار یوم کے قیام کے بعد اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا۔ پیدل فوج کے ساتھ ساتھ بحری بیڑا بھی پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس بحری بیڑے میں بحری جہاز، بادبانی جہاز، جنگی کشتیاں، دخانی کشتیاں اور دریا پار رسد لے جانے والی لاتعداد چھوٹی کشتیاں شامل تھیں۔

یہ مہم اس کی پہلی مہمات سے بالکل مختلف تھی۔ ایسی مہمات کا اس کی فوج کو پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انجام کیا ہو۔ سب سے زیادہ اس علاقے کی جغرافیائی حیثیت پریشان کن تھی۔ منگلور سے جو راستہ مالابار تک جاتا تھا۔ وہ دو میل تک تو ریت کی ایک پٹی تھی لیکن اس کے بعد راستہ بالکل تبدیل ہو جاتا تھا اور پہاڑ

شروع ہو جاتا تھا۔ آغاز میں پہاڑوں کی بلندی کم تھی اور پھر پہاڑوں کی اونچائی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ میدانوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں جو کسی بھی حادثے کے لیے تیار تھیں۔ راستے اتنے ڈھلواں تھے کہ چلنا مشکل تھا۔

حیدر علی غارت گری، لوٹ مار، آتش زدگی کرتا ہوا پیش قدمی کرتا رہا۔ ایک دن نائروں نے (مقامی باشندے) مدافعت کی لیکن توپ خانے کی گولہ باری کامیاب رہی اور نائر بھاگ نکلے۔ چھوٹی کشتیوں نے سامان دوسری طرف پہنچا دیا۔ نائروں نے چرکل کا قلعہ چھوڑ دیا جس پر حیدر علی نے فوراً قبضہ کر لیا۔ چرکل سے میسوری فوج نے کویئم پر قبضہ کرنے کے لیے کوچ کیا۔ اس کے لیے انہیں ایک دریا عبور کرنا تھا۔ دریا کے کنارے کافی بلند تھے اس لیے توپ خانے اور گھوڑوں کے لیے کافی دقت کا سامنا تھا۔ اس کے مقابلے میں نائروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ حیدر نے تمام قسم کی 26 توپوں سے گولہ باری شروع کر دی۔ نائر پسپا ہو گئے۔ ایک ہزار مارے گئے کچھ جنگلوں میں چھپ گئے۔

نائر ہر جگہ مزاحمت کر رہے تھے اور ہر جگہ پسپا ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ حیدر علی کالی کٹ پہنچ گیا۔ یہاں کا حاکم زمورن تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جنگ کے بعد مطیع ہو گیا لیکن اس کے بھتیجے اور جانشین نے مزاحمت جاری رکھی۔

زمورن اس مزاحمت کو نہ روک سکا اور خراج ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس نے غیرت کے مارے اپنے گھر کو آگ لگا دی اور خود بھی اس میں کود کر جل مرا۔

حیدر علی نے اس کے جانشین کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور کالی کٹ کا انتظام سنبھال لیا۔ جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کیں تاکہ کوئی بغاوت رونما نہ ہو۔ اس نے مالابار کی شہری حکومت کا سربراہ مقرر کیا اور خود کوئمبٹور کوٹ آیا۔

اسے کوئمبٹور آئے ایک مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ مالابار کے نائروں نے بغاوت کر دی۔ نائر ایک جنگجو قوم تھی۔ وہ کسی طرح حیدر علی کا تسلط تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔

برسات کا موسم عروج پر تھا لیکن اس بغاوت کو کچلنا بھی ضروری تھا۔ حیدر علی نے راستوں کی دشواری کی پروا نہیں کی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ ننگے گھوڑوں پر سوار ہوں۔ اپنے ساتھ کمبلوں کے سوا کوئی سامان نہ رکھیں، ضروری اسلحہ بھی ساتھ نہ لیں۔ اسلحہ اور سامان رسد ہاتھیوں پر لدا ہوا تھا۔

مالابار میں حیدر علی کی جو فوج تھی اسے نائروں نے گھیر رکھا تھا۔ اگر حیدر علی ذرا بھی سستی کا مظاہرہ کرتا تو یہ تمام فوج لقمۂ اجل بن چکی ہوتی۔

حیدر علی کے پہنچتے ہی نائروں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ اس علاقے میں چونکہ گھوڑے نہیں ہوتے تھے اس لیے نائر نہ تو خود گھوڑوں پر سوار ہو سکتے تھے، نہ گھڑ سواروں سے مقابلہ کر سکتے تھے لہٰذا وہ ہر جگہ حیدری فوج کے گھڑ سواروں کے سامنے عاجز ہو جاتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ ایک گھڑ سوار ایک سو نائروں کے لیے کافی تھا۔

نائر بھاگ کر جنگلوں میں چھپ گئے تھے۔ حیدر علی کی فوج جنگلات میں بکھر گئی اور چن چن کر نائروں کا صفایا شروع کر دیا حتیٰ کہ ان کی عورتیں اور بچے بھی ہلاکت سے نہ بچ سکے۔

حیدر علی تقریباً ایک ماہ تک مالابار میں مقیم رہا اور پھر شہری اور فوجی نظام سرداروں کے سپرد کر کے مالابار کو خیرباد کہہ دیا۔

مالابار پر اس کا تسلط ہو چکا تھا۔ اب اس کے دل میں یہ خواہش کروٹیں بدل رہی تھی کہ کوچین اور ٹراونکور پر بھی قبضہ کر لے۔

اس خواہش کے پیدا ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ ٹراونکور کے راجا مرتنداورما نے کوچل کے مقام پر ولندیزیوں کو شکست دے کر ان کی طاقت کو کم کر دیا تھا لیکن کوچین اور کرنگانور میں وہ اب بھی بڑی طاقت سمجھے جاتے تھے۔ ان علاقوں میں ان کے جہاز اور قلعے موجود تھے۔ ولندیزی یہ چاہتے تھے کہ ٹراونکور کے راجا سے ان کے دوستانہ مراسم ہو جائیں کیونکہ انہوں نے ٹراونکور میں سیاہ مرچ کی خریداری کے لیے بھاری رقوم لگا رکھی تھیں۔ انہوں نے حیدر علی کو ٹراونکور پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر حیدر علی سے مذاکرات کیے۔ ان مذاکرات میں ولندیزیوں نے حیدر علی سے یہ طے کیا کہ وہ کوچین کے راجا کو ہراساں نہ کرے کیونکہ کوچین سے کمپنی کا مفاد وابستہ ہے۔ یہ ضمانت بھی لی کہ اگر حیدر علی ٹراونکور پر اپنا تسلط قائم کرتا ہے تو ان کی رقم کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

ابھی حیدر ٹراونکور پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے نظام اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ طے پانے کا علم ہوا۔ یہ خبر بھی آئی کہ مادھوراؤ میسور پر حملہ آور ہوا ہے۔ اسے اپنی توجہ اس طرف مبذول کرنی پڑی۔ وہ دور دراز مقام پر تھا۔ اس کا بیٹا اور دوسرے سردار ان مہمات

سے نمٹ رہے تھے لیکن حیدر علی اس وقت خود کو کسی جنگ میں الجھانا نہیں چاہتا تھا تاکہ ضرورت پڑے تو وہ یہاں سے بہ آسانی کوچ کر سکے۔ اس کے باوجود اس نے ٹراونکور کے سات گاؤں تاخت وتاراج کر ڈالے۔

انہی دنوں یہ خبر آئی کہ حیدر کو مشغول دیکھ کر نائروں میں آزادی کے جذبے نے سر اٹھایا ہے۔ انہوں نے حیدر کے کئی قلعے چھین لیے۔ دوسری طرف یہ خبر آئی کہ انگریزوں نے منگلور کی جانب کوچ کر دیا ہے۔ ان خبروں نے اسے مالابار کو نظر انداز کرنے پر اکسایا۔ اس نے سوچا موقع ملتے ہی وہ مالابار کو دوبارہ فتح کر لے گا۔ اس وقت تو اس سے جان چھڑانی چاہیے۔ اس نے یہاں کے سرداروں کو مطلع کیا کہ میں مالابار کو چھوڑ دوں گا اگر مجھے اخراجات ادا کر دیے جائیں جو اس سلسلے میں ہوئے ہیں۔ مالابار کے سرداروں نے یہ رقم ادا کر دی۔

حیدر نے بڑی ہوشیاری سے اپنی فوج کو صحیح سلامت مالابار کے بکھیڑے سے نکال لیا۔

30 اگست 1773ء کو نرائن راؤ کے قتل اور مرہٹہ حملے کے خاتمے کے بعد حیدر نے مالابار کو دوبارہ فتح کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

حیدر کے دو افسر آگے بڑھے اور کالی کٹ پر حملہ آور ہوئے جس نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ زمورن اندرون ملک کسی پہاڑ میں روپوش ہو گیا۔

کرنگانور اور کوچین کے حکمرانوں نے بہ عجلت حیدر علی سے صلح کر لی اور کسی بڑی تباہی سے بچ گئے۔

حیدر علی نے مالابار میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہاں پرتگالیوں کی تجارت خوب پنپ رہی تھی۔ حیدر نے ان سے اچھے تعلقات استوار کیے تاکہ انگریزوں اور پرتگالیوں کا گٹھ جوڑ نہ ہو سکے لیکن جن دنوں انگریزوں نے منگلور پر حملہ کیا تو پرتگالیوں نے حیدر علی کے احسانات کا یہ بدلہ دیا کہ انگریزوں سے ساز باز کر لی۔ اس ساز باز کے نتیجے میں انگریز بہ آسانی علاقے میں آن وارد ہوئے چنانچہ حیدر علی نے مالابار پر دوبارہ قابض ہوتے ہی پرتگالیوں کو تمام مراعات سے محروم کر دیا۔

⊕⊕⊕

میسور کی پہلی لڑائی کے اختتام کے وقت انگریزوں کے ساتھ حیدر علی کا یہ معاہدہ ہوا تھا کہ دشمن کو مار بھگانے میں دونوں فریق ایک دوسرے کی مدد کریں گے لیکن جب مادھورائے نے **1770ء** میں حیدر علی کے خلاف میدان جنگ گرم کیا اور حیدر علی نے اپنا سفیر انگریزوں کی جانب روانہ کیا اور معاہدہ یاد دلایا تو انہوں نے آنکھیں پھیر لیں اور غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سخت قسم کی بدعہدی تھی۔ مادھورائے سے اسے اکیلے لڑنا پڑا۔ یہ طویل جنگ تباہ کن مراحل کے بعد بالآخر صلح کے معاہدے پر ختم ہوئی۔

اس واقعے کے بعد حیدر علی کا انگریزوں سے بدظن ہونا لازمی تھا۔ اس نے مجبور ہو کر اور بار بار کی کوششوں میں ناکامی کے بعد فرانسیسیوں کی جانب رجوع کیا۔

انگریز وقت پڑنے پر حیدر علی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تھے لیکن وقت گزرنے کے بعد یہ معاہدے پھر تعطل کا شکار ہو جاتے تھے۔ اسی دھوپ چھاؤں میں وہ مرہٹوں سے جنگیں کرتا رہا۔

ان بے در پے واقعات نے حیدر علی کو انگریزوں کی طرف سے مکمل طور پر بدظن کر دیا۔ اس نے اب کسی بھی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فورٹ سینٹ جارج حکومت کو صاف لفظوں میں لکھ دیا۔

''ڈنڈی گل سے لے کر کڈپہ تک آپ کی حدود میری حدود کے ساتھ ملحق ہیں اور آپ میرے علاقے میں مسلسل ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ نیل چری کا حکمران میرے علاقے میں شورش اور بدامنی پھیلاتا ہے اور میرے ماتحت نائروں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ان حالات میں جبکہ آپ بے اصولی کے مرتکب پائے جا رہے ہیں تب ہمارے درمیان کون سا معاہدہ برقرار ہے اور ہم میں سے کون معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے؟''

اب حیدر علی کی خواہش تھی کہ وہ انگریزوں پر کاری ضرب لگائے اور انہیں ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دے، اس خواہش کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ وہ مرہٹوں، نظام اور نواب ارکاٹ کے ساتھ اتحاد کر لے۔

خوش قسمتی سے مرہٹوں کو بھی صورت حال کا ادراک ہو گیا تھا لہٰذا ان کا جھکاؤ بھی حیدر علی کی طرف ہوا۔ مرہٹوں سے اس کا اتحاد ہو بھی گیا لیکن دونوں فریقوں کے الگ الگ مقاصد تھے اس لیے لگتا تھا کہ یہ دیر پا نہیں ہوگا۔

حیدر علی، مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ سرنگاپٹم سے نکلا اور بنگلور میں 22 یوم گزارنے کے بعد پیش قدمی جاری رکھی۔

انگریز اس کی پیش قدمی سے بے خبر نہیں تھے لیکن انہوں نے کسی قسم کی کوئی فوجی تیاری نہیں کی۔ ان کی فوجیں

ادھر اُدھر بکھری رہیں۔ پیش قدمی کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں لیکن برطانوی حکام کوئی موثر اقدام انجام نہیں دے رہے تھے۔ حیدر علی انگریزوں کی اس بے فکری پر حیرت زدہ تھا۔ حیدر علی کے الفاظ میں ''انگریزوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔''

وہ برطانوی علاقے میں حملے کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے مدراس اور ویلور کے علاوہ اردگرد کے ان علاقوں کو تاراج کر ڈالا جو فوجی نقل وحرکت کے لیے بروئے کار لائے جا سکتے تھے۔ اس نے کڈالور اور پنگا پٹم کے ساحلی علاقے سے آگے تک کے علاقے نذر آتش کر دیے۔

وہ طوفانی پیش قدمی کرتا ہوا ترنا ملی جا پہنچا۔ یہاں پہلی مرتبہ انگریزوں کی توپوں نے اس پر گولہ باری کی لیکن جوابی کارروائی کے بعد انگریز توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

وہ ایک مقام ''چٹ پٹ'' پہنچا تو اس کی مزاحمت ہوئی لیکن مقابلے میں صرف تین سو سپاہی تھے۔ یہ مقام اسی دن حیدر علی کے قبضے میں آ گیا۔ دیکھتے دیکھتے ڈولی گڑھ، چمبر گڑھ، ارنی وغیرہ کو سرنگوں کرتا ہوا وہ ارکاٹ شہر کے عین سامنے نمودار ہوا۔

اتنی تباہی کے بعد انگریزوں کی نقل وحرکت کا آغاز ہوا۔ معلوم ہوا کرنل مزد آ رہا ہے۔ پھر چاروں طرف سے فوجیں آنے لگیں۔ معرکہ آرائی ہوئی اور حیدر علی کی بہترین فوجی حکمت عملی نے اسے عظیم فتح سے ہمکنار کیا۔ انگریز فوج کی شکست حیدر علی کا ایک یادگار کارنامہ تھا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔

مدراس حکومت کی انتظامی مجلس کئی دن تک سوگ مناتی رہی۔

حیدر علی کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کرنل اسمتھ کو اس کے مقابل لایا گیا لیکن حیدر علی کسی جان لیوا طوفان کی طرح مدراس حکومت کو ہراساں کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایوانوں میں ہلچل مچی اور مدراس حکومت کے سفیر صلح کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

انگریزی علاقوں میں حیدر علی کے جھنڈے لہرا رہے تھے پھر وہ صلح کیوں کرتا۔ اس نے سفیروں سے سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور پیش قدمی جاری رکھی۔ کرنل اسمتھ اس کے تعاقب میں تھا لیکن جہاں جاتا تھا۔ میسوری فوج کی اڑائی ہوئی گرد کے سوا اسے کچھ نہ ملتا تھا۔ دراصل حیدر علی نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ لہٰذا انگریز یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس سمت سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ معرکہ آرائی کریں۔

حیدر علی کی حکمت عملی کی پیروی کرتے ہوئے انگریزوں نے بھی اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا لیکن ابتدا ہی میں ایک حصے کا کمان دار کرنل فرچمین پیش قدمی کرتے ہوئے حیدر علی کی فوج کے ہتھے چڑھ گیا اور شکست کھا کر کہیں روپوش ہو گیا۔ کئی انگریز ہلاک ہوئے اور

قادرِ مطلق

ابوبکر سعدؓ ایک نیک اور سعادت مند فرزند تھے وہ زمانے کے لوگوں کی فریادیں سنتے، بے سہاروں کو سہارا دیتے اور مظلوموں پر شاہانہ انعام واکرام کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی مہربانیوں کا شکر ادا کرنا ناممکن ہے۔ سومنات سے مجھے جو نصیحت ملی ہے وہ آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ میں جب بھی علیم وخبیر اللہ تعالیٰ کے آگے دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتا ہوں تو مجھے وہ چینی جیسا بت یاد آ جاتا ہے جو میری خود بینی کو شکست دے دیتا ہے مجھے احساس ہوتا ہے کہ اگر خدا مجھے ہاتھ اٹھانے کی توفیق نہ دیتا تو یہ ہاتھ کبھی نہ اٹھ پاتے۔ نیکی اور عبادت کا دروازہ یوں تو ہر ایک کے لیے کھلا ہے مگر عبادت وہی کرتا جسے اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ دربار شاہی میں حاضری اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے طلبی کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ قادر مطلق خدا کی ذات ہے اور تقدیر کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی لیے کسی راہ راست کو کبھی گھمنڈ اور تکبر نہیں کرنا چاہیے یہ سمجھ کر کہ میں راستی پر ہوں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے تو راہ راست پر چل رہا ہے۔ ورنہ تمہارے جیسے کتنے گمراہ ہو چکے ہیں اور ان کو ہوش بھی نہیں ہے۔

نصیحت: ''عبادت اللہ تعالیٰ کی توفیق کے باعث ہے۔''

قلمی تعاون: محمد امین۔ کراچی

جنگی قیدی بھی بنا لیے گئے۔

ایک مرتبہ پھر انگریز سفیر صلح کے پیغام کے ساتھ حیدر علی کے دربار میں آن پہنچا۔ حیدر علی نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

''ہم بذات خود مدراس میں داخل ہو رہے ہیں اور گورنر اور کونسل کی زبانی صلح کی شرائط اپنے کانوں سے سننے کے متمنی ہیں۔''

اس جواب سے یہ مطلب اخذ کرنا لازمی تھا کہ حیدر علی کا ارادہ مدراس کا محاصرہ سرانجام دینے کا ہے۔ لہٰذا مدراس کی تمام انگریز افواج کو حکم دیا گیا کہ مدراس کے قرب وجوار میں جمع ہو جائیں۔

حیدر علی نے مدراس کی جانب اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا۔ اس نے پہلا پڑاؤ پانڈیچری میں کیا پھر گوڈیلور پہنچا۔ یہاں سے کویڑ پہنچ گیا۔ اب وہ مدراس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

اب انگریزوں کو یہ فکر ہوئی کہ اسے سینٹ تھامس کے دریا کو عبور کرنے سے روکا جائے لیکن اس وقت تک وہ پالی لٹ کے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مدراس کے دروازے پر تھا۔ اب اسے روکنے کا حل فوجی کارروائی میں نہیں سیاسی بات چیت میں تھا۔ انگریز کونسل نے اپنا اجلاس فوراً منعقد کیا۔ بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ گورنر مدراس ڈوپری حیدر علی کے دربار میں حاضری دیں گے اور صلح کی درخواست کریں گے۔

صلح کی اولین شرط کے مطابق ''ہوسکٹہ'' کا تمام تر اسلحہ، توپ خانہ اور دیگر سامان حرب جسے اہل دکن، انگریزوں اور نواب ارکاٹ نے وہاں ذخیرہ کیا تھا، حیدر علی کے قبضے میں جائے گا۔

نواب ارکاٹ اور انگریز حیدر علی کو سالانہ چھ لاکھ خراج ادا کریں گے اور اطاعت گزاری کریں گے۔

فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنے سے گریز کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔

اس معاہدے کے مطابق حیدر علی ان تمام مقبوضات اور علاقوں کا مالک ہوگا جن پر وہ قبضہ کر چکا تھا۔

حیدر علی پر یہ راز کھل چکا تھا کہ انگریزوں کو مکمل شکست سے دوچار کرنا مشکل ہے۔ طویل دورانیے پر مشتمل یہ جنگ کسی بھی وقت بے نتیجہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ خدشہ بھی برابر لاحق تھا کہ اس کی شمالی سرحد مرہٹوں کی جارحانہ کارروائیوں کے خطرے سے خالی نہیں۔

وہ انگریزوں کا غرور توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا لہٰذا اب صلح کرنے میں حرج نہیں تھا۔ اس کا یہ قول بھی سچ ثابت ہو گیا تھا۔

''ہم بذات خود مدراس میں داخل ہو رہے ہیں اور گورنر اور کونسل کی زبانی صلح کی شرائط اپنے کانوں سے سننے کے متمنی ہیں۔''

اب وہ اپنے کانوں سے صلح کا پیغام سن رہا تھا۔

مدراس میں انگریز گورنر کو اپنا مطیع بنانے کے بعد حیدر علی نے ہوسکٹہ کا رخ کیا اور معاہدے کے مطابق انگریزوں کے اسلحہ کے ذخیرے پر اپنا قبضہ جمایا۔

وہ پچاس ہزار سواروں، ساٹھ ہزار پیادہ سپاہ اور پانچ سو ہاتھیوں کے جلوس میں فاتح عالم کی طرح سرنگا پٹم میں داخل ہوا تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی حیدر علی ہے لیکن چہرے پر ناقابل بیان تھکن تھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔

●●●

حیدر علی جس وقت انگریز کمانڈروں کے لیے دہشت کا نشان بنا ہوا تھا، اس سے مقابلے کے لیے سر آئر کوٹ کو انگلستان سے مدراس بلایا گیا۔ یہی وہ لائق کمانڈر تھا جس کی اہمیت کو حیدر علی نے بھی تسلیم کیا۔ حیدر علی بستر مرگ پر تھا جب اس نے آئر کوٹ کی موت کی خبر سنی۔

وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ ''یہ ایک اہل شخص تھا۔ اس نے خوب ہمارا مقابلہ کیا۔''

آئر کوٹ جب ہندوستان پہنچا تو حیدر علی نے امبور، ویلور، ونڈی واش، پرم آکل اور چنگل پٹ وغیرہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

آئر کوٹ کے ہندوستان پہنچتے ہی حیدر علی سے اس کی معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ اولین محاذ چنگل پٹ پر قائم ہوا۔

پھول چری کے مقام پر آئر کوٹ نے پیش قدمی ترک کر کے کڈلور کا رخ کیا جہاں حیدر علی محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس کی توپیں قلعہ پر گولہ باری کر رہی تھیں۔

حیدر علی کو معلوم ہوا کہ آئر کوٹ اس سے پہلو تہی کرتے ہوئے محمود بند کی جانب کوچ کر گیا ہے۔ اس خبر کو سن کر حیدر علی نے محاصرہ ختم کیا اور محمود بند کا رخ کیا۔

اسی وقت مدراس کے سمندر میں ایک فرانسیسی بحری بیڑا دیکھا گیا لہٰذا آئر کوٹ مدراس پہنچا۔ حیدر علی اس کے تعاقب میں تھا اس لیے وہ راستہ تبدیل کر کے کڈلور چلا گیا تاکہ حیدر علی مدراس تک نہ چلا آئے۔

آئر کوٹ نے حیدر علی سے معرکہ آرائی کا فیصلہ کر لیا۔

حیدر علی ایک شاطر تھا۔ اس نے راتوں رات سڑکیں اپنے قبضے میں کر لیں تاکہ آئر کوٹ کو رسد نہ پہنچ سکے۔ لیکن بحری راستے سے رسد کے ذخائر انگریزوں تک پہنچ چکے تھے۔

آئر کوٹ اور حیدر علی کی افواج میں معرکہ آرائی ہوئی اور آئر کوٹ نے حیدر علی کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ حیدر علی نے پسپا ہوتے ہوئے ''پرمونکل'' کے قلعے کا رخ کیا جو انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ قلعہ نہایت مضبوط تھا لیکن دشمن محض چھ دن ہی اس کا دفاع کر سکا۔ ساتویں روز قلعہ حیدر کے ہاتھ میں تھا۔

اس کے بعد بھی آئر کوٹ کے ساتھ حیدر علی کے کئی معرکے ہوئے۔ ارکاٹ، ڈنڈی واش، کڈلور وغیرہ میں دونوں کا خوب آمنا سامنا ہوا۔ یہاں تک کہ مدراس کی صلح کا وقت آ گیا۔

اس صلح سے بے خبر حیدر علی کا بیٹا ٹیپو انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھا۔

●●●

حیدر علی ایک عرصے سے سرطان کے مرض میں مبتلا تھا۔ ہر سال اس کی پیٹھ پر سرطان کا زہریلا پھوڑا نکلتا تھا۔ نشتر زنی کے ذریعے اس پھوڑے کا فاسد مادہ نکال دیا جاتا تھا۔ حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے۔

نومبر 1782ء کو پھر ایسا ہی پھوڑا نکلا۔ مسلمان اور فرانسیسی معالجوں نے اس مرتبہ صاف کہہ دیا کہ اب اس پھوڑے کا زہر جسم میں سرایت کر چکا ہے۔ سلطان کا بچنا اب محال ہے۔ اس وقت اس کی عمر اس کے کارناموں کے سامنے بہت کم یعنی ساٹھ سال تھی۔

اس کا کمرا اس کے امرا اور طبیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب کا اصرار تھا کہ اس نازک وقت میں ٹیپو کو محاذ جنگ سے واپس بلا لیا جائے۔ حیدر علی ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''وہ انگریزوں سے جہاد میں مصروف ہے۔ میں اسے کیسے واپس بلا لوں۔ محض ایک نظر دیکھنے کے لیے اسے واپس بلا لوں، نہیں ہرگز نہیں۔ بس تم اتنا کرنا کہ اگر میرا انتقال ہو جائے تو تم لوگ اسی طرح ٹیپو کے وفادار رہنا جس وفاداری سے میری خدمات انجام دی ہیں۔''

اس کی حالت روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔ امرا کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا بالآخر اس کی شفقت پدری نے شور مچایا اور وہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

''جان پدر! اگر تمہیں اس علاقے سے ذرا بھی فرصت مل گئی ہو جہاں تم ہو تو میری آنکھیں اپنے دیدار سے منور کرنے کے لیے چلے آؤ۔ اگر ممکن نہیں تو مجھے لکھو۔ میں تمہاری مدد کے لیے مزید فوج بھیجنے کو تیار ہوں۔ میں نے تمہیں اپنی سلطنت کا مختار بنایا ہے لہٰذا ذرا بھی تغافل نہ برتنا۔''

ٹیپو ان دنوں مالابار کی طرف گیا ہوا تھا اور اس وقت پالا گھاٹ میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ پالا گھاٹ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ٹیپو ان پر دباؤ بڑھاتا رہا یہاں تک کہ انگریز پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوتے دریائے یونائی کے کنارے تک پہنچ گئے۔ اسی مقام پر جبکہ وہ انگریزوں پر بڑے حملے کی تیاری کر رہا تھا اسے حیدر علی کا خط ملا۔

اس خط کو پڑھ کر وہ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آج تک اس کے باپ نے اسے کسی محاذ جنگ سے واپس نہیں بلایا اب ایسی کیا بات ہو گئی۔ یہ جملے بھی اس کے دل میں کھٹک پیدا کر رہے تھے کہ ''ہم تمہیں امور سلطنت کا مختار بناتے ہیں۔''

کہیں وصیت تو نہیں؟ کہیں..... اس کے بعد اس کے سوچنے کے لیے کچھ اور نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے تقریباً جیتی ہوئی مہم ادھوری چھوڑی اور اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف روانہ ہو گیا۔

حیدر علی کی صحت برابر گرتی چلی گئی اور 17 دسمبر 1782ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

مورخین کے بیان کے مطابق وہ ترائن پٹ میں جو چتوڑ کے قریب ہے خیمہ زن تھا۔

مرنے سے پہلے حیدر علی نے خزانے کے منہ کھول دیے اور اپنی سپاہ اور فوجی افسران کو ایک ایک ماہ کی اضافی تنخواہ کا تحفہ دیا۔

موت سے دو دن پہلے اپنے تیمارداروں کو حکم دیا۔ ''میرے لیے غسل کا پانی گرم کیا جائے۔''

حکما ہاتھ باندھے سامنے آ گئے۔ ''حضور، غسل آپ کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔''

''اب میری روانگی کا وقت آ گیا ہے، مجھے کون روک سکتا ہے۔''

تیمارداروں کو باہر نکال دیا۔ غسل کیا اور خوشبو وغیرہ لگائی۔ حفاظ کرام کو حکم ہوا کہ وہ مسلسل تلاوت کرتے رہیں۔ اس دوران تکلیف میں قرار واقعی اضافہ ہو چکا تھا۔ حیدر علی برداشت کرتے رہے۔ ہونٹوں کو مسلسل جنبش تھی۔ کان لگا

کر سننے والوں نے سنا کہ وہ اپنے رب سے مغفرت طلب کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے ان کی زبان پر ٹیپو کا نام بھی آجاتا تھا جواب تک نہیں آیا تھا۔

جیسے ہی حیدر علی کا انتقال ہوا اس کے اعلیٰ عہدے داروں نے فیصلہ کیا کہ حیدر کی وفات کو مخفی رکھا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹیپو کے آنے سے قبل کوئی بغاوت رونما ہو جائے۔

حیدر کی لاش کو ایک پالکی میں رکھا گیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ حیدر علی اس میں موجود ہے اور سفر کر رہا ہے۔ اس کی فوج اس کے ساتھ تھی۔

لاش کچھ عرصے کے لیے کولار میں فتح محمد کے مقبرے میں رکھی گئی۔ پھر بعد میں اسے سرنگا پٹم منتقل کر کے اس عالی شان مقبرے میں دفن کر دیا گیا جو ٹیپو نے بنوایا تھا۔

ہر قسم کی احتیاط کے باوجود حیدر کی موت کی خبر سرنگا پٹم پہنچ گئی۔ بعض شر پسندوں نے اس خبر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان میں حیدر علی کا چچازاد بھائی پیش پیش تھا۔ اس کے تحت چار ہزار سوار تھے۔ اس نے بخشی شمس الدین سے ساز باز کی۔ کئی دوسرے امرا بھی شامل ہو گئے۔ ان سب نے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ ٹیپو کے چھوٹے بھائی عبدالکریم کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ وہ کم عقل ہے۔ اس کی آڑ میں حکومت کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھوں میں رہے گی۔ لیکن اس سازش کا انکشاف ہو گیا۔ ایک فرانسیسی افسر جو اس سازش میں شریک تھا، جاں بخشی کے وعدے پر سازش کا سارا راز افشا کر دیا۔ محمد امین اور شمس الدین کو بھی اقبال جرم کرنا پڑا۔ انہیں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ فرانسیسی افسر کو بھی گرفتار کر لیا گیا کہ کہیں وہ مدراس سے خط کتابت نہ کرے۔

اسی طرح چند اور فتنہ پردازوں نے سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن ان سب کو ٹیپو کی حامی فوج نے دبا دیا۔

فوج ٹیپو کی وفادار تھی اور اسے حکمرانی کا اہل سمجھتی تھی۔ اسی لیے یہ سازشیں دم توڑ گئیں۔

ٹیپو کو اپنے باپ کا خط 11 دسمبر 1782ء کو مل گیا تھا اور وہ اگلے دن سرنگا پٹم کے لیے روانہ ہو گیا تھا لیکن اس کی فوج نے سفر میں زیادہ تیزی نہیں دکھائی کیونکہ معلوم تھا کہ فوج کے بڑے بڑے عہدہ دار ٹیپو کے وفادار ہیں، کسی بغاوت کا کوئی اندیشہ نہیں۔

28 دسمبر کو وہ اس کیمپ میں پہنچ گیا جو مرکزی فوج سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر اس کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اس کے خیر مقدم کے لیے تزک واحتشام کا اہتمام نہ کیا جائے۔ وہ نہایت سادہ انداز میں کیمپ میں داخل ہوا اور قالین پر بیٹھ گیا اور خاص خاص عہدہ داروں کو شرف باریابی بخشا اور ان سے سرنگا پٹم کے حالات پر بات چیت کرتا رہا تاکہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے شہر میں داخل ہونا ہے یا انتظار کرنا ہے۔

جب وہ سرنگا پٹم کے حالات سے مطمئن ہو گیا اور کسی قسم کی فوج کشی کی ضرورت محسوس نہیں کی تو اگلے دن سرنگا پٹم میں داخل ہوا جہاں تخت شاہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نواب ٹیپو سلطان بہادر کا لقب اختیار کر کے باپ کے تخت پر بیٹھا۔

ٹیپو کو ایک وسیع سلطنت وراثت میں ملی۔ اس کے علاوہ سرنگا پٹم کا خزانہ بھی ملا جس میں تین کروڑ روپے اور لاتعداد جواہرات تھے۔ مزید براں حیدر علی نے اٹھاسی ہزار نفوس پر مشتمل ایک بڑی فوج چھوڑی۔ محافظ فوجیں اور صوبہ داری فوجیں اس کے علاوہ تھیں۔

اس زمانے میں قطعی طور پر یہ ہندوستان میں بہترین فوجی طاقت تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ حیدر علی نے ٹیپو جیسا لائق فرزند چھوڑا جس نے حیدر علی کے مشن کو پورا کرنے کی قسم کھائی۔

حیدر علی کی موت کی خبر انگریزوں نے بڑی خوشی سے سنی لیکن وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطنت میسور کی تخت نشینی بہت پرامن طریقے سے ہوئی۔ نہ تو ٹیپو اور کریم میں تخت کے لیے کوئی جھگڑا ہوا اور نہ فوج کے سرداروں نے بغاوت کی جس کی انگریزوں کو توقع تھی۔ حیدر علی کو ٹیپو جیسا وارث بھی مل گیا جس نے تخت پر قدم رکھتے ہی جنگی معاملات کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔

اسے خبر ملی کہ انگریزی فوج جنرل اسٹورٹ کی قیادت میں ونڈی واش کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ سرنگا پٹم سے نکلا اور لامتناہی جنگوں کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

ماخذات

حیدر علی، نریندر کرشن سنہا۔ حیدر علی، مسعود مفتی۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خاں۔
کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد V، ڈبلیو۔ ایچ۔ ہٹن۔ کمپنی کی حکومت، باری علیگ۔

اندر کی آگ

کاشف زبیر

جب بھی کوئی بات پہلی بار ہوئی اردگرد بے شمار لوگوں کو چونکا گئی اور پھر دھیرے دھیرے یادداشت سے اتر گئی... یہ روایت دنیا میں ابتدا سے چلی آرہی ہے۔ اس آگ نے بھی سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے سب کو جلا کر بھسم کر رہی تھی پھر... محبت کی پھوار نے اس کے شعلے ٹھنڈے کرنے شروع کیے لیکن اتنی دیر میں کوئی زندگی ہار گیا اور کوئی جیتے جی مر گیا... اس اندر کی آگ کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا جس کے بھڑکنے کا سبب انسان کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔

خوفناک اور پراسرار طاقتوں کا کربناک تماشا

کوئن پیلس کے سامنے والے حصے سے محل کے بالکل سامنے زیر تعمیر بدھا کا مجسمہ آسمان سے باتیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ لوہے سے تیار کیا جانے والا یہ مجسمہ زمین سے کوئی ایک سو ستر میٹرز اونچا تھا۔ مجسمے کا جسم تقریباً مکمل ہو گیا تھا اور اب تیاری کا کام آخری مرحلے میں تھا۔ جنوب مشرقی چین میں دوسری صدی عیسویں میں اس چھوٹی سی ساحلی ریاست میں ملکہ ماشی زو کی حکومت تھی۔ ماشی زو کا شوہر ریاست کا سابق حکمران کیرگائی جگر کی بیماری میں اچانک جواں عمری میں

وفات پا گیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور امرا اس کے بھائی شیر گائی کو حکمران بنانا چاہتے تھے لیکن ماشی زو نے فوج کے بڑے حصے کی حمایت حاصل کر کے ایک خونریز لیکن مختصر لڑائی کے بعد ریاست کا قبضہ حاصل کر لیا اور تاج اپنے سر پر سجا لیا، اس وقت اس کی عمر صرف تیس برس تھی۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے مخالفین کو بے دریغ قتل کیا۔ سب سے پہلے اس نے شیر گائی اور اس کے حامی امرا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے جبر سے اس نے مخالفین کے حوصلے پست کر دیے اور بالآخر انہوں نے ملکہ ماشی زو کی حکومت تسلیم کر لی۔ اس کے بعد ماشی زو نے سب سے پہلے ملک کی معاشی اور فوجی حالت کی طرف توجہ دی۔ ملکہ نے تاجروں کو محصول کے بدلے سہولتیں دیں کہ وہ یہاں کی بندرگاہ سے سامان لائیں اور لے جائیں۔ ملک میں صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ہنرمندوں کو قرضے مہیا کیے گئے۔ پورے ملک میں زمین آباد کرنے کا حکم دیا۔ ملک میں جاگیرداری نظام تھا اور یہ جاگیردار ہی ملکہ کی اصل طاقت تھے لیکن اس نے حکم دے رکھا تھا جو زمین پورے ایک سال تک کسی کام میں نہ لائی گئی اسے ضبط کر کے کسی اور کو دیدیا جائے گا۔ اس حکم کی وجہ سے یہ چھوٹی سی ریاست اتنا اناج پیدا کرنے لگی کہ آس پاس کے ملکوں کو بھی اناج فروخت کیا جانے لگا اور یہ ریاست کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔

ملکہ بدھ مت کی پیروکار تھی، جب اس کی تخت نشینی کی بیسویں سالگرہ قریب آنے لگی تو اس نے محل کے بالکل سامنے بدھا کا عظیم مجسمہ بنانے کا حکم دیا۔ لوہے، جست اور تانبے سے بنایا یہ مجسمہ ایک سو ستر میٹرز بلند تھا اور اس کا وزن دس ہزار ٹن سے بھی زیادہ تھا۔ مجسمے کے چاروں طرف بانس کی مدد سے سہارے بنائے گئے تھے جو اسے مکمل ہونے تک مضبوطی سے پکڑے رکھتے۔ جب مجسمہ مکمل ہو جاتا یعنی اس کے اندر کے تین فولادی ستون مکمل ہو جاتے تو بانسوں کا سہارا ہٹا لیا جاتا۔ اس وقت مجسمے کے اندر آخری ستون کی تیاری کا کام جاری تھا۔ ایک ایک کر کے بڑے فولادی کڑے لوہے کی راڈوں پر چڑھائے جا رہے تھے اور انہیں یکجان کرنے کے لیے ان پر پگھلا ہوا فولاد ڈالا جا رہا تھا۔ ملکہ ماشی زو نے حکم دیا تھا کہ مجسمہ بہرصورت اس کی تخت نشینی کی بیسویں سالگرہ سے پہلے مکمل کر لیا جائے۔ صبح سورج کی پہلی کرن طلوع ہوئی تو ماشی زو محل کے ٹیرس میں موجود تھی۔ روشنی پڑتے ہی سیاہی مائل مجسمہ چمک اٹھا تھا۔ بلاشبہ چینی کاری گروں نے کمال کر دکھایا تھا۔ ملکہ ماشی زو بھی مبہوت رہ گئی۔ اگرچہ مجسمہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ماشی زو سے ذرا پیچھے اس کی معتمد خاص کم ہوائے کھڑی تھی۔ کم بہت دل کش نقوش اور چھریرے جسم کی خوب صورت عورت تھی۔ اس کی عمر تیس کے آس پاس تھی اور وہ بہت کم عمری سے ملکہ کے ساتھ تھی۔ اسے ملکہ ماشی زو کی فوج طاقت کے بل پر اور دوسرے بچوں کو ایک باغی گاؤں سے لائی تھی۔ جب انہیں ملکہ ماشی زو کے سامنے پیش کیا گیا تو کم نے ملکہ کی توجہ حاصل کر لی۔ اس نے کم کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ وہ محل میں بڑی ہوئی تھی اور اس نے سپہ گری سمیت بہت سارے علوم حاصل کیے تھے، اپنی ذہانت اور وفاداری کی وجہ سے وہ ماشی زو کی معتمد خاص بن چکی تھی۔

''کم۔'' اچانک ماشی زو نے اسے پکارا۔

''جی میری ملکہ؟'' کم مستعد ہوگئی۔

''یہ خوب صورت ہے نا؟''

''جی میری ملکہ۔''

''پورے چین... بلکہ پوری دنیا میں بدھا کا ایسا کوئی مجسمہ نہیں ہوگا۔'' ماشی زو سرخوشی کے عالم میں بولی۔

''جی میری ملکہ۔''

''لیکن یہ مکمل کیوں نہیں ہو رہا ہے؟'' اس بار ملکہ کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔ ''کام کرنے والے سستی سے کام لے رہے ہیں۔''

''میں آج ہی انچارج سے پوچھتی ہوں۔''

''ٹھیک ..... مجھے معلوم کر کے بتاؤ۔'' ماشی زو نے تحکمانہ انداز میں کہا اور پلٹ کر محل کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد کم اپنے مخصوص محافظ دستے کے ساتھ محل سے نکل کر بدھا کے مجسمے کی طرف بڑھی تو اس کی آمد کی خبر پہلے ہی کام کرنے والوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر مجسمے میں داخل ہوئی تو ہر شخص یوں جوش و خروش سے کام میں جتا ہوا تھا جیسے آج آخری بار کام کر رہا ہو۔ اس کام کا انچارج فینگ من خود دوڑا آیا۔ وہ تقریباً ساٹھ برس کا گول چہرے والا شخص تھا خوشامد اور خوش اخلاقی جیسے اس کے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کم کے سامنے بچھ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کم نہیں خود ماشی زو وہاں آ گئی ہو۔ ''خوش آمدید... عظیم ملکہ کی معتمد خاص... خوش آمدید۔''

مجسمہ اندر سے کسی ہال کی طرح کھلا اور بلند تھا۔ درحقیقت اندر یہ کھوکھلا ہی تھا اور اس کے تین ستون تھے۔ وسطی ستون جو سب سے پہلے بنا تھا اور فولاد پگھلانے والی بھٹی اسی کے نیچے تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو مزید

ستون تھے۔ مجسمے میں یہ آگے اور پیچھے کے ستون تھے۔ مرکزی ستون مجسمے کے سر تک گیا تھا جب کہ آگے پیچھے والے ستون سینے اور کمر کے اوپری حصے تک گئے تھے۔ مجسمہ جتنا باہر سے پرشکوہ تھا اتنا ہی اندر سے بھی تھا۔ کم فینگ من کے ساتھ مرکزی ستون کے نیچے موجود بھٹی تک آئی جس میں فولاد پگھلایا جا رہا تھا۔ بھٹی کی وجہ سے اندر گرمی کا احساس شدید تر ہو گیا۔ کم نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور تحکمانہ انداز میں بولی۔

''عظیم ملکہ جاننا چاہتی ہے کہ مجسمے کی تکمیل میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟''

فینگ من کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ملکہ ماشی زو نے پہلے ہی وارننگ دیدی تھی کہ تاخیر کی صورت میں اسے اور سپروائزروں کو سزا ملے گی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''معتمد خاص... بالکل تاخیر نہیں ہو رہی ہے۔ مجسمہ تاج پوشی کی سالگرہ سے پہلے مکمل ہو جائے گا۔''

تیسرا ستون تقریباً ستر فیصد مکمل ہو چکا تھا۔ ابھی تاج پوشی کی تقریب میں ایک مہینے کا وقت تھا۔ کم کا بھی یہی اندازہ تھا کہ کام مقررہ وقت پر مکمل ہو جائے گا لیکن اس نے پھر بھی فینگ من کو خبردار کیا۔ ''عظیم ملکہ کام کی رفتار سے خوش نہیں ہے۔''

چرب زبان فینگ من اسے یقین دلانے لگا کہ مجسمہ وقت سے پہلے مکمل ہو جائے گا پھر اس نے کم سے کہا کہ وہ مجسمے کے اوپری حصے میں چلے، یہاں گرمی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کم تیار ہو گئی ویسے بھی وہ مجسمے کی بلندی سے محل اور شہر کا نظارہ کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مرکزی ستون کے ساتھ لگی لفٹ سے اوپر جا رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ مجسمے کے اوپری حصے میں پہنچ چکے تھے، یہ مجسمے کا سر تھا۔ اس کی آنکھوں والے حصے میں خلا تھا۔ درحقیقت یہ دو عدد بالکونیاں تھیں جن سے بالکل نیچے محل اور سامنے دور تک پھیلے شہر اور بندرگاہ کا منظر ناقابل یقین حد تک واضح اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ کم حیران ہوئی اور اس منظر میں اتنا کھوئی کہ اسے احساس نہیں ہوا کہ فینگ من کا چیف سپروائزر کائی منک اسے ذرا دور لے گیا ہے، وہ اسے کچھ بتا رہا تھا اور فینگ من اسے ٹال رہا تھا، شاید کوئی مسئلہ تھا جس پر وہ کم کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے چیف سپروائزر کو ٹال کر کم کے پاس آیا تو اس کے چہرے پر پسینا آیا ہوا تھا۔ یہاں بلندی پر ہوا بہت تیز اور خنک تھی اس کا پسینا خشک ہو جانا چاہیے تھا لیکن باہر آتے ہی اس کا پسینا مزید تیزی سے بہنے لگا۔ کم نے اس کی طرف دیکھا اور پھر پیچھے ہوئی۔ فینگ من کا چہرہ پگھلے فولاد کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور پھر اچانک اس کے جسم اور لباس میں شعلے سے بھڑک اٹھے۔ اس کے آس پاس موجود لوگ چونک کر پیچھے ہٹے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے چیختا چلاتا فینگ من راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

☆☆☆

ماشی زو کا چہرہ پُرتفکر تھا۔ اس نے کم کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تم پر پورا اعتماد ہے، تم نے جو کہا ہے مجھے اس پر پورا یقین ہے۔''

''اس اعتماد کے لیے میں شکرگزار ہوں میری ملکہ۔''

''لیکن فینگ من کے ساتھ کیا ہوا... پولیس چیف کیا کہتا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے فینگ من کو کسی نے آگ نہیں لگائی بلکہ یہ آگ اس کے اندر سے ابھری تھی۔ اس کی ہڈیاں تک اندر سے جل گئی ہیں۔ میں نے خود دیکھا پہلے اس کے جسم سے شعلے اٹھے اور پھر اس کے لباس کو آگ لگی۔''

''حیرت انگیز!'' ماشی زو نے کہا۔ ''کیا اسے بدھا کی بددعا لگی ہے؟''

''میری ملکہ... کیا آپ ایسا ہی سمجھتی ہیں؟'' کم نے غور سے ماشی زو کو دیکھا۔ وہ مسکرانے لگی۔

''نہیں... میرا خیال ہے یہ کسی انسان کا کام ہے اور اس کا مقصد مجسمے کی تعمیر میں تاخیر کرنا ہے۔''

''مجسمے کی تیاری کا کام جاری ہے اور آخری مرحلے میں ہے۔ فینگ من کا کام سپلائی اور کام کی نگرانی تھا۔ مجسمے کا چیف آرکیٹیکٹ اور چیف سپروائزر کائی منک ہے۔ مجسمہ درحقیقت اس کی نگرانی میں بن رہا ہے اس لیے فینگ من کے مرنے سے کام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''تب اس موت کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے؟'' ماشی زو بولی۔ ''کیا میرے آدمیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو معمے کو حل کر سکے۔''

''پولیس چیف بہت ذہین آدمی ہے۔''

ماشی زو سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ''ہاں لیکن ایک اور شخص ہے میرا خیال ہے وہ اس معمے کو حل کر سکتا ہے۔''

''میں اس کا نام جان سکتی ہوں میری ملکہ؟''

ماشی زو نے سر ہلایا۔ ''جاسوس لی کوائے... اسے میں نے خود جیل بھیجا تھا۔''

کم چونک گئی۔ ''آپ نے اسے جیل بھیجا تھا؟''

"ہاں اس نے مجھے اپنی ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ دوسرے باغیوں کو سزائے موت ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے لی کوائے پر رحم آگیا اور میں نے اسے صرف قید کی سزا دی۔ وہ دس سال سے جیل میں ہے۔"

کم سوچ رہی تھی کہ جو شخص دس سال سے جیل میں ہو کیا وہ کسی قابل رہ گیا ہوگا اس کی سوچ پڑھ لی گئی ملکہ نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ "کم اسے تم راضی کرو گی۔"

"میری ملکہ۔" کم اس کے آگے جھک گئی۔

ماشی زو مسکرانے لگی۔ "تم جانتی ہو دنیا میں سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟"

"نہیں، میری ملکہ۔"

"ایک عورت... ایک حسین عورت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے۔"

☆☆☆

کیوآئن کا یہ قید خانہ بہ ظاہر بڑی حسین جگہ تھی۔ ساحل سے کوئی سو میل دور اونچے پہاڑ پر بنی سرخ رنگ کی یہ جیل خزاں کے آغاز میں جنگل کے سرخ ہو جانے والے پتوں کی وجہ سے بالکل پاس آنے پر دکھائی دیتی تھی۔ کم اپنے محافظ دستے کے ساتھ جیل پہنچی تو جیل کا نگران اس کے آگے بچھ گیا۔ کم کا خیال تھا کہ لی کوائے کوئی معمر شخص ہوگا جسے دس سال کی قید نے مخبوط الحواس کر دیا ہوگا۔ اس لیے وہ سیاہ بالوں اور ڈاڑھی والے اس شخص کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل سفید اور جسم ورزشی تھا۔ نقوش کسی قدر کھڑے تھے جو چینیوں میں بہت خوب شمار کیے جاتے ہیں۔ اس نے جیل کا معمولی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں پڑی تھیں۔ کم نے نگران کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے دفتر سے نکل کر چلا گیا۔ اب وہاں صرف لی کوائے اور کم تھے۔ وہ قیدی ہونے کے باوجود اسے پوری دلچسپی اور بے باکی سے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے بہت عرصے بعد کوئی عورت دیکھی ہے اس لیے تم مجھے خوب صورت لگ رہی ہو۔"

کم کی آنکھوں میں غصہ دہک اٹھا لیکن اس نے اپنے تاثرات سے ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو۔"

"تمہیں ماشی زو نے بھیجا ہے۔" لی کوائے نے اسے پھر حیران کر دیا۔ وہ یوں بے ادبی سے ملکہ کا نام لینے پر غصہ کرنا بھی بھول گئی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"اس ملک میں ایک عورت کی حکومت ہے اور جب کوئی عورت اتنے اختیار سے کہیں آئے، اس کے ایک اشارے پر اس جیل کا نگران اٹھ کر اپنے دفتر سے چلا جائے تو صاف ظاہر ہے وہ ماشی زو کی فرستادہ ہی ہو سکتی ہے۔"

"ادب سے نام لو، وہ عظیم ملکہ ہے۔"

لی کوائے نے بے ساختہ ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا پھر وہ سنجیدہ ہو گیا اور حقارت سے بولا۔ "اے عورت... اگر میں اسے ملکہ تسلیم کرتا تو اس قید خانے میں پڑا کیوں سڑ رہا ہوتا؟"

کم نے خود کو لاجواب محسوس کیا پھر اسے اپنی حیثیت کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے سنبھل گئی۔ اس نے کسی قدر آگے جھک کر کہا۔ "سنو میں تمہارے لیے ایک موقع لائی ہوں۔"

"ماشی زو کو مجھ سے کوئی کام ہوگا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "کوئی ایسا کام جو صرف لی کوائے کر سکتا ہے کوئی ایسا کیس جو کوئی دوسرا حل نہیں کر سکتا۔"

کم نے محسوس کیا کہ لی کوائے خطرناک حد تک ذہین ہے اور شاید اسی لیے ماشی زو نے اس کا نام لیا تھا۔ "کیا تمہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔" لی کوائے نے اپنے ہاتھ کی زنجیروں کی طرف دیکھا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ کام کیا ہے اور اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟"

کم اسے فینگ من کی پراسرار موت کے بارے میں بتانے لگی۔ لی کوائے غور سے سن رہا تھا۔ جب کم خاموش ہوئی تو اس نے کہا۔ "تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ مجھے کیا ملے گا؟"

"شاید آزادی۔"

"یا شاید زندگی سے آزادی؟" لی کوائے کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ "کیا یہی موقع ہے میرے لیے؟"

"ہاں اگر تم اسے لینا پسند کرو؟"

"اگر تم جیسی خوب صورت عورت مجھ سے کہے گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

کم جھنجلانے لگی۔ ماشی زو کی معتمد خاص کی ایک حیثیت تھی اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ اس سے یوں بے تکلفی سے بات کرتا۔ مذاق کرنا تو دور کی بات لیکن یہ شخص اسے بالکل سنجیدہ نہیں لے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے پاس ایک پیشکش لائی ہوں اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔"

"بعض اوقات آدمی اپنے اختیار سے دست بردار بھی ہو جاتا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو میں یہ پیشکش قبول کر لوں؟"

کم نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں سے دبا لیا۔ "کیا تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہے؟"

"ممکن ہے ہو اور ممکن ہے نہ ہو۔" لی کوائے کا لہجہ پھر طیش دلانے والا ہو گیا۔ اس بار کم نے اپنا ہونٹ کچل ڈالا تھا۔ وہ سوچتی رہی اگر ماشی زو نے اسے یہ ذمے داری نہ سونپی ہوتی تو وہ اب تک واپسی کے لیے روانہ ہو چکی ہوتی۔ بالآخر اس نے گہری سانس لی۔

"لی کوائے، میں چاہتی ہوں تم یہ پیشکش قبول کر لو۔"

اس کا خیال تھا کہ لی کوائے مسکرائے گا اس کی شکست اور اپنی فتح پر لیکن وہ بالکل سنجیدہ رہا۔ اس نے کہا۔ "تب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

کم نے جیل کے نگران کو طلب کیا اور لی کوائے کو آزاد کرنے کا شاہی حکم نامہ اس کے سپرد کیا۔ نگران نے شاہی مہر دیکھتے ہی گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے حکم نامہ لیا۔ ایک گھنٹے بعد لی کوائے گھوڑے پر سوار کم اور اس کے محافظ دستے کے ہمراہ دارالحکومت کی طرف جا رہا تھا۔ لی کوائے نے جیل کا لباس اتار کر عام لباس پہن لیا تھا۔ اس نے اپنی تفتیش ابھی سے شروع کر دی تھی۔ اس نے کم سے پوچھا۔ "فینگ من کس قسم کا آدمی تھا؟"

"جیسا کہ اس عہدے کے حامل شخص کو ہونا چاہیے۔ بہ ظاہر بہت نرم اور پر اخلاق لیکن اندر سے وہ شاطر اور ہر چیز پر نظر رکھنے والا تھا۔"

"کسی سے اس کی ایسی دشمنی کہ وہ اسے قتل کرا دے؟"

"پولیس کی تحقیق کے مطابق کسی سے اس کی ایسی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے بتایا نا وہ بہ ظاہر نرم مزاج اور ہر ایک سے اخلاق سے پیش آنے والا شخص تھا اندر کی بات ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔"

"ایسا شخص دوغلا اور خطرناک ہوتا ہے، اس کا اصل روپ اس شخص کے سامنے آتا ہے جسے وہ اپنے ماتحت سمجھتا ہے۔"

"میں اتنا زیادہ نہیں جانتی..... ممکن ہے پولیس چیف کورے ماؤ نے مزید کچھ معلوم کیا ہو۔"

لی کوائے دس سال بعد دارالحکومت آیا تھا اور اس دوران میں شہر کی شان و شوکت ہی بدل گئی تھی۔ لی کوائے کے قیام کا انتظام یہیں تھا۔ لی کوائے کا خیال تھا کہ کم اسے یہاں پہنچا کر واپس چلی جائے گی لیکن اس کی توقع کے خلاف وہ وہیں رک گئی۔ "مجھے میری ملکہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں۔"

"میں نہیں جانتا تم کیا کر سکتی ہو اس لیے میں تم سے کس طرح کام لے سکتا ہوں۔"

"میری مدد سے تم ہر کام کر سکتے ہو، ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی، ہر راستہ کھل جائے اور ہر شخص تم سے تعاون کرے گا۔"

لی کوائے نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس طرح کام نہیں کر سکتا۔ مجھے ملکہ کی طرف سے شاہی مہر لگا حکم نامہ چاہیے کہ ہر شخص مجھ سے تعاون کرے اور میرے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہ کرے۔"

کم نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا اور ایک رول کیا ہوا سنہری کاغذ نکالا۔ "وہ حکم نامہ میں نے پہلے ہی ملکہ سے حاصل کر لیا تھا۔"

لی کوائے نے حکم نامہ دیکھا اور اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہاں بڑا شاندار قسم کا غسل خانہ تھا جس میں بھاپ سے غسل کا انتظام بھی تھا۔ وہ برسوں بعد کھل کر نہایا، اس نے شیو بنائی اور سر کے بال ترشوائے۔ یہاں اس کے لیے دوسرے لباس کا بندوبست بھی تھا۔ وہ باہر آیا تو کم اسے دیکھ کر ایک لمحے کو حیران رہ گئی لیکن فوراً ہی اس نے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ لی کوائے مسکرانے لگا۔ "اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ سرکاری خرچ پر عیاشی کا اپنا ہی الگ مزہ ہے۔ ویسے کیا ماشی زو نے تمہیں مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا ہے؟"

کم کی سیاہ آنکھوں میں پھر غصہ چمکنے لگا لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ نرم تھا۔ "تم اجڈ اور بدتمیز آدمی ہو۔ تمہیں عورتوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔" لی کوائے بے پروائی سے بولا۔ "اسی لیے تو ماشی زو نے مجھے جیل میں ڈال دیا تھا۔"

"کیا خیال ہے، کام کی بات نہ کی جائے؟"

"کام مجھے کرنا ہے اور اس کی ہر بات بھی مجھے کرنی ہے۔" وہ بولا، اسی لمحے اسے باہر کوئی آواز سنائی دی اور وہ چوکنا نظر آنے لگا۔ اس نے کم سے کہا۔ "کیا باہر محافظ موجود ہیں؟"

"نہیں، میں نے اپنا دستہ واپس بھیج دیا ہے بس اس رہائش گاہ کے دو محافظ ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے اب وہ بھی نہیں ہیں۔" لی کوائے نے کہا اور اسی لمحے سامنے والی کاغذ کی دیوار سے تیروں کی ایک بوچھاڑ آئی اور وہ بال بال بچے۔ لی کوائے کم کو سمیٹتا ہوا فرش پر گرا اور اس نے چھوٹی لیکن موٹی سطح والی میز سامنے کر لی، کئی تیر آ کر اس میز میں ترازو ہو گئے۔ کم اس کے بہت قریب تھی، لی کوائے نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "یہ کون ہے، کیا ماشی زو نے یہاں بلا کر مجھے قتل کرنا چاہا ہے؟"

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ میری ملکہ تمہیں قید خانے میں مروا دیتی اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' لی کوائے نے سر ہلایا۔ اس وقت تک باہر موجود تیر انداز دوسری سمت پہنچ گئے تھے اور اب تیروں کی بوچھاڑ دوسری طرف سے آئی۔ وہ دونوں لپک کر لکڑی کے ستونوں کی آڑ نہ لیتے تو مارے جاتے۔ ''لیکن محل کے کمپاؤنڈ کے بالکل پاس ایسی جرأت کون کرسکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' اب کم گھبرا گئی تھی۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

لی کوائے نے اوپر دیکھا اور پھر لکڑی کے ستون کو پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا، اس کا انداز بندر جیسا تھا' کم نے اس کی تقلید کی۔ وہ دونوں چھت پر پہنچ گئے۔ اسی لمحے تیر اندازی رک گئی۔ انہوں نے شور سنا اور جب وہ چھت سے پھسلتے ہوئے نیچے آئے تو انہوں نے عمارت کے سامنے والے میدان میں گھڑ سواروں اور پیدل مسلح افراد کا ایک ہجوم دیکھا۔ ایک معمر شخص اس ہجوم میں بڑی شان سے لکڑی کی منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ کم نے زیر لب کہا۔

''وومنگ!''

لی کوائے آگے بڑھا۔ ''سردار وومنگ... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے یوں خاموشی سے قتل کرنے کی کوشش کرو گے۔''

وومنگ ماشی زو کا مخالف تھا لیکن اس کے پاس دس ہزار سے زیادہ تربیت یافتہ مسلح جنگجو تھے اس لیے ماشی زو نے اسے نظر انداز کیا ہوا تھا۔ وومنگ سرد نظروں سے لی کوائے کو گھور رہا تھا۔ ''میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ یہاں آکر تمہاری جان بچائی ہے وہ دوسرے لوگ تھے جو مجھے اور میرے ساتھیوں کو دیکھتے ہی فرار ہوگئے۔''

''میں مان لیتا ہوں وہ دوسرے لوگ تھے لیکن عظیم سردار، اس طرح رات کی تاریکی میں تمہارے یہاں آنے کا مقصد..... اور کس نے تمہیں اطلاع دی کہ میں یہاں موجود ہوں گا؟''

''مجھے کوئی اطلاع نہیں دیتا، میرے اپنے ذرائع ہیں۔'' وومنگ نے ناگواری سے کہا۔ ''اور یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تمہاری اس سرکاری عمارت میں موجودگی کا سبب پوچھ سکوں۔''

کم آگے آئی اور بولی۔ ''تم اس سوال کے مجاز نہیں ہو۔''

''لی کوائے کسی زمانے میں میرا ساتھی تھا اس لیے مجھے حق ہے۔''

''میں بدھا کے مجسمے کی تعمیر کے انچارج فینگ من کے قتل کی تفتیش کرنے آیا ہوں۔'' لی کوائے نے کہا۔

''کیوں، کیا ماشی زو کے پاس یہاں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو اس قتل کی تحقیق کرسکے؟''

''شاید..... ورنہ وہ مجھے جیل سے کیوں بلاتی؟''

''اور تم آگئے۔'' وومنگ نے حقارت سے کہا تو لی کوائے کا چہرہ تن گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''سردار، دس سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے خاص طور سے جب دوست پلٹ کر نہ پوچھیں لیکن رہائی کی وجہ پوچھنے رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح چلے آئیں۔''

وومنگ کا سرخ و سفید چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف دیکھے بغیر گھوڑے پر سوار ہوکر روانہ ہوگیا۔ اس کے آدمی اس کے پیچھے تھے۔ کم نے اس کے جاتے ہی کہا۔ ''یہ جھوٹ کہہ رہا ہے، حملہ اس کے آدمیوں نے کیا ہے اسے جواب دینا ہوگا۔''

''نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا، اتنے آدمیوں کے ساتھ اسے چھپ کر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اندر آکر بھی میرا خاتمہ کرسکتا تھا۔''

کم سوچ میں پڑ گئی تھی۔ لی کوائے بھی سوچ رہا تھا کہ اس کی جان کا ایسا کون سا گاہک تھا جو جیل سے باہر آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گیا۔ جواب بھی موجود تھا۔ جن لوگوں نے فینگ من کو قتل کیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس راز سے پردہ اٹھے۔ اس لیے وہ بہرصورت راز کھلنے سے پہلے اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ لی کوائے نے کم سے کہا۔ ''اب میں پہلے پولیس چیف سے ملوں گا۔''

☆☆☆

پولیس چیف کورے ماؤ جوان آدمی تھا۔ وہ ذہین بھی تھا ورنہ اتنی جلدی اس عہدے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے لمبے بال جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ وہ گرم جوشی اور خلوص سے لی کوائے سے ملا۔ حالانکہ ماشی زو نے لی کوائے کو جیل سے بلوا کر ایک طرح سے اسے نااہل قرار دیا تھا۔ لی کوائے نے کہا۔ ''دوست، میں تمہارے تفتیشی عمل میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا لیکن تمہیں بھی میری مدد کرنا ہوگی۔''

''میں تمہاری ہر مدد کے لیے حاضر ہوں۔'' کورے

نے اسے یقین دلایا۔ اس نے لی کوائے کو تفتیش کے نتائج سے آگاہ کیا۔ سرکاری کیمیا دانوں نے جلی ہڈیوں کا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ آگ کا آغاز اندر سے ہوا تھا۔ ہڈیوں کا فاسفورس کسی وجہ سے جل اٹھا تھا اور اس نے فینگ من کے پورے جسم کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔ ماہر کھوج نہیں لگا سکے تھے لیکن ان کا شبہ تھا کہ موت کسی انوکھی طرز کے زہر سے ہوئی تھی۔ جسم میں جانے کے بعد یہ زہر کسی طرح سے فاسفورس کو جلا دیتا تھا اور جسم بھی جل جاتا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ فینگ من کو ختم ہونے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ اس کے جسم کی باقیات موقع پر موجود تھیں اور وہاں کورے کے آدمی پہرا دے رہے تھے۔ لی کوائے، کورے کے ساتھ 'بدھا کے مجسمے کے اندر پہنچا تو وہاں کام بدستور جاری تھا اسے بعد میں پتا چلا کہ فینگ من کے مرنے کے بعد کام ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکا تھا اور جب تک ملکہ ماشی زو کی طرف سے نئے انچارج کا اعلان نہ ہوتا چیف سپروائزر کائی منک عارضی انچارج تھا۔ کورے ماؤ کو دیکھ کر کائی منک دوڑا چلا آیا پھر وہ لی کوائے کو دیکھ کر چونکا اور بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور اس کے گلے لگ گیا۔

''لی، یہ تم ہو میرے دوست... میں نے سوچا بھی نہیں تھا، اس زندگی میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔''

''مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ تم ہی یہاں کے چیف سپروائزر اور بدھا کے آرکیٹیکٹ ہو۔''

کورے ماؤ نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟''

''ہاں، ہم بچپن کے دوست ہیں۔'' لی کوائے نے بتایا۔ ''ہم نے ایک ہی درس گاہ سے تعلیم حاصل کی ہے۔''

کائی منک نے فینگ من کے جل جانے کا واقعہ سنایا۔ ''میں ایک ضروری مشورہ کرنے فینگ من کے پاس آیا تھا لیکن وہ اس وقت معتمد خاص کے ساتھ تھا، اس نے مجھے ٹال دیا' میں لفٹ سے واپس جا رہا تھا جب میں نے فینگ من کو بدھا کی آنکھ میں جلتے دیکھا۔ وہ بس ایک جھلک تھی پھر لفٹ نیچے چلی گئی۔''

''اس حادثے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' لی کوائے نے پوچھا۔ ''یہاں دوسرے کارکن کیا کہتے ہیں؟''

کائی منک ہچکچایا۔ ''کارکنوں کا خیال ہے کہ فینگ کو بدھا کی طرف سے سزا ملی ہے۔''

''سزا، وہ کیوں...؟''

''وہ بدھا کو نہیں مانتا تھا، اس کا مذاق اڑاتا تھا۔''

گفتگو کے دوران کورے بہ دستور مشکوک نظروں سے کائی منک کی طرف دیکھ رہا تھا، اچانک اس نے جھپٹ کر کائی کا ہاتھ پکڑ لیا جو اس کے کرتے کی آستین کے اندر تھا۔ ''کیا ہے تمہارے اس ہاتھ میں' تم چھپا کیوں رہے ہو؟'' کورے نے کہتے ہوئے آستین الٹ دی۔ وہ اور لی کوائے ششدر رہ گئے کیونکہ کائی منک کے ہاتھ کی جگہ دھات اور چمڑے کے خول کے اوپر بنا ایک ہک نما آلہ تھا۔ کلائی کے اوپر سے اس کا بازو غائب تھا۔ کورے نے جھٹکے سے دھاتی خول اتار دیا، اندر کائی منک کی کٹی کلائی تھی اور اس پر ایک نمبر ٹیٹو کی مدد سے کھدا ہوا تھا۔

''یہ کیا، تم سزا یافتہ قیدی ہو؟'' کورے درشت لہجے میں بولا۔ ''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' کائی منک سہم گیا۔ ''ویسے عظیم ملکہ جانتی ہیں میں سزا یافتہ ہوں۔ میری کلائی کاٹنے کے بعد مجھے آٹھ سال جیل میں بھی گزارنے پڑے تھے۔ پھر مجھے رہائی ملی تو میں اس کام پر آگیا۔ عظیم ملکہ کو میرا ڈیزائن کیا ہوا مجسمہ پسند آیا اور اس نے مجھے چیف سپروائزر اور چیف آرکیٹیکٹ بنا دیا۔ صرف سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے میں اس منصوبے کا انچارج نہیں بن سکا تھا۔''

''مجھے افسوس ہے دوست۔'' لی کوائے نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''تم جا کر اپنا کام کرو۔''

کائی منک وہاں سے چلا گیا تو کورے اور لی کوائے لفٹ سے مجسمے کے اوپری حصے میں روانہ ہوئے۔ مجسمے کو اندر سے دیکھ کر لی کوائے کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ کتنا بڑا کام ہے۔ اس پر یقیناً کثیر سرمایہ خرچ ہو رہا تھا مجسمے کا جسم ایسی فولادی پلیٹوں سے تیار کیا گیا تھا جنہیں مٹی کی ڈائی میں پگھلا فولاد ڈال کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ سارا کام ہنرمندی اور محنت والا تھا، اس میں ذرا سی غلطی پورے مجسمے کو کمزور کرسکتی تھی۔ وہ مجسمے کے سر میں پہنچے تو وہاں فینگ من کی باقیات ایک میز پر سجی ہوئی تھیں۔ لی کوائے نے انہیں قریب سے چھوئے بغیر دیکھا۔ واقعی ہڈیاں یوں کھوکھلی ہو رہی تھیں جیسے وہ اندر سے جلی ہوں۔ لی کوائے جانتا تھا فاسفورس کی آگ کتنی شدید ہوتی ہے، یہ پتھر اور دھات کو بھی چاٹ جاتی ہے، انسانی جسم اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہڈیوں سے جلے بارود جیسی بو آرہی تھی جو فاسفورس کی نشانی تھی۔ کورے نے تنہائی پاتے ہی اس سے کہا۔

"مجھے لگ رہا ہے یہ یہیں کے کسی شخص کا کام ہے۔"

لی کوائے نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس طرح سے قتل کرنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

کورے نے اس سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ لی کوائے اس کے ساتھ کچھ دیر وہاں رکا تھا۔ اس نے مجسمے کی تعمیر کا جائزہ لیا اور کارکنوں سے الگ الگ سوال کرتا رہا۔ اس کے سوال بھی عجیب نوعیت کے تھے، وہ کارکنوں سے ان کے جذبات پوچھ رہا تھا اور یہ کہ وہ یہاں کام سے اور اس کے معاوضے سے مطمئن ہیں یا نہیں۔ کورے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے یہ سب گراں گزر رہا تھا اور وہ اسے وقت کا زیاں سمجھ رہا تھا۔ مگر لی کوائے کی حیثیت اس سے زیادہ تھی اس لیے وہ مجبور تھا۔ واپسی کے سفر میں لی کوائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے کورے سے کہا۔ "سنو ہمیں شہر سے باہر جانا ہے۔"

کورے دنگ رہ گیا۔ "شہر سے باہر کیوں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" لی کوائے نے کہا اور گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔ مجبوراً کورے نے بھی اس کی تقلید کی اور دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا ہوا پیچھے گھوڑا دوڑانے لگا۔ وہ مرکزی شاہراہ سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر آئے۔ شہر کی فصیل سے نکل کر لی کوائے نے گھوڑے کا رخ شمال کی طرف موڑ دیا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں داخل ہوئے۔ لی کوائے ایک چھوٹے سے خستہ حال مکان کے سامنے رکا۔ کورے نے پوچھا۔ "یہاں کون رہتا ہے؟"

"ایک مکار شخص جیری یونگ۔" لی کوائے نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا اور مکان کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ایک سالخوردہ بوڑھے نے دروازہ کھولا۔ اس نے پھٹا پرانا جبہ پہن رکھا تھا۔ اس نے لی کوائے کو دیکھتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران میں وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ کورے اس کے پیچھے تھا۔ جیری بہت بوڑھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں زندگی کی حرص کی مکاری موجود تھی۔ لی کوائے کے اندر آتے ہی وہ اس کے آگے جھک گیا۔

"ماسٹر کوائے میری بوڑھی آنکھیں کتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ رہی ہیں۔"

لی کوائے نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "ممکن ہے تمہاری آنکھیں آخری بار کسی کو دیکھ رہی ہوں۔"

جیری ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور گھٹی آواز میں بولا۔ "ماسٹر میرا قصور؟"

اس چھوٹے سے مکان میں عجیب و غریب چیزوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ان میں حنوط شدہ جانور اور پرندے، دیواروں پر آویزاں جانوروں کی ہڈیاں اور کھالیں، مرتبانوں میں بے شمار اقسام کی چیزیں اور ایسا کاٹھ کباڑ جو بہ ظاہر کسی کام کا نہیں لگتا تھا۔ لی کوائے نے سرد لہجے میں کہا۔ "بدھا کے مجسمے کی تعمیر کا نگران فینگ من اچانک اندر سے لگنے والی آگ میں جل مرا۔"

جیری دکھاوے کا شور مچا رہا تھا۔ نہ وہ اتنا ناتواں تھا اور نہ لی کوائے نے اتنی سختی سے اس کی گردن دبائی تھی۔ اس نے انجان بن کر کہا۔ "اچھا، میں نے اس بارے میں سنا ہے۔"

"صرف سنا ہے ...... کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کس طرح مرا؟"

"میں ...؟ کیسے جان سکتا ہوں؟"

"ٹھیک ہے تم فینگ من کے بارے میں نہیں جانتے۔" کورے نے کہا اور اچانک اپنی تلوار نکال کر اس کی نوک جیری کی گردن پر رکھ دی۔ "مگر اپنی موت کے بارے میں ضرور جان جاؤ گے۔"

جیری کی آنکھوں میں دہشت نظر آنے لگی۔ وہ کورے ماؤ کو جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ کوئی اس سے جیری کے خون کا حساب طلب نہیں کرے گا۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔ "اسے ہٹا لو... میں سچ کہتا ہوں میں نہیں جانتا لیکن ایک جگہ سے تمہیں پتا چل سکتا ہے۔"

"کون سی جگہ ہے؟"

"تاریک بازار۔" بوڑھے جیری نے جواب دیا۔ "وہاں میکناؤ کا پوچھ لینا۔"

کورے نے تلوار پیچھے کر لی اور غرا کر بولا۔ "خبیث بڈھے، اگر تیری بات درست نہ نکلی تو اپنی قبر خود کھود کر ہماری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"میں نے سچ کہا ہے ماسٹر۔" جیری اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی جان چھوٹنے پر خوش نظر آ رہا تھا مگر لی کوائے کے سوال نے اس کی خوشی چھین لی۔

"ہم میکناؤ سے کیا معلوم کر سکتے ہیں؟"

"یہ... یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" اس نے بدک کر کہا لیکن جب لی کوائے کا ہاتھ اور کورے کی تلوار اس کی گردن کی طرف بڑھی تو اسے اگلنا ہی پڑا تھا۔ "اچھا رکو بتاتا ہوں... تم اس سے آتشیں بچھوے کے بارے میں پوچھنا۔"

"آتشیں بچھوا... یہ کیا چیز ہے؟"

"میں نہیں جانتا لیکن میں نے اس کے بارے میں سنا ہے۔ صحیح تمہیں میکناؤ ہی بتا سکتا ہے۔"

لی کوائے نے محسوس کیا کہ جیری واقعی اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے وہ باہر آ گیا۔ کورے نے باہر آتے ہی کہا۔ "تاریک بازار کہاں ہے؟"

لی کوائے نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم نہیں جانتے... بندرگاہ سے مشرق کی طرف ایک کھاڑی ہے جس کے اوپر شائن شی نامی شہر ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"یہ تاریک بازار اسی شہر کے نیچے ہے، اس میں سرنگوں میں سمندر کا پانی موجود رہتا ہے اور بہت سارے لوگ یہاں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ یہاں ہمہ وقت تاریکی رہتی ہے اس لیے اسے تاریک بازار کہتے ہیں۔"

☆☆☆

وہ چاروں کشتی میں شائن شی کی کھاڑی میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ چٹانی ساحل تھا۔ سمندر کے بالکل ساتھ بہت اونچی پہاڑی تھی اور شہر اسی پہاڑی پر آباد تھا۔ سمندر کے پانی نے چٹان کے نچلے حصے کو کاٹ کر کھاڑی کی صورت دے دی تھی اور کسی وجہ سے چٹان کے نیچے بے شمار سرنگیں وجود میں آ گئی تھیں۔ تاریک بازار ان ہی سرنگوں میں تھا۔ یہاں زیادہ تر جرائم پیشہ اور چوری کا مال بیچنے والے بیٹھے تھے اور کسی سرکاری آدمی کا وجود ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کم نے تجویز پیش کی کہ وہ سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر چلتے ہیں جو راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دے گا لیکن لی کوائے نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ "ممکن ہے اس طرح ہم مطلوبہ آدمی تک نہ پہنچ سکیں اور وہ فرار ہو جائے۔ یہ کام صرف خاموشی سے ہو سکتا ہے۔"

اس لیے وہ ایک جنگی جہاز سے ایک کشتی میں سوار ہوئے اور انہوں نے اس طرح کے چوغے پہن رکھے تھے جن سے ان کا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ چوتھا فرد کورے ماؤ کا نائب لی ہان تھا۔ وہ نوجوان اور مستعد آدمی تھا۔ کشتی وہ اور کورے چلا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کھاڑی کے ایک ڈاک پر تھے، یہ ڈاک بھی چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا اور مدوجزر سے نمٹنے کے لیے لکڑی کی اوپر نیچے ہو جانے والی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس وقت پانی چڑھا ہوا تھا اس لیے انہیں اوپر آنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک چوغہ پوش کسی بھوت کی طرح نمودار ہوا اور اس نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ لی کوائے نے اسے ایک سکہ دیا۔

"کشتی کا خیال رکھنا، ہم ابھی آتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں آقا۔"

لی کوائے نے اپنی تھیلی سے ایک سکہ اور نکالا اور یوں رکا جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "شاید تم جانتے ہو میکناؤ کہاں ملے گا؟"

چوغہ پوش کی حریص نظریں چاندی کے سکے پر مرکوز تھیں۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ "میں جانتا ہوں۔"

لیکن اس نے جو پتا بتایا وہ کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ کم نے تجویز پیش کی کہ اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔ چوغہ پوش جانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب لی ہان نے تلوار کے ایک ہی وار سے ڈاک پر نصب بانس کاٹ کر دکھایا تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ نہایت پیچیدہ قسم کی سرنگوں اور راستوں سے گزار کر وہ انہیں ایک بلند جگہ لایا، یہاں ایک گنبد نما ہال تھا جس میں چاروں طرف پتھر کاٹ کر چھجے بنائے گئے تھے اور ان چھجوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی تھیں۔ میکناؤ ان میں سے ایک کوٹھری میں رہتا تھا۔ وہ جیری سے بھی زیادہ بوڑھا اور مکار لگ رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی جس پر اس نے کپڑا باندھ رکھا تھا۔ لی کوائے نے جیری کا حوالہ دیا تو اس نے انہیں اندر آنے کی اجازت دیدی۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ہم آتشیں بچھوؤں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔" لی کوائے بولا۔

میکناؤ چونکا۔ "آتشیں بچھوے... تم ان کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"تم جو جانتے ہو اس بارے میں، وہ سب بتا دو۔" کورے نے بھدے پن سے کہا جس پر لی کوائے نے اسے گھورا۔ پھر اس نے میکناؤ کی طرف دیکھا۔

"تمہیں عظیم بُدھا کے مجسمے میں ہونے والے حادثے کا علم ہے؟"

"نہیں۔" میکناؤ نے انجان بن کر کہا۔ "کیا وہاں کچھ ہوا ہے؟"

لی کوائے نے جان لیا، وہ جھوٹ بول رہا تھا لیکن اس نے تحمل سے جواب دیا۔ "فینگ من جو مجسمے کی تعمیر کا انچارج تھا وہ اچانک ازخود آگ بھڑکنے سے جل کر خاکستر ہو گیا۔"

میکناؤ نے اپنی اکلوتی آنکھ سے ان سب کو دیکھا۔ "تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم ہمیں آتشیں بچھوؤں کے بارے میں بتا سکتے ہو۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں..." میکناؤ بولتے

بولتے رک گیا، اس کی نظر اس تھیلی پر مرکوز ہوگئی جو کم کے ہاتھ میں تھی اور اس کے ہلنے سے کھنکنے کی جو آواز آرہی تھی اس سے صاف پتا چلتا تھا اس میں چاندی کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ کم سرد لہجے میں بولی۔

''میرا خیال ہے تمہیں کچھ یاد آیا ہے۔''

میکناؤ چونکا۔ ''اوہ ... ہاں... ذرا رکنا۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھا اور ایک طرف لگے پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ جب وہ کچھ دیر تک واپس نہیں آیا تو سب سے پہلے لی کوائے کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا، اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو اس کے عقب میں دیوار میں ایک سوراخ دکھائی دیا اور میکناؤ غائب تھا۔ اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''وہ بھاگ گیا ہے۔''

کورے جھپٹ کر پاس آیا۔ پھر اس نے لی کوائے سے کہا۔ ''تم یہاں سے پیچھے جاؤ، میں اور لی ہان سامنے سے جاتے ہیں، وہ بھاگ کر نہیں جا سکے گا۔''

''میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔'' کم نے لی کوائے سے کہا۔ وہ سرنگ میں گھسا، جو بس اتنی تھی کہ اس میں آدمی جھک کر چل سکے۔ یہ سرنگ میکناؤ نے یقیناً کسی ایسے ہی وقت کے لیے چھپا رکھی تھی۔ کم اس کے پیچھے تھی۔ اس نے عقل مندی کی اور آتے ہوئے ایک چھوٹی لالٹین اٹھالی اور اب وہ مکمل تاریکی میں نہیں تھے۔ لی کوائے کو احساس ہوا کہ سرنگ نیچے جا رہی تھی اور بالآخر وہ پانی سے بھری ایک بڑی سرنگ کی چھت تک پہنچ گئے۔ مسئلہ نیچے اترنے کا تھا۔ اسے دیوار کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی دکھائی دی جو دور تھی لیکن لی کوائے لٹک کر اس تک پہنچ گیا اور وہ نیچے اترا تو کم کو پہلے سے موجود پا کر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ ملکہ کی معتمد خاص تھی۔ فنونِ حرب اور مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔

''میرا خیال ہے وہ اس طرف گیا ہوگا۔'' کم نے اشارہ کیا اور وہ دونوں پانی کے ساتھ بنے ہوئے چھجے پر چلنے لگے۔ یہاں پانی اتنا گہرا ضرور تھا کہ اس میں کشتی چل سکتی۔ لی کوائے بہت تیز جا رہا تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ کم اس کے ساتھ نہیں ہے اور وہ اکیلا ہے۔ یہاں کئی سرنگیں آکر ایک بڑی ہال نما جگہ مل رہی تھیں۔ یہاں چھت کو سہارا دینے کے لیے لکڑی کے دیو قامت ستون لگائے گئے تھے۔ ہال میں آتے ہی لی کوائے کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔ وہ محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک سرخ چیز اس پر جھپٹی۔ اگر وہ پھرتی سے کام نہ لیتا تو مارا جاتا۔ حملہ کرنے والا سرخ پوش نہایت پھرتیلا تھا۔ وہ اوپر ستونوں سے آیا اور حملہ کرتے ہی وہیں کہیں غائب ہو گیا۔ اس نے لی کوائے کو تلوار مارنے کی کوشش کی مگر وہ بروقت جھکنے کی وجہ سے بچ گیا۔

اسی لمحے ایک طرف سے ایک کشتی نکلی جسے میکناؤ چلا رہا تھا اور وہ بہت عجلت میں تھا۔ لی کوائے لکڑی کے ستونوں کو پکڑتا اس کی طرف بڑھا تھا کہ سرخ لباس والے نے پھر حملہ کیا۔ اس بار لی کوائے نے جوابی کارروائی کی اور اس کی لات نے سرخ پوش کو پانی کی طرف اچھال دیا مگر حیرت انگیز طور پر وہ پانی میں گرنے کے بجائے قلابازی کھا کر لکڑی کے ایک ستون سے چمٹ گیا اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ یہاں روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ چھت صاف دکھائی دیتی۔ لی کوائے نے یہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ وہ اس سرنگ کی طرف لپکا جس میں میکناؤ غائب ہوا تھا۔ پھر وہ رک گیا۔ میکناؤ کی کشتی رکی ہوئی تھی اور وہ کشتی میں ساکت پڑا تھا کیونکہ لی ہان کی تلوار اس کی گردن سے لگی تھی۔ کورے اس کے پیچھے کھڑا تھا، اس نے کم کے بارے میں پوچھا۔ لی کوائے نے شانے اچکائے۔ ''مجھے نہیں معلوم وہ میرے پیچھے تھی پھر غائب ہوگئی۔''

''کچھ سیاہ پوشوں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی مگر ہم نے دو کو مار گرایا۔'' کورے بولا۔

''کوئی زندہ ہاتھ آیا؟''

''یہ ہے نا۔'' کورے نے میکناؤ کی طرف اشارہ کیا۔

لی کوائے مایوس ہوا تھا سیاہ پوشوں کا نکل جانا اچھا شگون نہیں تھا۔ سرخ پوش بھی یقیناً ان کا ساتھی تھا۔ درحقیقت اسے میکناؤ سے اتنی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ آتشیں کچھوؤں کے بارے میں یقیناً اور لوگ بھی جانتے ہوں گے لیکن سیاہ پوش جو اس کے درپے تھے وہ یقیناً فینگ من کی موت سمیت بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔ کم سامنے سے نمودار ہوئی تھی۔ وہ میکناؤ کو دوبارہ اس کی کوٹھری تک لائے۔ لی کوائے نے ایک رسی کا پھندا بنا کر اسے چھت سے لگے کنڈے سے باندھا اور پھر پھندا میکناؤ کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''اب۔'' لی کوائے سرد لہجے میں بولا۔ ''انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے موت یا زندگی...؟''

''وہ مجھے مار دیں گے۔'' وہ چلایا۔

''کون؟''

''میں نہیں جانتا لیکن وہ ان تمام لوگوں کو ختم کر رہے ہیں جو آتشیں کچھوؤں کے بارے میں جانتے ہیں۔''

''کیا جانتے ہیں؟'' لی کوائے نے پوچھا اور میکناؤ کو ایک اسٹول پر کھڑا کر کے رسی کھینچ لی۔ پھندا اس کے گلے میں فٹ ہو گیا۔

''یہی کہ آتشیں کچھوے منگ ٹیمپل میں پالے جاتے ہیں۔''

لی کوائے نے اسے اسٹول سے اتارا میکناؤ نے ایک قدیم چرمی کتاب نکالی، اس نے اس میں ایک صفحہ نکال کر ان کے سامنے کر دیا، اس پر عجیب سی جونکیں بنی تھیں جن کی پشت کچھوے جیسی تھی۔ میکناؤ نے کہا۔ ''اگر انہیں پانی میں ڈال دیا جائے تو یہ پانی میں اپنا زہر چھوڑتی ہیں اور اگر وہ پانی کوئی انسان پی لے یا اس کے جسم پر ڈال دیا جائے تو یہ زہر سورج کی روشنی پڑتے ہی جسم کی ہڈیوں میں موجود فاسفورس کو جلا دیتا ہے اور انسان خود اپنی آگ میں جل کر مر جاتا ہے۔''

واپسی کے سفر میں وہ بہت محتاط تھے۔ کورے کسی قدر پرجوش تھا، اس کے خیال میں یہ بہت بڑی دریافت تھی لیکن لی کوائے کے خیال میں اصل چیز منگ ٹیمپل تھا جہاں آتشیں کچھوؤں کی پرورش کی جاتی تھی۔ یہ ٹیمپل شہر سے باہر تھا۔ منگ نامی بدھ راہب نے دو سو سال پہلے یہ خانقاہ بنائی تھی اور یہاں بدھ مت کے ساتھ مارشل آرٹ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس بار انہوں نے کم کے اصرار پر محافظ دستہ ساتھ رکھا تھا اس لیے خانقاہ کا سربراہ ان کے ساتھ شرافت سے پیش آیا اور اس نے ان سے پورا تعاون کیا۔ اس نے تصدیق کی کہ آتشیں کچھوے اس خانقاہ میں پالے جاتے تھے لیکن چند سال پہلے یہ سلسلہ ترک کر دیا گیا کیونکہ غلطی سے نہانے کے تالاب میں چند آتشیں کچھوے چلے گئے اور اس تالاب میں نہانے سے پندرہ زیرِ تعلیم بچے جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ کم نے سوال کیا۔

''جب یہ اتنی خطرناک چیز ہے تو اسے کیوں پالا جا رہا تھا؟''

''یہ کیڑے صرف ہمارے پاس تھے۔'' سربراہ نے وضاحت کی۔ ''ہمارا مقصد ان کی نسل برقرار رکھنا تھا لیکن جب بچے مارے گئے تو ہمیں مجبوراً انہیں تلف کرنا پڑا۔''

''تمہیں یقین ہے سارے آتشیں کچھوے تلف کر دیے گئے تھے؟'' لی کوائے نے پوچھا۔ سربراہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''میں نے انہیں خود تلف کیا تھا۔''

اب سوال یہ تھا کہ اگر خانقاہ کے سربراہ نے انہیں خود تلف کیا تھا تو فینگ من کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟

واپسی میں کورے نے لی کوائے سے اتفاق کیا۔ ''یہ کیڑے اب بھی کہیں موجود ہیں۔''

''لیکن کہاں ہیں؟'' کم نے سوال کیا۔

اس کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہیں تھا۔ لی کوائے خاموش اور کسی قدر فکرمند تھا۔ کچھ لوگ اس کے درپے تھے، پہلے انہوں نے اسے سرکاری رہائش گاہ میں مارنے کی کوشش کی اور پھر تاریک بازار میں قتل کرنا چاہا۔ اسے اپنی زندگی کی اتنی پروا نہیں تھی اسے فکر یہ تھی کہ اس کے سپرد جو کام کیا گیا وہ بہرصورت پورا ہو اور صاف لگ رہا تھا کچھ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ حقیقت سے پردہ اٹھے۔ اس کے لیے وہ لی کوائے کو ختم کرنے پر آمادہ تھے۔ تاریک بازار میں حملہ آوروں کی پہلے سے موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس کی نقل و حرکت پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایسا صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ جب لی کوائے کے ساتھیوں میں سے کوئی دشمن سے ملا ہوا ہو۔ اس نے کم یا کورے سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت محتاط تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین تھا جتنا بہ ظاہر نظر آتا تھا۔ یہاں پردے کے پیچھے کوئی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ واپسی کے سفر میں اس نے کم سے کہا۔

''میں ماشی زو سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں عظیم ملکہ تک تمہاری خواہش پہنچا دوں گی۔''

شہر میں داخل ہوتے ہی کم محل کی طرف چلی گئی اور لی کوائے کورے کے ہمراہ اپنی سرکاری رہائش گاہ کی طرف جانے لگا۔ جب وہ رہائش گاہ کے سامنے پہنچا تو بازار والی گلی میں وومنگ اپنے درجنوں مسلح ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ لی کوائے اسے دیکھ کر رک گیا اور پھر اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کورے نے جلدی سے کہا۔ ''یہ عظیم ملکہ کا مخالف ہے اور تمہارا اس سے ملنا کسی صورت درست نہیں ہے۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' لی کوائے نے خشک لہجے میں کہا اور گھوڑے سے اتر کر وومنگ کی طرف بڑھا۔ اس کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف وومنگ سن سکا تھا۔ ''اس طرح بیچ بازار میں مجھے روک کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وومنگ نے جوابی سرگوشی کی۔ ''میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں خبردار ہوں۔''

''وہ کتیا ہے... جیسے ہی اس کا کام نکلے گا وہ تمہیں دوبارہ جیل میں ڈال دے گی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' لی کوائے کا لہجہ بہ دستور خشک تھا۔ ''کیا تم اس کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہے ہو؟''

وومنگ نے شانے جھٹکے۔ ''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے میں اپنی جگہ خود اپنا حکمران ہوں۔''

''تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

وومنگ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ فینگ من کی موت کا معما حل ہو۔''

''وہ میں نہیں ہوں۔''

''مجھے یقین ہے اسی لیے تمہیں محتاط ہونے کا مشورہ دے رہا ہوں۔''

وومنگ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''میرے دوست، میرے دس ہزار سپاہیوں کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ کیا تمہیں معلوم ہے اس نے اپنے شوہر کو بھی زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔'' اس نے کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ لی کوائے نے محسوس کیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار تھا۔ وومنگ کے انکشاف نے اسے ہلا دیا تھا اور اب وہ پہلے سے زیادہ ماشی زو سے ملاقات کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کم صبح سورج نکلنے سے پہلے آ گئی اور اس نے لی کوائے کو مطلع کیا کہ ملکہ اس کی منتظر ہے۔ وہ فوری روانہ ہو گیا۔ ملکہ ماشی زو محل کے ٹیرس میں اس کی منتظر تھی سامنے بُدھا کا مجسمہ کھڑا تھا۔ سورج نمودار ہونے والا تھا اور اس کی روشنی کی پہلی کرنیں بُدھا کے چہرے پر پڑتیں۔ ماشی زو نے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔

''لی کوائے کو خوش آمدید... لیکن کیا تم اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے آئے ہو؟''

''اس کے برعکس میں ابھی بتا نہیں سکتا کہ میں کامیابی کے پاس ہوں۔'' لی کوائے نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''میں آپ سے کچھ سوال کرنے کی اجازت چاہوں گا۔''

''تم مجھ سے سوال کرو گے؟'' ماشی زو کے لہجے میں حقارت تھی۔

''یہ اس معمے کو حل کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔''

ماشی زو سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''تمہیں اجازت ہے۔''

''آپ کے خیال میں آپ نے اپنے مخالفین پر مکمل قابو پا لیا ہے؟''

ماشی زو کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔ ''یہ تو کوئی حکمران نہیں کہہ سکتا... مخالف ایک بھی ہو تو مخالف ہی ہوتا ہے۔''

''میں ایسے مخالفین کی بات کر رہا ہوں جو آپ کے اقتدار کے لیے خطرہ ہوں۔''

''میں نے شمال کے بارے میں کچھ سنا ہے۔''

ماشی زو کا لہجہ مبہم تھا لیکن لی کوائے سمجھ گیا۔ ریاست کا شمالی حصہ ہمیشہ سے باغیوں کا گڑھ رہا تھا۔ وومنگ کا تعلق بھی وہیں سے تھا۔ یہ حصہ ایک اور چینی ریاست سے ملا ہوا تھا جو شروع سے ماشی زو کی ریاست کی دشمن تھی۔ وہ باغیوں کو اکساتی تھی۔ ماشی زو مخالفوں کو سخت سزا دیتی تھی اور پھر انہیں معاف کر دیتی تھی۔ لی کوائے نے اگلا سوال کیا۔

''فینگ من کی موت کے پیچھے آپ کے مخالفوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟''

''شاید... میں یقین سے نہیں کہہ سکتی... اسی معمے کو حل کرنے کے لیے ہی میں نے تمہیں جیل سے نکلوایا ہے۔''

''میں اس عنایت کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔''

لی کوائے نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آپ سابق شہنشاہ پر بھی مہربان تھیں۔''

ماشی زو نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آپ جانتی ہیں، فینگ من کی موت ایک قسم کے زہر سے ہوئی ہے۔ ویسے یہ بے ضرر ہے لیکن اگر اس کا شکار سورج کی روشنی میں چلا جائے تو یہ زہر ہڈیوں کے فاسفورس کو جلا دیتا ہے اور آدمی اپنے اندر کی آگ میں جل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔''

ماشی زو نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اس کے بجائے وہ یک ٹک لی کوائے کو گھورتی رہی۔ ''تم نے شہنشاہ کا حوالہ کیوں دیا؟''

لی کوائے نے سوچا اور سچ بول دیا۔ ''آپ کے مخالفین کا خیال ہے کہ مرحوم شہنشاہ کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔''

''یہ بکواس وومنگ نے کی ہو گی۔'' ماشی زو خلاف توقع مشتعل نہیں ہوئی تھی۔ ''تمہیں معلوم ہے کل رات وہ اپنے گھر میں شطرنج کھیل رہا تھا کہ نامعلوم سمت سے آنے والے تیر نے اس کا کام تمام کر دیا۔''

لی کوائے ہل کر رہ گیا۔ وومنگ کی موت کا خطرہ تو تھا لیکن یہ اتنی جلدی حقیقت بن جائے گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر اسے غصہ آنے لگا۔ ''قتل ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔''

ماشی زو نے ہاتھ اٹھایا۔ ''نتیجہ اخذ کرنے میں جلدی مت کرو۔ یہ قتل میرے اشارے پر نہیں ہوا ہے۔''

لی کوائے نے ماشی زو کی بات کا یقین نہیں کیا تھا اس لیے جب وہ محل سے روانہ ہوا تو بہ دستور غصے میں تھا۔ وہ سیدھا کورے ماؤ کے دفتر پہنچا اور اس نے کورے سے کہا۔ ''کیا تم کئی دن کے لیے میرے ساتھ چل سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ بولا۔ ''کچی بات ہے، تمہارے ساتھ رہ کر میں بہت کچھ سیکھتا رہا ہوں۔''

لی کوائے سوچ میں تھا، اس نے کہا۔ ''دوست، میں تم سے کوئی بات چھپاؤں گا نہیں... ممکن ہے میری تفتیش کے نتائج ماشی زو کو پسند نہ آئیں اور میرے ساتھ تم بھی اس کے عتاب کا شکار ہو جاؤ۔''

کورے نے سر ہلایا۔ ''اس کا خطرہ تو ہمیشہ سے ہے لیکن میں حقیقت تک پہنچنا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔''

''ہمیں شمال کی طرف جانا ہو گا۔ وہاں کچھ ہو رہا ہے، ماشی زو اس سے کسی حد تک باخبر ہے لیکن اس نے ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ ممکن ہے اس میں اس کا کوئی مفاد ہو۔'' لی کوائے نے کہا اور اچانک پوچھا۔ ''تم جانتے ہو سابق شہنشاہ کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟''

کورے جھجکا اور پھر یقین سے عاری لہجے میں بولا۔ ''اسے جگر کا مسئلہ تھا جو بگڑ گیا تھا۔''

''یہ وہ کہانی ہے جو عوام کو سنائی گئی ہے۔''

''میں بھی اس وقت عوام میں تھا۔'' کورے نے دامن بچایا۔

لی کوائے نے گہری سانس لی۔ ''سچی بات ہے کہ میں نے کبھی اس بات پر یقین نہیں کیا۔''

''کیونکہ تم ملکہ کے مخالفوں میں سے تھے۔''

''ہاں شاید اس وجہ سے بھی... لیکن رہائی کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں۔''

''یعنی تم ملکہ کے مخالف نہیں رہے ہو؟''

''اگر شہنشاہ زندہ ہوتا تب بھی لوگ اس کے غلام ہوتے تو اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ایک ملکہ کے غلام ہیں۔ اس نے ملک اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔''

کورے خوش نظر آنے لگا۔ ''دوست، یہ تبدیلی خوش آئند ہے، مجھے امید ہے کہ تم یہ معما حل کر کے ملکہ کی نظروں میں جگہ بنا لو گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم اپنی سابق حیثیت میں بحال کر دیے جاؤ۔''

''شاید۔'' لی کوائے نے بے دلی سے کہا۔ ''ایک بات کا خیال رکھنا یہ سفر خفیہ ہو گا، ہم رات کی تاریکی میں چھپ کر نکلیں گے اور تم کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔''

رات ہوئی تو شہر کے شمالی دروازے سے دو چوغہ پوش گھڑسوار نکلے اور شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ لی کوائے نے اب تک کورے کو اپنی منزل کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کورے نے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''ہمیں شان ہو کے قلعے تک جانا ہے۔''

''شان ہو۔'' کورے نے تعجب سے کہا۔ ''وہ تو ویران پڑا ہے۔''

''ہاں لیکن ایک زمانے میں یہ جگہ باغیوں کا گڑھ ہوتی تھی۔''

شان ہو کا قلعہ شمال کے پہاڑوں کے درمیان واقع تھا اور یہ سرحد سے بس چند میل کے فاصلے پر تھا۔ دو دن کی مسافت پر تھا۔ انہوں اطمینان کر لیا تھا کہ ان کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے اس لیے وہ پہلی رات قیام کر کے بے فکری سے سو گئے تھے۔ اچانک لی کوائے کی آنکھ کھلی اور اس نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان کوئی حرکت ہو رہی ہے، وہ چوکنا ہو گیا۔ اچانک کوئی تیزی سے آگے آیا اور لی کوائے قلابازی کھا کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو کئی تلواریں بیک وقت اس کے جسم میں اتر جاتیں۔ وار کرنے والے پہلی ناکامی کے بعد اس کی طرف لپکے تھے۔ لی کوائے نے اپنی تلوار نکالتے ہوئے چیخ کر کورے کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، وہ اپنی جگہ نہیں تھا، اگرچہ اس کا گھوڑا موجود تھا۔ حملہ آور نصف درجن تھے اور وہ سب ماہر تلوار باز لگ رہے تھے۔

لی کوائے دو ساتھ ملے تنوں والے درختوں کو پشت پر رکھتے ہوئے حملہ آوروں سے نمٹنے لگا۔ وہ تعداد میں زیادہ اور ماہر لڑاکا تھے لیکن اس کی مہارت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ چند منٹ میں ان میں سے تین زخمی ہو چکے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ لی کوائے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اچانک ہی وہ ایک طرف بھاگ نکلے۔ لی کوائے نے ان کا پیچھا کرنے کے بجائے کورے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا سامان موجود تھا لیکن وہ خود غائب تھا۔ اگر حملہ آوروں نے پہلے اسے قتل کیا تھا تب بھی اس کی لاش تو موجود ہونی چاہیے تھی۔ لی کوائے کے ذہن میں شبہ سر اٹھانے لگا۔ کہیں کورے ہی تو دشمنوں کا مخبر نہیں ہے ورنہ اس کے یوں غائب ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اب آرام کا موقع نہیں تھا، وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور شان ہو قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ صبح سے پہلے قلعے کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایک جگہ باندھا اور خود قلعے میں داخل ہو

گیا۔قلعہ کھنڈر.... میں بدل گیا تھا بس اس کی مرکزی عمارت کا ایک حصہ سلامت تھا۔ سورج طلوع ہونے والا تھا۔وہ محتاط انداز میں دبے قدموں چلتا عمارت تک آیا۔ اس نے مرکزی ہال کا دروازہ کھولا تو اسے سامنے مشرق کے رخ پر واقع گیلری میں ایک سرپوش عورت نظر آئی وہ ساکت کھڑی تھی۔ لی کوائے بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا کوئی تار جیسی چیز اس کے پیروں سے ٹکرائی اسی لمحے عورت کے جسم پر موجود کپڑے تیزی سے ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ چند لمحے میں تمام کپڑے اتر گئے تو نیچے سے کورے برآمد ہوا۔ وہ زمین میں گڑے ایک فولادی ستون سے زنجیروں کی مدد سے بندھا ہوا تھا اور اب سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ یہ ٹریپ تھا۔کورے چلایا تو لی کوائے تلوار نکالتا ہوا اس کی طرف بھاگا، اس نے ایک ہی وار سے ایک زنجیر کاٹ دی۔ کورے کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا پھر یہ آگ اس کے چہرے سے نکلنے لگی۔ لی کوائے دیوانہ وار زنجیریں کاٹ رہا تھا لیکن جب تک وہ تمام زنجیریں کاٹتا کورے کے جسم نے یوں آگ پکڑ لی تھی جیسے وہ روئی کا بنا گڈا ہو جسے تیل میں بھگو کر آگ لگا دی گئی ہو۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا اور اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

''لی... بھاگ جاؤ... یہ تمہیں... بھی مار دیں... گے۔''

لی کوائے رک گیا، وہ کورے کو نہیں بچا سکتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کورے وہ کون تھے؟''

''ماشی... ماشی زو... کی...'' اس سے آگے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ آگ نے اس کا جسم خاکستر کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد یہ آگ بھی بجھ گئی اور اب وہاں سوائے راکھ اور جلی ہوئی ہڈیوں کے کچھ نہیں تھا۔ لی کوائے ساکت کھڑا تھا اور اس کے چہرے کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس کا اندازہ تھا کہ اسے شان ہو کے قلعے میں کوئی سراغ ملے گا مگر یہاں کورے اپنی جان سے گیا تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے ماشی زو اور اس کی کسی چیز کا ذکر کیا تھا۔ کیا وہ سیاہ پوشوں کو ملکہ کی فوج قرار دے رہا تھا۔ مگر ماشی زو کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے کورے کی راکھ سمیٹ کر ایک خالی مرتبان میں رکھی اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سامان میں رکھ لیا۔ یہ اس کے وارثوں کا حق تھا۔ پھر وہ سارا دن قلعے اور اس کے آس پاس گھومتا رہا لیکن اسے وہاں کسی انسان کی جھلک تک نظر نہیں آئی۔

اس دن وہ اکیلا تھا اور اسے اب تک کی صورت حال پر غور کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ وومنگ کی موت بتا رہی تھی کہ لی کوائے پر حملوں کے پیچھے وہ نہیں تھا۔ اسی طرح کورے کی موت بھی اشارہ تھا۔ ان لوگوں نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ اپنی تفتیش روک دے ورنہ ایسی ہی موت کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ ماشی زو پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر کورے کے آخری الفاظ نے اس کی شفافیت کو دھندلا دیا تھا۔ لی کوائے اس معمے کے ٹکڑے آپس میں فٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات ہوئی تو وہ قلعے کے اس حصے میں آیا جہاں اس قلعے پر حکومت کرنے والوں کے مجسمے نصب تھے۔ یہاں سناٹا تھا، آسمان پر پورا چاند تھا مگر نیچے تالاب سے اٹھنے والی بھاپ ماحول کو دھندلا رہی تھی۔ وہ ایک مجسمے کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ ایک رات اور یہاں گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے بے شمار مجسمے کھڑے تھے۔ ایک بار اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے ایک مجسمے کے اوپر دوسرا مجسمہ کھڑا نظر آیا۔ لی کوائے بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجسمہ نہیں بلکہ وہی سرخ پوش تھا جس نے اس پر تاریک بازار میں حملہ کیا تھا۔

''تم...؟''

''ہاں لی کوائے۔'' سرخ پوش نے کہا، اس کی آواز کسی قدر بھاری تھی لیکن وہ جوان ہی لگ رہا تھا۔ ''تمہیں خبردار کیا گیا لیکن تم باز نہیں آئے۔''

''ہاں۔'' لی کوائے نے سکون سے کہا۔ ''کیونکہ میں ایک بار پھر تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا تم یہاں ضرور آؤ گے تمہارے سیاہ پوش ساتھیوں سے میں راستے میں مل چکا تھا۔''

سرخ پوش نے قلابازی کھائی اور نیچے اتر آیا، اس کے انداز سے لی کوائے کا شبہ بڑھ گیا تھا۔ ''تم یقیناً موت کے آرزومند ہو۔''

''یہ بات درست ہے کم... میں ہمیشہ سے موت کا آرزومند رہا ہوں۔'' لی کوائے نے کہا تو سرخ پوش لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔

''کیا بک رہے ہو؟''

''کم، تم یہ سب ماشی زو کے اشارے پر کر رہی ہو یا اس کے دشمنوں سے مل گئی ہو۔''

سرخ پوش کم چند لمحے ساکت کھڑی رہی پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ ''تم نے مجھے پہچان لیا؟''

''شک تو اسی دن ہو گیا تھا جب تم نے تاریک بازار میں مجھ پر حملہ کیا، آج بات کر کے تم نے تصدیق کر دی۔''

کم کا حسین چہرہ تن گیا اور اس کی سیاہ آنکھوں میں غصہ چمکنے لگا۔ ''مگر تم یہ بات کسی کو بتانے کے لیے زندہ نہیں

رہو گے۔''

''کسے...؟ کیا ملکہ ماشی زو کو؟''

کم نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اچانک تلوار کی نیام اس کی طرف گھمائی۔ نیام سے ایک سفوف نما چیز نکلی اور لی کوائے کے چہرے تک آئی، اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتا، وہ سانس لے چکا تھا اور یہ سفوف نما چیز سانس کے ساتھ اس کے جسم میں اتر گئی۔ لی کوائے کو جھٹکا لگا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لیے اندھیرا آ گیا۔ یہ خواب آور سفوف تھا جو اس کے جسم میں اتر گیا تھا اور اس کا اثر لازمی تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور تیزی سے پیچھے ہٹا۔ کم نے اس پر تلوار سے وار کیا تھا۔ وہ ماشی زو کی معتمد خاص تھی اور اس نے اس فن کے ماہر ترین استادوں سے تربیت حاصل کی تھی، اس کی مہارت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اندھیرا چھٹا تو لی کوائے کم کے وار اپنی تلوار سے روکنے لگا۔ کم کے تاثرات نہایت خوفناک ہو رہے تھے اور وہ بجلی کی طرح لپک لپک کر وار کر رہی تھی۔ لی کوائے چکراتے ذہن کے ساتھ نہایت مشکل سے خود کو بچا رہا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری تھی ورنہ زندگی ہار جاتا۔ ایک بار اس نے کم کی تلوار کو اس طرح اپنی تلوار پر روکا کہ کم کی تلوار چھناکے سے دو ٹکڑے ہو گئی۔ اب وہ اس کے سامنے آدھی تلوار لیے کھڑی تھی لیکن لی کوائے نے اس پر وار نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے اپنی تلوار نیچے کر لی۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

جواب میں کم نے اچانک ہی ٹوٹی تلوار اس کے سینے میں اتار دی۔ لی کوائے لڑکھڑا کر پیچھے گرا تو کم اس پر چھا گئی۔ لی کوائے نے ڈوبتی آنکھوں سے اس کے ہاتھ میں اس کی تلوار کا ٹوٹ جانے والا حصہ دیکھا جسے وہ اس کے دل میں اتارنے جا رہی تھی اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ کم اس کے سینے پر سوار تھی اور لی کوائے بے بسی سے اس کے سامنے پڑا تھا۔ کم نے ایک کربناک چیخ کے ساتھ ہاتھ گھمایا لیکن ٹوٹی تلوار کو لی کوائے کے سینے کے بجائے زمین میں اتار دیا۔ لی کوائے کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ایک لمحے کو بھی نہ ہچکچاتی مگر لی کوائے کے معاملے میں اس کے اندر کی عورت نے ہار مان لی تھی۔ وہ رو دی تھی پھر اس نے لی کوائے کے شانے میں اتری اپنی ٹوٹی تلوار کھینچ کر نکالی اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔

☆☆☆

لی کوائے کو ہوش آیا تو وہ اجنبی جگہ زمین پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی کم بے سدھ پڑی تھی۔ پہلے وہ سمجھا کہ وہ سو رہی ہے لیکن اچانک لی کوائے کو احساس ہوا کہ اس کا سرخ لباس اصل میں خون میں بھیگا ہوا ہے۔ لی کوائے نے

کوشش

جج۔ ''تمہارے بے شمار جرائم کے واضح اور قطعی ثبوت مل جانے کے بعد میں تمہیں مجموعی طور پر سو سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔''

مجرم۔ ''سو سال قید بامشقت! اتنے طویل عرصے تک تو میں زندہ بھی نہیں رہ سکوں گا۔''

جج۔ ''مگر اپنی سی کوشش تو کر ہی سکتے ہو۔''

بے تابی سے اس کی نبض دیکھی وہ چل رہی تھی۔ کم کراہی اور آہستہ سے بولی۔ ''میں ابھی زندہ ہوں۔''

''کیا میں نے تمہیں زخمی کیا ہے؟'' لی کوائے نے اس کے زخموں کو دیکھتے ہوئے کہا اور یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ بائیں طرف بغل میں ایک زخم عین دل کے اوپر تھا۔ اس کے علاوہ بھی زخم تھے لیکن معمولی نوعیت کے تھے۔ کم کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ لی کوائے نے سوال جواب میں وقت ضائع نہیں کیا اور گھوڑا لے آیا۔ اس نے کم کو سینے سے لگا کر کپڑے کی مدد سے خود سے باندھ لیا تاکہ وہ گرے نہیں اور فوری روانہ ہو گیا۔ راستے میں کم نے اسے بتایا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے قتل نہ کر سکی تھی۔ وہ اسے لے کر دارالحکومت کی طرف روانہ ہوئی لیکن جب وہ دارالحکومت کے پاس پہنچی تو سیاہ پوشوں نے حملہ کر دیا۔ وہ لی کوائے کو مارنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن انہوں نے کم کو شدید زخمی ضرور کر دیا تھا، اپنے کئی ساتھی گنوانے کے بعد بالآخر وہ ہمیشہ کی طرح بھاگ نکلے۔

''تو سیاہ پوش اصل میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں؟''

''نہیں... لیکن تمہارے دشمن سب ہیں۔'' کم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی تمہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم جانتے ہو، میں تمہارے پیچھے کیوں آئی؟... کیونکہ ماشی زو نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہیں قتل کر دوں، اس سے پہلے کہ تم اس کے دشمنوں سے جا ملو۔''

''تم صرف ملکہ کے حکم پر مجھے قتل کرنا چاہتی تھیں؟''

''نہیں... میں نہیں چاہتی تھی کہ تم فینگ من کی موت کا معما حل کرو۔''

''تم ماشی زو کے دشمنوں سے مل گئی ہو؟''

''میں ماشی زو کے کسی دشمن سے نہیں ملی ہوں لیکن

میں اسے زندہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے سارے خاندان اور پورے گاؤں کی قاتل ماشی زو ہے۔"

"وہ ایک حکمران ہے۔" لی کوائے نے نرمی سے کہا۔ "ہر حکمران اپنے مخالفوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔"

کم کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ لی کوائے کی بات سے متفق ہے۔ کورے یقیناً اسے ماشی زو کی معتمد خاص کے بارے میں بتانے جا رہا تھا لیکن موت نے اسے مہلت نہیں دی تھی۔ کم نے آہستہ سے کہا۔ "سنو تم مجھے شہر کے پاس چھوڑ کر چلے جاؤ، اگر تم شہر گئے تو ملکہ کے آدمی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں شہر جاؤں گا اور اس معمے کو حل کروں گا۔" لی کوائے نے قطعی لہجے میں کہا۔ "میں ڈر کر میدان چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

دارالحکومت میں داخل ہونے سے پہلے لی کوائے نے ایک چادر اپنے اور کم کے گرد لپیٹ لی تاکہ کوئی انہیں شناخت نہ کر سکے۔ یوں بھی ابھی صبح کا اندھیرا تھا۔ محل کے پاس آ کر وہ گھوڑے سے اترا اور اس نے کم کو یوں گھوڑے پر لٹا دیا کہ وہ گر نہ سکے۔ وہ آخری دموں پر لگ رہی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ ماشی زو سے کچھ باتیں کر سکے۔ لی کوائے نے گھوڑے کو تھپکی دی تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے کم سے پوچھا نہیں کہ اس نے اسے کیوں قتل نہیں کیا۔ گھوڑا محل کے سامنے پہنچا اور محافظوں نے اسے دیکھ لیا تو لی کوائے تیزی سے ایک طرف چل پڑا تھا۔ اس کے پاس مہلت کم تھی، اسے آج ہی یہ معما حل کرنا تھا۔

ماشی زو کو خادماؤں نے اطلاع دی کہ کم شدید زخمی حالت میں محل کی سیڑھیوں پر پائی گئی ہے۔ اس دوران میں کچھ خادمائیں کم کو اٹھا کر اندر لے آئیں۔ ماشی زو نے بے تابی سے اسے دیکھا اور پھر زخموں کی نوعیت سمجھتے ہی چیخ کر طبیب کو بلانے اور سب لوگوں کو دور جانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کم کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور لرزتی آواز میں بولی۔ "یہ کیسے ہوا؟"

"لی کوائے کو بچاتے ہوئے۔" کم نے سچ بول دیا۔

"وہ زندہ ہے؟"

کم نے سر ہلایا۔ "میری ملکہ، میں شرمندہ ہوں میں اسے نہیں مار سکی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔"

"میری ملکہ میں ایک سوال کر سکتی ہوں؟"

ماشی زو جانتی تھی جو لڑکی اس کی آغوش میں دم توڑ رہی تھی اس کے سارے خاندان کی قاتل وہ تھی اور پھر اس نے بہت خلوص سے اس لڑکی کی پرورش کی تھی، وہ اس سے محبت کرتی تھی اور آج یہ محبت ملکہ کی پتھر آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا تو کم نے کہا۔

"آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟"

"ہاں میری بچی!" ملکہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ "اور میں نے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کی... تمہاری طرح... فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے محبوب کی خاطر جان دیدی اور میں نے اقتدار تک پہنچنے کے لیے محبوب کی جان لے لی۔"

"میری ملکہ ایک التجا ہے..."

ماشی زو سمجھ گئی۔ "تم فکر مت کرو میری بچی، لی کوائے اب میری ذمے داری ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

یہ سن کر کم نے سکون سے جان دیدی تھی۔

☆☆☆

بدھا کے مجسمے کی آنکھ میں کائی منک کھڑا ہوا ملکہ ماشی زو کے محل کی طرف دیکھ رہا تھا جو مجسمے سے بہت نیچے کسی کھلونے جیسا لگ رہا تھا۔ کائی منک کے چہرے پر اس وقت نرم اور دبے ہوئے تاثرات نہیں تھے، وہ بڑی خشمگیں نظروں سے محل کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اسے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لی کوائے سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے اوپر آنے کے لیے لفٹ استعمال نہیں کی تھی۔ کائی منک اس کے تاثرات دیکھتے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ "میرے دوست، تم اچانک..."

"ہاں مجھے اچانک آنا پڑا۔" لی کوائے نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ کائی کی طرف بڑھا تو وہ اس سے دور ہونے لگا۔ "میں نے جان لیا ہے کہ فینگ من کو کس طرح زہر دیا گیا۔ یہ زہر اسے اس پانی میں دیا گیا تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اور زہر دینے والے تم تھے۔" لی کوائے نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

"یہ بھی درست ہے۔" کائی منک بدستور اس سے دور ہٹتے ہوئے بولا اور لی کوائے نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔

"ہم زہر کے چکر میں پڑ گئے اور اس کی کھوج کے لیے مارے مارے پھرتے رہے حالانکہ اصل کام تو یہاں ہو رہا ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو؟"

"میرا خیال ہے تم نے مجسمے کی تعمیر میں کوئی نقص چھوڑا ہے ایسا نقص کہ یہ ایک مخصوص وقت پر اچانک گر جائے اور کہاں گرے گا...؟ عین شاہی محل پر، یہاں سے شاہی محل کا فاصلہ اتنا ہے کہ مجسمہ پورے محل کو تباہ کر سکتا ہے۔"

"کس موقعے پر گرے گا؟" کائی منک نے سرد لہجے

میں پوچھا۔
''ظاہر ہے..... جب ملکہ ماشی زو کی تاجپوشی کی سالگرہ منائی جارہی ہوگی۔''
''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا لیکن اب میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتا۔ مجھے خطرہ تھا کہ تم بالآخر حقیقت تک پہنچ جاؤ گے اس لیے میں نے یہ کام جلد نمٹانے کا فیصلہ کیا ہے ذرا نیچے دیکھو۔''
لی کوائے نے نیچے جھانکا تو اسے فولاد پگھلانے والی بھٹی سے نالی میں پگھلا فولاد بہتا ہوا، مجسمے کے وسطی ستون کی بنیاد کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اچانک اسے حرکت کا احساس ہوا، کائی منک بھاگتا ہوا لفٹ میں گھس گیا تھا اور اب لفٹ نیچے جارہی تھی۔ لی کوائے نے آس پاس دیکھا، مشرقی زیر تعمیر ستون کو سہارا دینے کے لیے بانس کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ شانے کے زخم کی پروا کیے بغیر اس جال کی مدد سے نیچے اترنے لگا۔ کائی منک نیچے جاتے ہوئے تلوار کی مدد سے بانسوں کے جال کو سہارا دینے والی رسیاں کاٹ رہا تھا۔ بانس ہلنے لگے تھے۔ لی کوائے ہر ممکن تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ کائی منک نے چلّا کر کہا۔
''تم اسے روک نہیں سکتے۔''
خود لی کوائے بھی محسوس کررہا تھا کہ وہ مجسمے کے انہدام کو نہیں روک سکتا۔ اچانک اوپر سے بے سہارا ہوجانے والے بانس گرے اور وہ ان کے جال میں پھنس گیا، کائی منک نے قہقہہ مارا۔ ''میرے دوست، تمہاری موت یہاں ہوگی۔''
''مجھ پر قاتلانہ حملے تم نے کروائے تھے؟''
''ہاں۔'' کائی منک جنونی انداز میں بولا۔ ''ماشی زو نے مجھے یہ دیا۔'' اس نے کٹے ہاتھ کا ہک اٹھا کر دکھایا۔ ''جواب میں، میں نے اسے اس کے محل میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو میرے راستے میں آیا وہ بھی میرا دشمن تھا اس لیے میں نے اسے راستے سے ہٹادیا۔''
لی کوائے نے اس جال سے نکلنے کا راستہ تلاش کرلیا۔ عارضی لفٹ جو ستون کی بلندی پر پگھلا فولاد لاتی تھی، کچھ نیچے تھی۔ لی کوائے نے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ اب بھی فرش سے کوئی ستر فٹ کی بلندی پر تھا، اس نے کائی منک سے کہا۔ ''میں مجسمے کو گرنے سے نہیں بچا سکتا لیکن یہ وہاں نہیں گرے گا جہاں تم اسے گرانا چاہتے ہو۔'' اس نے کہتے ہوئے وہ رسے کاٹنا شروع کردیے جن سے لفٹ لٹکی ہوئی تھی۔ دوسرا رسا کٹتے ہی لفٹ بے قابو ہوکر تر چھی فرش کی طرف بڑھی اور جیسے ہی فرش قریب آیا، لی کوائے چھلانگ لگا کر لفٹ سے الگ ہوگیا، لفٹ نے لوہے کی اس نالی کو ٹکر ماری جس میں پگھلا ہوا فولاد بہہ کر وسطی ستون کی بنیاد میں جا رہا تھا۔ مغربی ستون ناقص تھا اور مشرقی ستون مکمل نہیں ہوا تھا ایسے میں مجسمہ وسطی ستون پر کھڑا تھا اس کی بنیاد پگھل جاتی تو مجسمہ گر جاتا۔ نالی ٹوٹ جانے سے پگھلا فولاد فرش پر بہنے لگا۔ کائی منک کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ لفٹ سے نکل کر لی کوائے کی طرف جھپٹا۔ اس نے لباس سے ایک خنجر نکال لیا تھا اور اسے دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ کائی منک لڑائی میں تیز نہیں تھا، وہ تعلیم میں تیز تھا لیکن اس نے اپنی تعلیم کو منفی مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ لی کوائے نے سکون سے اس کے وار روکتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تم نے کبھی سوچا ایک عورت سے انتقام لینے کے لیے تم نے کتنے عام لوگوں کی جان لی اور وہ عورت مرجاتی ہے تب بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس کی جگہ ایسا ہی کوئی دوسرا بادشاہ آجائے گا اور وہ بھی سچ بولنے والوں کو جیل میں ڈالے گا یا ان کے ہاتھ کاٹ دے گا۔''
''میں کچھ نہیں جانتا۔'' کائی منک نے چلا کر کہا۔ ''مجھے ماشی زو سے انتقام لینا ہے۔''
اس نے اچانک ہی پاس لٹکی ہوئی کچھ رسیاں کھینچ لیں اور اوپر سے پانی برسنے لگا۔ یہ انتظام حادثاتی طور پر لگنے والی آگ بجھانے کے لیے تھا۔ اچانک پانی کے ساتھ کوئی چیز لی کوائے کی گردن سے ٹکرائی اور وہیں چپک گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ مار کر دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک آتشیں کچھوا تھا۔ اس نے اسے دور پھینک دیا۔ پانی کائی منک پر بھی گرا تھا لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لی کوائے نے جلد خود پر قابو پالیا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ اب سورج کی روشنی میں جانا موت ہوگا۔
''کائی، تم کیا سمجھتے ہو تم کامیاب ہوجاؤ گے... نہیں، کل کوئی دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھے گا۔''
کائی مسکرایا۔ ''کوئی بادشاہ نہیں بیٹھے گا... جلد پڑوسی ریاست کی بیس ہزار فوج یہاں حملہ کرے گی۔ اس کے بعد ریاست کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔''
لی کوائے کے لیے یہ انکشاف فکر انگیز تھا۔ ''لیکن کیوں... یہ وطن تمہارا ہے؟''
''وطن اور ماشی زو۔'' کائی منک نے نفرت سے کہا اور کٹا بازو اٹھا کر دکھایا۔ ''ان دونوں نے مجھے یہ دیا ہے۔''
لی کوائے نے محسوس کیا کہ کائی منک ہوش وحواس کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس سے بحث فضول تھی، اسے ماشی زو کو خبردار

کرنا تھا۔ وہ مجسمے کے دروازے تک آیا تھا کہ اوپر سے عجیب سی گڑگڑاتی آواز آئی۔ اس نے دیکھا چیزیں گر رہی تھیں، مجسمے کی بنیاد کمزور پڑنے سے اس کا ڈھانچا تباہ ہورہا تھا۔ مجسمے کے باہر ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ سورج کی روشنی اوپری مجسمے تک پہنچ گئی تھی لیکن ابھی نیچے میدان میں سایا تھا۔ وہ گھوڑا لے کر شاہی محل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک گھڑسوار کو یوں آتے دیکھ کر محل کے محافظ چوکنا ہوگئے تھے۔ مجسمے کی طرف سے گڑگڑاہٹ سنائی دی تو لی کوائے نے پلٹ کر دیکھا۔ مجسمہ آگے جھک رہا تھا۔ لی کوائے نے چلا کر محافظوں سے کہا۔ ''ملکہ کو محل سے نکالو، مجسمہ گر رہا ہے۔ وہ محل پر گرے گا۔''
شروع میں تو محافظ اس کی بات نہیں سمجھے لیکن پھر گڑگڑاہٹ کی آواز نے انہیں متوجہ کیا اور انہیں گرتا مجسمہ نظر آگیا اس کے بعد وہ لی کوائے کو بھول کر افراتفری میں محل کی طرف بھاگے۔ ماشی زو ٹیرس میں موجود تھی، اس نے کم کو اندر بھجوادیا تھا اور خود اس کا سوگ منا رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ کی آواز اور پھر محافظوں کے شور نے اسے متوجہ کیا۔ بدھا کا مجسمہ گر رہا تھا اور اس کے اوپری حصے کا رخ محل کی طرف تھا۔ وہ اتنی محو ہوئی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب لی کوائے اس تک پہنچ گیا۔ اس وقت مجسمے کا سر الگ ہوکر ٹھیک محل کی طرف آرہا تھا۔ پھر وہ راستے میں ہی دو ٹکڑے ہو گیا۔ چہرے کا خول الگ ہوگیا تھا اور کھوپڑی والا حصہ الگ گر رہا تھا۔ لی کوائے نے اندازہ لگایا کہ کھوپڑی والا حصہ کہاں گرے گا۔ اس کے نیچے خلا تھا اور صرف اسی خلا کے اندر آنے والی چیز بچ سکتی تھی۔ وہ ماشی زو کو کھینچ کر اس طرف لے گیا اور اگلے ہی لمحے ایک خوفناک آواز کے ساتھ مجسمے نے محل کو تباہ کردیا۔ گرد وغبار کا ایک طوفان اُٹھا گرد کی وجہ سے سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا۔ لی کوائے نے ماشی زو کو اپنے جسم کی اوٹ میں چھپالیا تھا اور ملبا اس کے اوپر گرا تھا مگر اسے نقصان نہیں ہوا تھا، یہ سب لکڑی اور دھول مٹی تھی۔ کچھ دیر بعد جب شور اور گرد کا طوفان تھم گیا تو لی کوائے نے اپنے اوپر سے چیزیں ہٹائیں اور ماشی زو کو دیکھا۔
''ملکہ، آپ ٹھیک ہیں؟''
ماشی زو اس افتاد کو بھول گئی تھی۔ ''تم نے مجھے ملکہ کہا ہے؟''
''ہاں میری ملکہ۔'' لی کوائے گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔ ''اب آپ میری ملکہ ہیں کیونکہ آپ اس ملک کی ملکہ ہیں۔ پڑوسی ریاست کی بیس ہزار فوج ہم پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوچکی ہوگی۔''
یہ سنتے ہی ماشی زو کے اندر کا حکمران بیدار ہوگیا۔ اس نے بدھا کے مجسمے اور محل کی تباہی نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سپہ سالار اور فوج کے کمانڈر جنرل آئی زیگ کو طلب کیا اور فوری دفاعی اقدامات کرنے کا حکم دیا۔ اس دوران میں لی کوائے ملبے سے ایک ایسی چادر تلاش کرچکا تھا جس میں وہ خود کو پوری طرح چھپا سکتا تھا۔ ماشی زو جنرل آئی زیگ سے بات کرکے اس کے پاس واپس آئی تھی۔ اس دوران میں فوج کے ایک دستے نے محل کے کمپاؤنڈ کو گھیر کر امدادی کارروائیاں شروع کردی گئی تھیں۔
''تم کہاں جارہے ہو؟''
''جہاں میں زندہ رہ سکوں گا میری ملکہ۔'' لی کوائے نے جواب دیا۔ ''کیونکہ میرے جسم میں بھی وہ زہر آچکا ہے جو سورج کی روشنی پڑتے ہی مجھے جلا ڈالے گا۔''
ماشی زو کے لیے یہ ایک اندوہناک خبر تھی، اس نے لی کوائے کو کم کی موت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اس نے لی کوائے کے لیے زندگی طلب کی تھی۔ ''تم نے مجھے بچا کر احسان کیا لیکن اگر تم ایسا نہ بھی کرتے تب بھی میں کم سے وعدہ کرچکی تھی۔ وہ تم سے...''
لی کوائے نے رخ پھیر لیا۔ ''میں جانتا ہوں میری ملکہ۔''
ماشی زو کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ''تو اب تم چلے جاؤ گے؟''
''ہاں میری ملکہ... تمام سازشی مارے جاچکے ہیں، ان کا سرغنہ کائی منک تھا، وہ آپ سے اپنی سزا کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وومنگ اس کا آلۂ کار تھا لیکن غدار نہیں تھا، اس لیے اسے بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔ فینگ من جان جاتا کہ مجسمے کا مغربی ستون کمزور ہے، اس لیے اسے پہلے نشانہ بنایا گیا۔ مجھے کورے ماؤ کا افسوس ہے اس نے نہایت بہادری سے جان دی اور مجھے سازشیوں کے بارے میں اشارہ دے گیا۔''
''اس کے گھر والوں کو اس کی خدمت کا شایان شان صلہ دیا جائے گا۔''
''میری ملکہ!'' لی کوائے گھٹنوں کے بل جھکا۔ ''مجھے افسوس ہے اب میں اپنے وطن اور عظیم ملکہ کی مزید کوئی خدمت کرنے سے قاصر ہوں۔''
''تم پہلے ہی جو کرچکے ہو وہ کافی سے زیادہ ہے۔'' ماشی زو نے کہا۔
کچھ دیر بعد لی کوائے گھوڑے پر سوار تاریک بازار کی طرف جارہا تھا۔ صرف وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ سورج کی روشنی سے بچ کر رہ سکتا تھا۔

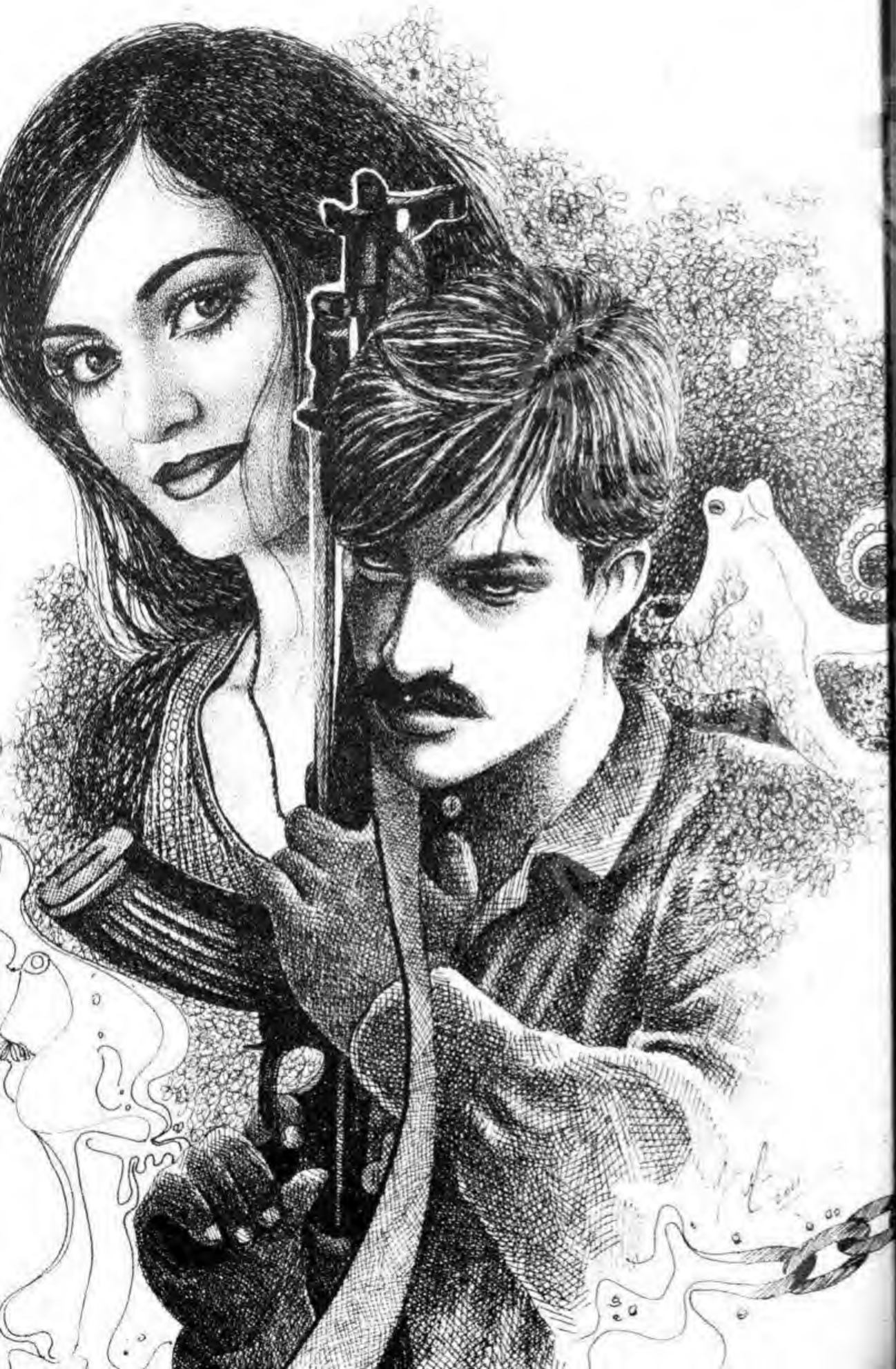

کشکول

انوار صدیقی

اٹھارھویں قسط

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے… جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ… کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ… یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا… زندگی کو برتنے والا یہ انسان… زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم… انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی… محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین… ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر… صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہوگئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دومنزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور

ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کرکے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی ''بلیک ٹائیگر'' تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہوتے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی متقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ''بلیک ٹائیگر'' کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی موی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اورنگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ

لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت کی تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائشی گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا مشورے سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر منتج ہوگی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواست گار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویز دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگزیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار رہا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

شیخ حامد کا ذہن ان سوالوں کو حل کرنے میں الجھتا رہا پھر اس نے اچانک کچھ سوچ کر ایک عرصے بعد ڈی ایس پی لودھی کے نمبر ڈائل کیے، دوسری جانب سے کال فوراً ہی اٹینڈ کی گئی۔

''تابعدار اب بھی آپ کا خادم ہے جناب۔ اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''میں نے سنا ہے کہ دوبارہ تعیناتی کے بعد تمہیں سزا کے طور پر دور دراز علاقے کی ایک ویران ساحلی چوکی پر تعینات کیا گیا ہے جہاں تم مچھیروں کے رحم و کرم پر ہو؟''

''آپ کی اطلاع غلط نہیں ہے لیکن...... میرے ساتھ جو بھی ہوا وہ آپ سے وفاداری نبھانے کا انعام ہی ہے۔'' اس بار قدرے معنی خیز انداز میں جواب ملا۔

''کیا یاد کرانا چاہتے ہو؟'' شیخ حامد نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔

''سوری سر...... میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' لجاجت سے کہا گیا۔ ''میں کل بھی آپ کا پروردہ تھا، آج بھی آپ کی نظرِ کرم کا محتاج ہوں۔''

''میری بات غور سے سنو...... فوری طور پر براہ راست ڈی آئی جی سے رابطہ کر کے کسی ذاتی ضرورت کے تحت دو ماہ کی رخصت کی درخواست کرو۔ میں ابھی آغا منظور سے بات کر لوں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے زیادہ بھونکنے والے کتے پسند نہیں ہیں۔''

لیاقت حسین نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سیٹھ عثمان کا بلاوا آگیا۔ ایک منٹ بعد وہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہیں اب دفتر کے کام میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آرہی؟''

''جب آپ مہربان ہیں تو پھر پریشانی کیسی......؟'' لیاقت حسین نے انکساری سے جواب دیا۔ ''کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔''

''آج تمہارے والد کا فون آیا تھا۔ کاروباری باتوں کے علاوہ میں نے ان سے یہاں آنے کی بھی درخواست کی تھی۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ سردار سرفراز خان نے اس بار میری دعوت قبول کر لی ہے۔ دو ہفتے بعد آنے کا پکا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ تمہاری والدہ بھی ساتھ ہوں گی۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے......''

''تمہارے لیے ایک اہم اطلاع اور بھی ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' سیٹھ عثمان نے بات جاری رکھی۔ ''ابھی سراج کا فون آیا تھا۔ اسے کسی وجہ سے

تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"آپ کا جو حکم ہو....."

"تم جانتے ہو کہ سراج سے ہمارے کتنے قریبی اور گھریلو تعلقات ہیں لیکن اس بار سراج نے تمہارے لیے جو ہدایت دی ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آسکیں۔"

لیاقت حسین جواب دینے کے بجائے سیٹھ عثمان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

"تمہیں آج رات دو بجے کے بعد سینٹرل ٹیلی گراف آفس کے سامنے پہنچنا ہے، وہاں سے تمہیں کوئی شخص سراج کے حوالے سے پک کرلے گا لیکن..... تمہیں کس کام کے لیے اور کتنے دنوں کے لیے جانا ہے اس کی وضاحت نہیں کی۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے.....؟" لیاقت حسین نے کسمسا کر کہا۔ "سراج صاحب کے مجھ پر بھی بہت سارے احسانات ہیں، میں ان کے کسی کام آسکا تو یہ بھی بڑی خوش قسمتی کی بات ہوگی۔"

"ایک اہم بات اور بھی ہے..... تم اس کا کوئی ذکر فرحین سے بھی نہیں کرو گے۔"

"اوہ....." لیاقت حسین نے کچھ توقف سے کہا۔ "میں اچانک اسے بغیر بتائے چلا گیا تو وہ....."

"تم اس کی فکر مت کرو۔" راحیلہ اس کا ہر طرح خیال رکھے گی اور میں..... یہ بہانہ بنا دوں گا کہ میں نے تمہیں کسی فوری ضرورت کے تحت کسی اہم کام کے لیے بھیجا ہے..... اور یہ بھی کہ تمہاری واپسی میں دو چار دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے..... یہ مناسب رہے گا۔" لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے آفس میں آگیا۔ اس کا ذہن بھی سراج کے پیغام کی اہمیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی سراج نے فون پر ہونے والی گفتگو کے دوران کہا تھا کہ ہوسکتا ہے اسے اور اورنگ زیب کو اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ ضرورت کیا تھی کہ جس کے پیش نظر اس قدر احتیاط اور رازداری کے ساتھ اسے براہ راست نہیں بلکہ سیٹھ عثمان کے ذریعے رات کو دو بجے اور فرحین کو مطلع کیے بغیر ایک مخصوص مقام بلایا جارہا تھا؟

رستم علی آغا خانی اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا، اسٹینو کو ایک اہم کاروباری ڈرافٹ لکھوا رہا تھا جب انٹرکام کے بزر نے اس کی توجہ اپنی سمت مبذول کرلی۔

"یس....." اس نے ریسیور اٹھا کر ناگواری کا اظہار کیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اس وقت مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"سوری سر..... لیکن ایس پی مسٹر اورنگ زیب میرے آفس میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے فوری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

رستم علی آغا خانی کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا پھر اس نے ریسپشنسٹ کو ہدایت کی کہ ایس پی کو دو منٹ بعد اندر بھیج دیا جائے۔ انٹرکام کا ریسیور رکھ کر اس نے اسٹینو کو جانے کی ہدایت کی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اورنگ زیب کی آمد کے مقصد کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ایک سیدھا سادا اور صلح پسند کاروباری ہونے کی وجہ سے وہ پولیس سے زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے پچھلی دو ملاقاتوں میں بے حد متاثر کیا تھا اس لیے دو منٹ بعد اورنگ زیب جیسے ہی آفس میں داخل ہوا اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرنے سے گریز بھی نہیں کیا۔

"میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" اورنگ زیب نے بیٹھتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس وقت دراصل مسٹر دارا سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ چونکہ موجود نہیں تھے اس لیے....."

"کیسے ہم غریبوں کا خیال آگیا۔" رستم علی آغا خانی نے بے تکلفی سے کہا۔ "اچھا ہوا جو دارا نہیں تھا ورنہ شاید آپ مجھ سے ملے بغیر ہی چلے جاتے۔"

"میں آپ کے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔"

"خیریت تو ہے.....؟" اس بار وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب کے جواب نے اسے کچھ الجھا دیا تھا۔

"دراصل میں دارا سے براہ راست اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ جو کام درپیش ہے اس میں آپ کو انوالو کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"ایسی کیا بات ہوسکتی ہے؟" رستم علی کی پریشانی اس کے لہجے سے عیاں ہونے لگی۔

"میں اس بات کا قائل ہوں کہ لوہے پر اسی وقت ضرب لگائی جائے جب وہ پوری طرح گرم ہو۔" اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ "اب وہ وقت آگیا ہے اس لیے..... میں چاہتا ہوں کہ جس وجہ سے آپ نے اپنی ملازمہ گلابو کو خاموشی سے علاج کے لیے اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ اب اس کی باقاعدہ شکایت قریبی تھانے میں درج کرادی جائے۔"

"اوہ....." رستم علی کے چہرے پر تشویش کے اثرات گہرے ہونے لگے۔ اس نے کچھ توقف سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کے اس مشورے میں بھی ہماری کوئی بھلائی ہوگی لیکن ایک تو اس بات کو کچھ وقت گزر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں پولیس کے چکروں میں....."

"ون منٹ مسٹر رستم علی۔" اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "میں آپ کے دونوں سوال کا حل پیش کیے دیتا ہوں..... پہلی واردات کو آپ نے اپنے بزنس پوائنٹ آف ویو اور کاروباری ساکھ کو برقرار رکھنے کی خاطر درگزر سے کام لیا تھا لیکن اب کسی نامعلوم شخص نے اسی پچھلے حوالے سے دوبارہ بذریعہ فون کال ایک بڑی رقم فراہم کرنے کو کہا ہے۔ انکار کی صورت میں وہ آپ کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ رہا پولیس کا چکر..... تو میں آپ کو پہلے بھی اپنے تعاون کا پورا یقین دلا چکا ہوں۔ آپ مطمئن رہیں، آپ صرف ملحقہ تھانے میں اپنی خفیہ تحریری شکایت کسی طرح پہنچا دیں۔ تھانے کا کوئی آدمی اس سلسلے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ تھانہ بھی میرے ہی دائرہ اختیار میں ہے۔"

"آپ نے اس سلسلے میں دارا کا انتخاب کیوں کیا تھا؟"

"اس لیے کہ وہ نوجوان ہے اور حالات کو فیس کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر موجود ہے جبکہ آپ بہت زیادہ احتیاط اور دور اندیشی کے پیش نظر کچھ اہم ترین مسئلوں کو بھی روی کی ٹوکری میں ڈال دینے کو بہتر خیال کرتے ہیں۔"

رستم علی نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی آنکھوں کی بدلتی رنگت اس بات کی غمازی کررہی تھی کہ اب وہ "گڑے مردے اکھاڑنے" کے حق میں نہیں تھا۔ کچھ دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھتا رہا پھر دبی زبان میں بولا۔ "آپ کو اندازہ ہوچکا ہے کہ پچھلی پریشانی کا ذمے دار کون تھا۔ تھانے میں رپورٹ درج کرانے کی بات اگر اس کے علم میں آگئی تو..... تو..... آپ بھی جانتے ہیں کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اس کا دوسرا وار ہمارے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"کسی واردات کے سلسلے میں مجرم کے بارے میں صرف قیاس آرائی کافی نہیں ہوتی۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر دنیا کی کوئی عدالت کسی مجرم کو سزا سنانے کی حماقت بھی نہیں کرتی۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں مسٹر اورنگ زیب..... مجھے آپ پر ہر طرح سے پورا پورا اعتماد بھی ہے مگر دریا میں رہ کر مگرمچھ....."

"اوکے....." اورنگ زیب ایک سرد آہ بھر کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر آپ اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتے تو میرے پاس ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کے نام سے ٹائپ شدہ ایک فرضی شکایت بھی درج ہوسکتی ہے جس پر کوئی دستخط نہیں ہوں گے۔ ایسے معاملات میں پولیس بھی بلاوجہ ملوث ہونا پسند نہیں کرتی۔ بغیر کسی حوالے اور دستخط کے جو شکایتیں موصول ہوتی ہیں انہیں زیادہ تر تلف کردیا جاتا ہے، لیکن پولیس مناسب سمجھے تو خفیہ طور پر چھان بین بھی کرسکتی ہے۔" اورنگ زیب نے ایک لمحہ رک کر رستم علی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے؟"

"جی ہاں لیکن..... میں اب بھی یہی درخواست کروں گا کہ اگر آپ....."

"سوری مسٹر رستم علی۔" اورنگ زیب نے پولیس والوں والا انداز اختیار کیا۔ "میں ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہوں جو یہ بات آپ سے بہتر جانتا ہے کہ کس وقت کیا اقدام اٹھانے ضروری ہوتے ہیں۔ میں اب آپ سے اجازت....."

"پلیز مسٹر اورنگ زیب....." رستم علی بڑے کرب کے عالم سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ ناراض نہ ہوں..... اگر آ..... آپ کسی خاص مصلحت کی بنا پر ایسا چاہتے ہیں تو میں انکار بھی نہیں کروں گا۔ آپ جو چاہتے ہیں، میں ویسا ہی کرنے پر تیار ہوں لیکن ایک درخواست کروں گا۔ دارا کو درمیان سے نکال دیں، وہ جوان بھی ہے اور جذباتی بھی..... میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی الجھن میں پڑے۔"

"او۔ کے، ایز یو وش۔" اورنگ زیب دوبارہ بیٹھ گیا۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

"ایک گلاس ٹھنڈا پانی اور اس کے بعد میں جس انداز میں یہاں سے واپس جاؤں گا اس کو آپ کے عملے کے افراد بھی ضرور محسوس کریں گے۔"

"جج..... جی!" رستم علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "اب مجھ سے کیا غلطی ہوگئی جو آپ....."

"پریشان نہ ہوں۔" اورنگ زیب نے مدھم لہجے میں کہا۔ "آپ کو میری درخواست پر ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔"

"وہ..... وہ..... کیا؟"

"میرے یہاں سے جاتے ہی آپ ڈی آئی جی مسٹر آغا منظور سے فون کرکے یہ شکایت کریں گے کہ میں بار بار آپ کو فون کرکے پریشان کرتا رہتا ہوں اور آج آپ کے

[illegible]

***

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہنر سیکھیے بہتر روزگار پایئے

جرمن انسٹی ٹیوٹ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جھوٹ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کیا کر رہی ہوں اس سے کیا کہہ رہا ہوں۔ [illegible]

[illegible]

اس کے بازو میں [illegible] ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سے شعلے نکل رہے تھے [illegible]

[illegible]

وہ مرنے سے پہلے اپنی بھابی پر خون کے دھبے محسوس ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا [illegible]

[illegible] رہے تھے۔

میں [illegible] کے عالم میں وہاں کھڑا رہا اور اپنی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی پھر میں نے چاقو اٹھایا اور اس کی [illegible] آ رہا تھا کہ [illegible] اس وقت میں اس بارے میں [illegible]

[illegible]

میں نے اپنی آنکھیں [illegible]

[illegible] کر دی۔

میرے والد [illegible]

[illegible] لے آئے۔

[illegible]

[illegible] چلی گئی۔

میں پولیس [illegible] انتظار کر رہا تھا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جزائے سزا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"[illegible]" میں نے [illegible]

[illegible]

"آپ [illegible]" اس نے [illegible]

[illegible]

"آپ [illegible]" اس نے [illegible]

انداز میں جواب دیا۔

''پھر کیا تھا؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے ناگواری سے ملزم کی جانب دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ اسے انکل کی گندی ذہنیت سمجھ لیں۔''

''فرض کرو کہ میں نے وہی سمجھ لیا جو تم کہہ رہی ہو لیکن تمہارے سمجھانے اور میرے سمجھ لینے سے بات نہیں بنے گی۔'' میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں معزز عدالت کے سامنے اپنے انکل یعنی اس کیس کے ملزم کی گندی ذہنیت کی وضاحت کرنا ہوگی۔''

شاہدہ نے کن انکھیوں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ وکیل موصوف سے مدد کی طلب گار ہو لیکن اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ کی زبان میں جنبش پیدا ہوتی، میں نے جلدی سے کہا۔

''شاہدہ بی بی، معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ملزم نے کس حوالے سے آپ کو سدھرنے اور سنبھلنے کی تاکید کی تھی۔ آخر آپ لوگوں میں ایسی کون سی خرابی یا برائی تھی؟''

''ہم میں کوئی خرابی یا برائی نہیں تھی۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ''محلے والوں نے انکل کو ہمارے خلاف کر دیا تھا۔''

''کیا خلاف کر دیا تھا؟''

''انکل ہمیں بدکردار سمجھنے لگے تھے۔''

''محلے والوں کو آپ ماں بیٹی سے ایسی کون سی دشمنی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آپ لوگوں کے کردار کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے تھے؟''

''یہ تو آپ انہی سے جا کر پوچھیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا.....''

''محلے والوں کو بھی عدالت میں بلا کر پوچھ گچھ کی جائے گی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اگر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی تو۔'' وہ منتظر نظروں سے مجھے دیکھنے لگی کہ اب میں کون سا سوال کرتا ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ''شاہدہ بی بی، اس کیس کے ملزم یعنی تمہارے انکل یا سوتیلے باپ ریحان کے ساتھ تم لوگ کب سے رہ رہے تھے؟''

''جب سے امی نے انکل سے شادی کی تھی۔''

''میں وہی تو جاننا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری امی سلمٰی اور ریحان کی شادی کب ہوئی تھی؟''

اس نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''اس شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔''

''اور.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ملزم اور تمہاری امی بلکہ تم ماں بیٹی اور ملزم کے درمیان وہ جھگڑا کب ہوا تھا جس میں ملزم نے دو آپشنز استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی؟''

''یہ تو چند روز پہلے کی بات ہے۔'' شاہدہ نے جواب دیا۔

''یعنی اس جھگڑے سے پہلے سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا؟''

''آں ہاں..... نن نہیں.....'' وہ الجھ کر خاموش ہو گئی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''بی بی، وکیل صاحب کے سوال کا ایک جواب دو۔'' جج نے مظلوم شاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں یا نہ؟''

''جی۔'' شاہدہ نے گردن کو اثباتی جنبش دی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جی..... میرا مطلب یہ تھا کہ چند ماہ پہلے بھی انکل نے ہمیں کھری کھری سنائی تھیں۔ وہ پہلا موقع تھا جب انکل کو ہمارے کردار پر شک ہوا تھا۔''

''یہ لگ بھگ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

''تین چار ماہ پہلے۔''

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ سے گھر کی فضا میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اس سے پہلے سب امن و امان تھا؟''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''پچھلے ڈھائی سال میں ملزم، آپ ماں بیٹی کے کردار سے پوری طرح مطمئن تھا؟'' میں نے کہا۔ ''وہ سلمٰی کو ایک وفادار بیوی اور تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا؟''

''جی..... جی ہاں۔''

''شاہدہ بی بی، تم نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے یہ کہا ہے کہ ملزم کی گندی سوچ کے نتیجے میں اس نے تم ماں بیٹی کے کردار کو نشانہ بنایا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کی گندی سوچ کا سبب محلے والوں کا اسے تم ماں بیٹی کے خلاف بھرنا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ محلے والوں کو آپ ماں بیٹی سے کیا دشمنی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ جب تک ملزم کو آپ دونوں کے کردار کے حوالے سے شک نہیں ہوا تھا۔ اس کا رویہ آپ لوگوں کے ساتھ نارمل تھا اور زندگی بڑے آرام و سکون کے ساتھ گزر رہی

تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''شاہدہ بی بی!'' میں نے اپنے لہجے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم تمہیں ہوس بھری نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا تھا؟''

''جب سے انہیں شک ہوا تھا کہ ہم ماں بیٹی کا کردار صاف نہیں۔'' شاہدہ نے جواب دیا۔ ''امی تو ان کی بیوی تھیں، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن وہ جس انداز میں مجھے دیکھتے تھے اسے شریفانہ یا بزرگانہ انداز بالکل نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ایک شیطان کی نظر تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے، ملزم تمہارے لیے بری نیت رکھتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں اس امر کی وضاحت بھی کی ہے کہ تمہارے لیے ملزم کی نیت میں فتور پیدا ہو چکا تھا اور پھر جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے اپنی گندی ذہنیت پر عمل کر ڈالا؟''

''جی ہاں..... یہی حقیقت ہے۔'' اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''اپنی گندی ذہنیت کے ساتھ پانچ چھ ماہ تک انتظار کرنا ملزم کی منصوبہ بندی کا حصہ تھا یا اس سے پہلے اسے موقع نہیں ملا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، اس سے پہلے انہیں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کا موقع نہیں ملا تھا۔'' شاہدہ نے جواب دیا۔

''تم نے ملزم کی بدنیتی کو پانچ چھ ماہ پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے اپنی امی کو اس بارے میں بتا دیا تھا؟''

''جی، ہاں بتا دیا تھا۔''

''یعنی سلمٰی اس بات سے واقف تھی کہ ملزم تمہارے لیے، اپنے دل میں کس قسم کے گندے جذبات رکھتا تھا؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''جی امی کو ایک ایک بات کا پتا تھا۔''

''پھر بھی..... پھر بھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''سلمٰی تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کر اپنی بہن سے ملنے منظور کالونی چلی گئی تھی، کیوں؟''

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی پھر جواب دیا۔ ''امی مجھے یہی بتا کر گئی تھیں کہ وہ سات یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک واپس آ جائیں گی لیکن انہیں آنے میں دیر ہو گئی اور انکل کو اپنی شیطانیت دکھانے کا موقع مل گیا۔''

اتنا کہہ کر شاہدہ نے گردن جھکا لی۔ میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''شاہدہ بی بی، تمہارے اصل یعنی سگے باپ کا کیا نام ہے؟''

''غلام قادر۔'' اس نے جواب دیا پھر ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ میں نے اس سے یہ سوال کیوں کیا تھا۔

''تمہیں غلام قادر سے بچھڑے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کوئی پانچ سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''ساڑھے تیئس سال۔''

''اس کا مطلب ہے جب تم غلام قادر سے جدا ہوئیں تو اس وقت تمہاری عمر کم و بیش ساڑھے اٹھارہ سال تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی..... آپ کا اندازہ درست ہے۔''

''اٹھارہ، ساڑھے اٹھارہ سال اچھی خاصی عمر ہوتی ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اپنے باپ غلام قادر کی شکل تو اچھی طرح یاد ہوگی؟''

''جی ہاں، بالکل یاد ہے۔''

''اگر تمہیں غلام قادر کی تصویر دکھائی جائے تو تم اسے بہ آسانی پہچان لو گی نا؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ ''اس وقت عدالت میں جو کیس سماعت ہے اس کا مظلوم شاہدہ کے باپ غلام قادر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ڈیفنس کونسلر غیر ضروری باتوں میں الجھ کر ایک طرف معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں تو دوسری جانب یہ سیدھی سادی مظلوم شاہدہ کو ہراساں کرنے کی کوشش بھی ہے لہٰذا.....'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں معزز عدالت سے پُرزور استدعا کروں گا کہ وکیل صفائی کو ایسی حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

''بیگ صاحب۔'' وکیل استغاثہ کے اعتراض پر جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''شاہدہ بی بی کے باپ غلام قادر کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق بنتا ہے؟''

''بہت گہرا تعلق جناب عالی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور مناسب وقت آنے پر میں یہ تعلق ثابت کر کے بھی دکھا دوں گا۔''

''اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟'' وکیل استغاثہ

نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
''ہوسکتا ہے، وہ مناسب وقت اگلی پیشی ہی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔
''یہ پیشی کیوں نہیں؟'' سوال وکیل استغاثہ نے کیا تھا لیکن میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے جج کی جانب دیکھا پھر کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد کہنا شروع کیا۔
''جنابِ عالی! ممکن ہے، عدالت ملزم کی بیوی سلمٰی کے ماضی سے واقف نہ ہو۔ سلمٰی کے مطابق، شاہدہ کا باپ قادر ایک اوباش اور شرابی شخص تھا۔ وہ سلمٰی کو زدوکوب کرتا تھا، گالم گلوچ کرتا تھا۔ الغرض، اس نے سلمٰی اور شاہدہ کی زندگی اجیرن کررکھی تھی لہٰذا سلمٰی نے ایک روز اس آوارہ بدمعاش سے جان چھڑالی۔ اس نجات کے ایک سال بعد سلمٰی اور ملزم کی شادی ہوگئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے سلمٰی کے بیان پر یقین نہیں .....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ جو انکشاف ملزم ریحان پر ہوا وہ مبنی برحقیقت ہو یعنی مظلوم شاہدہ اور اس کی ماں سلمٰی واقعی کردار کی صاف نہ ہوں اور اسی بنا پر قادر نے سلمٰی کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا ہو۔ میں نہایت ہی خفیہ انداز میں سلمٰی کے سابق شوہر اور مظلوم شاہدہ کے حقیقی باپ پر تحقیق کررہا ہوں۔ دو چار روز میں قادر کے حوالے سے تمام تر سچ اور جھوٹ مجھے معلوم ہوجائے گا۔ اسی لیے میں نے وکیل استغاثہ کو آیندہ پیشی تک انتظار کا مشورہ دیا ہے۔''
''آپ اپنی تحقیق وتفتیش جاری رکھیں۔'' وکیل استغاثہ برہمی سے بولا۔ ''لیکن کسی تصویر کے ذریعے اپنے والد کی شناخت کیا مذاق ہے؟''
''یہ مذاق نہیں، بہت ہی سنجیدہ معاملہ ہے وکیل صاحب۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس کو اتنا بھی ایزی نہ لیں۔''
''اس میں ایسا کون سا سنجیدہ پہلو ہے جو مجھے نظر نہیں آرہا؟'' وہ تڑخ کر بولا۔
''یہ فی الحال آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔ ''اسی لیے میں نے آپ کو آیندہ پیشی تک انتظار کا مشورہ دیا ہے۔'' وہ معاندانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں مظلوم کی جانب متوجہ ہوگیا۔
''جی شاہدہ بی بی، اگر میں تمہیں قادر کی تصویر دکھاؤں تو کیا تم اسے اپنے باپ کی حیثیت سے پہچان لوگی؟''
''اگر وہ میرے باپ کی تصویر ہوگی تو میں اسے ضرور پہچان لوں گی۔''
''ویری گڈ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
میں نے پوچھا۔ ''شاہدہ بی بی، میں جاننا چاہوں گا کہ وقوعہ کے روز ملزم کے گھر آنے کے بعد سے لے کر تمہارے ساتھ مبینہ ظلم یا زیادتی ہونے تک واقعات کس طرح پیش آئے تھے؟''
اس نے چند لمحات تک آنکھیں بند کرکے گزرے ہوئے واقعات کو ذہن میں مجتمع کرنے کی کوشش کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔
''اس روز میں گھر میں امی کا انتظار کررہی تھی۔ امی نے سات بجے تک واپس آنے کا کہا تھا لیکن جب آٹھ بجے تک بھی وہ واپس نہیں آئیں تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں کچن کے کام میں خود کو مصروف رکھ کر وقت گزارنے لگی۔ نو بجے انکل آگئے۔'' اس نے رک کر ملزم ریحان کی جانب دیکھا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔
''انکل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی امی کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کیا۔ یہ سیدھا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے کچن کا کام ختم کیا اور لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری تشویش بڑھتی چلی گئی کہ امی اب تک واپس کیوں نہیں آئیں۔ کوئی ساڑھے دس بجے انکل نے مجھے آواز دی۔
''شاہدہ بیٹی، ذرا میرے پاس آنا۔'' انکل کا کمرائی وی لاؤنج کے ساتھ ہی ہے۔ میں یہی سمجھی کہ انکل مجھ سے کھانے کے لیے کہیں گے۔ ہم لوگ رات کا کھانا دس بجے تک کھاتے ہیں۔ میں لاؤنج سے اٹھی اور ان کے کمرے میں چلی گئی۔''
''ایک منٹ۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہدہ بی بی، تمہارا بیان ہے کہ ملزم کی تم پر نیت خراب ہوچکی تھی اور یہ اٹھتے بیٹھتے تمہیں ہوس بھری نگاہ سے دیکھا کرتا تھا پھر تم اس کے کمرے میں چلی گئیں جبکہ تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت سلمٰی بھی گھر میں موجود نہیں تھی؟''
''یہ ٹھیک ہے کہ امی کی غیر موجودگی کے باعث مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کئی بار سوچا تھا کہ اٹھ کر پڑوس میں چلی جاؤں لیکن پھر اس خیال سے میں اپنے ارادے پر عمل کرنے سے باز آگئی کہ انکل نے پہلے ہی ہمیں کافی برا سمجھ

رکھا ہے۔ امی پہلے ہی گھر میں موجود نہیں تھیں۔ میں بھی پڑوس میں چلی جاتی تو ہمارے خلاف کیس اور بھی مضبوط ہوجاتا کہ ہمارا تو گھر کے اندر دل ہی نہیں لگتا پھر.....'' وہ سانس درست کرنے کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''پھر انکل نے اتنے پیار سے مجھے شاہدہ بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ چند لمحات کے لیے میرے ذہن سے سارے اندیشے اور خوف جاتا رہا۔ میں بے دھڑک ان کے کمرے میں چلی گئی اور پوچھا۔
''کھانا لے آؤں؟''
''کھانا نہیں، مجھے اس وقت بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس ہورہی ہے۔'' انکل نے کہا۔ ''میرے سر میں درد ہورہا ہے۔ اگر ایک کپ چائے.....''
''ٹھیک ہے، میں چائے لادیتی ہوں۔'' میں نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا اور کمرے سے نکل گئی۔
تھوڑی دیر کے بعد میں نے چائے بنا کر ان کے کمرے میں رکھ دی۔ لگ بھگ گیارہ بجے انہوں نے مجھے دوبارہ آواز دے کر اپنے پاس بلالیا۔ میں سمجھی، چائے کے برتن اٹھانے کے لیے کہہ رہے ہوں گے۔ میں کمرے میں پہنچی تو انہوں نے چائے کے برتن والی ٹرے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
''شاہدہ بیٹی، یہ ٹرے کچن میں رکھ کر میرے پاس آجاؤ۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
یہ بہ دستور محبت بھرے انداز میں بولے۔ ''گھبراؤ نہیں، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ میں نے اس رات تم سے اور سلمٰی سے جو کچھ بھی کہا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ تم دونوں کردار کی صاف وشفاف ہو۔ میں تم لوگوں سے اپنے رویے کے لیے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں انتظار کررہا تھا کہ تمہاری ماں آجائے تو تم دونوں کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کروں، وہ تو پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے۔'' انکل کے مشفق اور مہربان رویے کی وجہ سے میرا سارا ڈر اور خوف جاتا رہا۔ میں نے انہیں امی کے بارے میں مزید بتایا۔
''امی منظور کالونی گئی ہیں خالہ کے گھر۔'' میں نے بتایا۔ ''کہہ رہی تھیں زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک واپس آجائیں گی لیکن ابھی تک نہیں آئیں۔''
''نہیں آئی تو آجائے گی وہ بھی۔'' انکل نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم کچن میں برتن رکھ کر آؤ پھر ہم باتیں کرتے ہیں۔''
میں چائے کے برتنوں والی ٹرے کچن میں رکھ کر آئی تو وہاں کا منظر ہی بدل گیا۔ میں جیسے ہی انکل کے کمرے میں داخل ہوئی یہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیے۔ مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا کہ یہ کہاں چلے گئے پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتی، مجھے ایک زور کا دھکا لگا اور میں جا کر انکل کے بیڈ پر گری۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو یہ شیطان دروازے کو لاک کررہا تھا پھر..... پھر..... اس مردود نے مجھے بے بس کردیا۔
میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاسکتی۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ''کاش اس واقعے سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔''
''شاہدہ بی بی، تم کوئی سیل سے چلنے والی گڑیا نہیں تھیں جو ملزم کا دھکا لگنے کے بعد آف ہوگئی تھیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے تگ ودو تو کی ہوگی یا نہیں؟''
''میں نے خود کو اور اپنی عزت کو بچانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اس شیطان نے میری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ اس کے اندر جیسے کسی وحشی گینڈے کی طاقت بھر گئی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت سے ہوس ٹپکتی تھی۔ میں نے اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ناخنوں سے اس کے چہرے اور گردن کو بھی نوچا۔ آپ میرے نوچنے کے نشانات اس کے چہرے اور گردن پر دیکھ سکتے ہیں۔''
وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے ناخنوں نے واقعتاً ریحان کی گردن اور چہرے کو گھائل کردیا تھا۔ ان زخموں کے نشانات کھرنڈ کی شکل میں اب بھی نظر آرہے تھے۔
شاہدہ اپنے اشک بار بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''اپنے بچاؤ کی کوشش میں میرا لباس تار تار ہوتا چلا گیا۔ اس رات میری ہر کوشش ناکام رہی۔ میرے چیخنے چلّانے کی آوازیں بند کمرے سے باہر نہ جاسکیں اور یہ ہوس پرست مجھے برباد کرتا چلا گیا۔ جب امی کمرے کے اندر داخل ہوئیں تو میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس شیطان کی اولاد نے مجھے تباہ کرڈالا تھا۔'' اس نے نفرت بھرے انداز میں، اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کیا اور اضافہ کرتے ہوئے بولی۔
''کاش، میں اپنی تباہی اور بربادی کی داستان سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتی۔ اس ذلت کی زندگی سے تو

موت اچھی تھی۔''

پھر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ حاضرین عدالت کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جج بھی شاہدہ کے بیان سے متاثر نظر آتا تھا۔ میں اس کیفیت کو زیادہ دیر برقرار رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔

''شاہدہ بی بی!'' میری گونج دار آواز نے عدالت کے کمرے میں چھائے ہوئے سکوت کا سینہ چیر ڈالا۔ ''ٹریجڈی سین ختم ہو چکا۔ تم نے اپنی لائنیں بول دی ہیں۔ اب اداکاری روک دو..... کیمرا رک چکا ہے۔ کیا تم نے کٹ کی آواز نہیں سنی؟''

''کیا مطلب؟'' شاہدہ کے بجائے وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ مظلوم شاہدہ اب تک اداکاری کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی جبر، کوئی زیادتی نہیں ہوئی؟''

''جی ہاں۔'' میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''آپ مظلوم کی بے عزتی کر رہے ہیں۔''

''جس شخص کو اپنی عزت کا خود خیال نہ ہو، معاشرہ اسے عزت نہیں دیتا۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اگر مظلوم عزت دار لڑکی ہوتی تو درجنوں افراد کے سامنے اتنا بڑا اسٹیج ڈراما نہ رچاتی۔ اس کے مگرمچھ کے آنسو افسانوی تصویر میں حقیقت کے رنگ نہیں بھر سکے۔''

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے خاصی بدتمیزی سے پوچھا۔

''بیگ صاحب۔'' جج کو بھی مجبوراً مداخلت کرنا پڑی۔ ''آپ اپنے موقف کی وضاحت کریں۔''

''آف کورس یور آنر۔'' میں نے دبنگ لہجے میں کہا پھر وکیل استغاثہ، مظلوم شاہدہ سمیت حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے موکل کی بے گناہی کے حق میں کچھ اس انداز میں دلائل دینا شروع کیے۔

''جناب عالی! مظلوم شاہدہ نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ وقوعہ سے چند روز پہلے ملزم اور ان ماں بیٹی کے درمیان ایک رات شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا جس میں ملزم نے واضح طور پر دو آپشنز استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ملزم کو ان ماں بیٹی کے کردار پر بڑا مضبوط شک تھا اور اس نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنے طور طریقے درست نہ کیے تو وہ یا تو انہیں گھر میں تالا بند کر کے اپنے کام کاج کے لیے نکلے گا یا پھر وہ انہیں اپنی زندگی اور اپنے گھر ہی سے نکال باہر کرے گا اور اس نے سیکنڈ آپشن استعمال کرنے پر زیادہ زور دیا تھا یعنی اگر یہ ماں بیٹی اپنی غیر فطری حرکتوں سے باز نہ آئیں تو وہ انہیں سیدھا سیدھا اپنے گھر سے چلتا کر دے گا۔ ان حالات کی روشنی میں مظلوم شاہدہ کے بیان کا آخری حصہ کوئی اور ہی بھونڈی اور غیر منطقی کہانی سناتا ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ریحان کے خانگی حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ جب وقوعہ کی رات وہ لگ بھگ نو بجے گھر پہنچا اور اس نے اپنی مبینہ بدکردار بیوی کو گھر میں موجود نہ پایا تو اسے مظلوم شاہدہ سے سلمیٰ کے بارے میں سوال کرنا چاہیے تھا کہ وہ کہاں گئی ہے، کیوں گئی ہے اور کب تک واپس آئے گی لیکن مظلوم شاہدہ کے بیان کے مطابق ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کہ ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ نمبر دو.....''

میں نے تھوڑی دیر رک کر پھر بولنا شروع کیا۔ ''چند سیکنڈ کے لیے مظلوم شاہدہ کے بیان کو درست مان لیتے ہیں مگر جب مظلوم نے ملزم کے کمرے میں جا کر اسے خود بتایا کہ اس کی امی منظور کالونی اپنی بہن فریدہ سے ملنے گئی ہے اور اس نے سات آٹھ بجے تک واپس آنے کو کہا تھا لیکن جب رات کے گیارہ بجے تک بھی سلمیٰ کی واپسی نہیں ہوئی تو ملزم کو اصولاً آگ بگولا ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے فوری طور پر اپنی سالی فریدہ کے گھر فون کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی کہ سلمیٰ اب تک واپس کیوں نہیں آئی لیکن مظلوم شاہدہ کے مطابق، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری معلومات کے مطابق دونوں گھروں میں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے اور سب سے اہم نکتہ.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر جج کی جانب دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ملزم وقوعہ کی رات نو بجے اپنے گھر آ گیا تھا۔ بیوی کو گھر میں نہ پا کر یقیناً اس کا دماغ گرم ہو گیا ہوگا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اس نے مظلوم شاہدہ سے اس کی امی کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کی ہو۔ ان دنوں ملزم کے گھر میں جس نوعیت کے حالات چل رہے تھے اس میں اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملزم نے مظلوم کو بڑی محبت اور دلار سے شاہدہ بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہو، اس سے چائے کی فرمائش کی ہو اور بڑی ندامت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ان تمام امور کو بھی چند لمحات کے لیے اگر درست مان لیا جائے تو پھر ایک بات کسی بھی طور قابلِ ہضم

نہیں ہے.....'' میں نے اپنا بیان نامکمل چھوڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ اضطراری انداز میں مستفسر ہوا۔

''کون سی بات ناقابلِ ہضم ہے؟''

میں نے وکیل مخالف کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جج سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جناب عالی! کوئی انسان کتنا شریف ہے یا کتنا بدمعاش، یہ اس انسان کا ذاتی فعل شمار ہوگا۔ دونوں صورتوں میں ہم انسان کی بنیادی فطرت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر ملزم ریحان کو اپنی بیوی اور سوتیلی بیٹی کے کردار پر بھروسا نہیں تھا اور وہ ان ماں بیٹی کو راہ راست پر دیکھنے کا خواہاں تھا تو پھر فطرت کے اصول کے مطابق، وہ خود کسی ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے کردار کو داغ دار کرنے کا وسیلہ بن جائے اور وہ بھی اپنے گھر کے اندر..... اپنی سوتیلی بیٹی کے ساتھ..... ایسے موقع پر کہ کسی بھی لمحے اس کی بیوی وہاں پہنچنے والی ہو۔ کسی بھی صورت میں یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا لہٰذا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مجرمانہ کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ وہ عدالت سے ایک ناکردہ جرم کی سزا پا کر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلا جائے اور اس دوران میں یہ ماں بیٹی اس کے کاروبار، دولت اور جائداد پر قابض ہو کر اپنی مرضی کے گل چھرے اڑانے والی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ملزم ان کے راستے کا کانٹا تھا۔ یہ کانٹا ہٹتے ہی یہ دونوں شاہراہ آوارگی پر اس طرح سرپٹ دوڑتی چلی جائیں کہ.....''

''تو آپ کے خیال میں ملزم اپنی بیوی اور سوتیلی بیٹی کی مشترکہ سازش کا شکار ہوا ہے؟'' جج نے مجھ سے سوال کیا۔

''درحقیقت وہ بے گناہ ہے۔ اس سارے بکھیڑے میں اس کا کوئی کردار نہیں؟''

''یس یور آنر۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آبروریزی کا یہ کیس کسی اسکرپٹ ڈرامے سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں ہے۔''

''کیا آپ اپنے اس موقف کو عدالت کے سامنے سچ ثابت کر سکتے ہیں؟''

''جی ہاں، ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوتوں کے ساتھ۔'' میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ۔''

☆☆☆

آیندہ روز ملزم کی بڑی بہن مسز سفیان یعنی عطیہ بیگم مجھ سے ملنے میرے آفس آئی۔ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''بیگ صاحب، کل والی پیشی پر تو آپ نے اس حرافہ شاہدہ کی پیش نہیں چلنے دی۔ سچ پوچھیں تو مجھے بہت مزہ آیا تھا۔''

''آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ آپ میری کارکردگی سے خوش ہیں۔''

''خوش بھی اور پُرامید بھی۔'' وہ بڑے جوش سے بولی پھر پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے قادر کے حوالے سے تصویر اور شناخت کا کیا چکر چلا دیا ہے؟''

''کوئی چکر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں دراصل ایک چھوٹا سا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسا تجربہ؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''پہلے آپ یہ بتائیں کہ میں نے آپ کو قادر کے حوالے سے جو کام کرنے کو کہا تھا اس کا کیا بنا؟''

''وہ کام ہو گیا ہے۔'' وہ بڑے فخریہ انداز میں بولی۔ ''میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے پتا چلا لیا ہے کہ قادر آج کل کہاں ہے۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے مذکورہ کاغذ کھول کر دیکھا۔ اس میں قادر کا موجودہ ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایڈریس والے کاغذ کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا پھر مسز سفیان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس امر کا اظہار کیا تھا کہ عین ممکن ہے، قادر کوئی نیک اور صلح جو شخص ہو اور اس نے سلمیٰ اور شاہدہ کے کردار کی وجہ سے انہیں اپنی زندگی سے الگ کیا ہو۔ یہ ناممکن تو نہیں..... سلمیٰ کا بیان، قادر کے خلاف ایک سوچا سمجھا پروپیگنڈا بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔''

''اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ میں سوچ رہا ہوں اور آپ

میری اس سوچ کی تصدیق بھی کررہی ہیں تو پھر قادر سے میری ملاقات، ہمارے کیس کے سلسلے میں بڑی سود مند ثابت ہوسکتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔''

''اگر قادر عدالت میں آکر سلمٰی اور شاہدہ کے کردار کے حوالے سے گواہی دینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے تو ریحان کی بے گناہی ثابت کرنے میں بہت آسانی ہوجائے گی۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''لیکن آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں بیٹھ سکی۔''

''کون سی بات؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ تصویر شناخت والا معاملہ۔''

''وہ میں نے محض شاہدہ، سلمٰی اور وکیل استغاثہ کو چکر دینے اور الجھانے کے لیے ایک چال چلی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ تصویر اور شناخت کے حوالے سے مختلف انداز میں قیاس آرائیاں کرنے میں پھنسے رہیں گے اور اگر اللہ نے چاہا تو میں آیندہ پیشی پر قادر کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرکے ان پر ایٹم بم گرادوں گا۔''

''آپ کا آئیڈیا بہت دھانسو اور جاندار ہے۔'' وہ ستائشی نظر سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''اگر قادر والا معاملہ آپ کی اُمید کے مطابق نکل آئے تو؟''

''امید پر دنیا قائم ہے مسز سفیان۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کسی بھی حال میں امید کے دامن پر اپنی گرفت کمزور نہیں پڑنے دیتا۔ میں خدا کی رحمت، اپنی محنت اور امید کی کرن کے سہارے زندہ ہوں۔''

''واہ واہ..... سبحان اللہ!'' وہ بے ساختہ بولی۔

ہمارے درمیان مزید پندرہ منٹ تک ریحان، سلمٰی اور شاہدہ کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی پھر وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد میرے دفتر سے رخصت ہوگئی۔

آیندہ روز میں نے مسز سفیان کے فراہم کردہ ایڈریس پر جاکر اپنے تئیں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجھ پر حیرت اور دلچسپی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکل آیا تھا۔ میں جو کچھ سوچ کر گیا تھا اس سے انتہائی مختلف صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ نئی سچویشن کا تقاضا یہی تھا کہ میں سردست قادر سے ملاقات نہ کروں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک نیا اور اچھوتا آئیڈیا آگیا تھا۔ اگر میں احتیاط سے کام لیتا تو وہ بندہ اس کیس کے لیے ہماری توقع سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا۔

کیسے..... فی الحال میں آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ سلمٰی، شاہدہ، وکیل استغاثہ، جج اور حاضرینِ عدالت کے ساتھ آپ بھی اگلی پیشی کا انتظار کریں۔ چلتے چلتے صرف اتنا جان لیں کہ میں اپنے مخصوص ذرائع استعمال کرکے قادر کی ایک تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ پانچ ضرب سات انچ کی ایک بڑی واضح تصویر تھی جو شناخت کے مقاصد کے لیے بہت عمدہ ثابت ہوسکتی تھی۔ اب میں بے حد مطمئن اور پُرسکون تھا۔

☆☆☆

آیندہ پیشی پر سب سے پہلے استغاثہ کی جانب سے دو گواہ یکے بعد دیگرے عدالت میں پیش کیے گئے۔ دونوں افراد ملزم ریحان کے محلے دار تھے جو وقوعہ کی رات سلمٰی کی چیخ وپکار پر اس کے گھر پہنچ گئے تھے۔ دونوں نے بیان دیا وہ شاہدہ کی حمایت میں اور میرے موکل کے خلاف جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے شاہدہ کی جو حالت دیکھی تھی بلکہ سلمٰی نے انہیں جو کچھ دکھایا اور بتایا تھا وہ اسی کی روشنی میں گواہی دینے آئے تھے۔ آپ خود اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ان دونوں افراد نے استغاثہ کے ہاتھ پاؤں مضبوط کرنے کے لیے کیا کیا تیر مارے ہوں گے۔ میں نے ان دونوں کے بیانات میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی، لہٰذا ان کا ذکر گول کرتے ہوئے میں آگے بڑھتا ہوں۔

اس سے قبل کہ وکیل استغاثہ کسی اور گواہ کو شہادت کے لیے کٹہرے تک لانے کی زحمت کرتا، میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا۔''

جج نے فوراً مجھے اجازت مرحمت فرمادی۔ کسی بھی کیس کے تفتیشی افسر کو ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا ہوتا ہے۔ مذکورہ تفتیشی افسر جج کے حکم سے وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔

وہ ایک ڈھیلا ڈھالا، موٹا تازہ اور سست الوجود سب انسپکٹر تھا جس کا نام خیر سے خیر دین تھا۔ میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب پہنچا پھر آئی، او (انکوائری آفیسر) کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''خیر دین صاحب، کیا آپ نے وقوعہ کے فوراً بعد جبر اور ظلم کا شکار ہونے والی شاہدہ بی بی کا مخصوص نوعیت کا میڈیکل چیک اپ کروایا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیوں نہیں؟''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے تحیر خیز آواز میں کہا۔

''مظلوم شاہدہ موقع پر موجود تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی حالت ظلم و جبر کی کہانی سنا رہی تھی۔ اس کی تباہی و بربادی کو نوٹ کرنے والے تین گواہ (سلمٰی سمیت) ہمیں میسر آگئے تھے پھر.....'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''پھر..... مظلوم شاہدہ بی بی از خود چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کررہی تھی کہ ملزم ریحان یعنی اس کے سوتیلے باپ نے اسے بری طرح برباد کرڈالا ہے.....''

''یہ.....!'' میں نے شاہدہ بی بی کی جانب انگلی سے اشارہ کیا پھر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہ آواز بلند کہا۔ ''چیخ چیخ کر اپنی بربادی کا اعلان کررہی تھی یا سرگوشیوں کے ذریعے لوگوں کو اپنے غم سے آگاہ کررہی تھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس کو ہر حال میں قانونی تقاضے پورے کرنے چاہیے تھے جو کہ نہیں کیے گئے۔'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرنے کے لیے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! مظلوم شاہدہ بی بی کا مخصوص میڈیکل چیک اپ بہت ضروری تھا تاکہ اس کے دعوے اور ملزم کے جرم کی تصدیق کی جاسکتی لیکن پولیس نے اس چیک اپ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ یہ فرائض سے غفلت، پیشہ وارانہ کوتاہی اور استغاثہ کے ایک بھیانک سقم کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ یہاں یہ موقف اختیار کروں گا کہ یہ پولیس اور استغاثہ کی سازشانہ ملی بھگت کا شاخسانہ ہے۔ اگر مذکورہ چیک اپ کروالیا جاتا تو دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوجاتا تھا۔ اس کوشش کے نتیجے میں میرا موکل بے گناہ ثابت ہوجاتا لیکن استغاثہ کی بدنیتی کہ وہ ملزم کو ایک ناکردہ جرم میں لمبے عرصے کے لیے جیل بھجوانے کا ارادہ رکھتا ہے..... دیٹس آل یور آنر۔''

جج تھوڑی دیر تک گردن جھکائے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر مختلف انداز میں قلم چلاتا رہا پھر وکیل استغاثہ کو عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

وکیل استغاثہ نے اس کیس میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ اور ملزم کی بیوی سلمٰی کو شہادت کے لیے بلانے کا اعلان کیا تو میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

''جناب عالی! میں سلمٰی کی گواہی سے پہلے اس کیس کی مظلوم شاہدہ سے ایک ضروری سوال کرنا چاہتا ہوں..... اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو.....!''

''اجازت ہے.....'' جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو شاہدہ بی بی سے جو بھی پوچھنا ہے، اس میں زیادہ وقت صرف نہیں ہونا چاہیے۔''

''صرف ایک سوال یور آنر.....!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اور اس سوال کا تعلق ''شناخت'' کے معاملے سے ہے۔ وہ میں نے پچھلی پیشی پر.....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چبھتی ہوئی نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور کہا۔

''پچھلی پیشی پر میں نے کسی تصویر کا ذکر کیا تھا۔ وہ تصویر میں نے حاصل کرلی ہے۔ یہ سوال اسی تصویر سے متعلق ہے۔''

وکیل استغاثہ کے چہرے پر تشویش دوڑ گئی۔ شاہدہ بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ جج کی نگاہ میں بھی دلچسپی شامل ہوگئی تھی۔

میں نے اپنے بریف کیف میں سے بھورے رنگ کا ایک لفافہ نکالا۔ قادر کی تصویر کو میں نے اسی لفافے میں رکھا ہوا تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد شاہدہ بی بی والے کٹہرے کے پاس پہنچا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''شاہدہ بی بی! آپ نے گزشتہ پیشی پر مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ آپ کو یاد تو ہوگا.....؟''

میں چونکہ چند لمحے پہلے فوٹو کا ذکر کرچکا تھا اور شاہدہ اس ذکر پر چونکی بھی تھی لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''جی ہاں..... مجھے یاد ہے، آپ مجھے میرے باپ قادر کی تصویر دکھانا چاہتے ہیں اور مجھ سے شناخت کرانا چاہتے ہیں کہ میں تصویر دیکھ کر اپنے باپ کو پہچان سکتی ہوں یا نہیں.....''

''ویری گڈ.....'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تمہاری یادداشت قابلِ تحسین ہے۔''

پھر آیندہ چند سیکنڈ میں، میں نے بھورا لفافہ کھول کر اس کے اندر سے قادر کی تصویر نکالی اور شاہدہ بی بی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''لو..... اس فوٹو کو اچھی طرح دیکھ کر شناخت کرو۔''

مذکورہ تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھوں اور چہرے پر شناسائی کے تاثرات نمودار ہوئے اور اگلے ہی لمحے

اس کی سرسراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں سنائی دی۔

''مم..... میں نے پہچان لیا..... یہ میرے باپ..... قادر کی تصویر ہے۔ ایک سو ایک فیصد قادر کی تصویر.....!''

''دیٹس آل یور آنر.....!'' میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس قسم کی شناخت سے آپ کیا ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں.....؟''

میں نے وکیل مخالف کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور شاہدہ بی بی کے ہاتھ سے قادر کی تصویر لے کر جج کی جانب مڑ گیا۔ پھر میں نے وہ تصویر جج کی سمت بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جناب عالی! آج کی کارروائی کے اختتام تک یہ تصویر معزز عدالت کے پاس امانت کے طور پر محفوظ رہے گی۔''

جج نے میرے ہاتھ سے وہ تصویر لے لی۔ چند لمحات تک وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مذکورہ تصویر کو گھورتا رہا پھر اسے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کے نیچے دبا دیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! آپ شاہدہ سے کچھ اور پوچھنا چاہیں گے؟''

''ناٹ ایٹ آل یور آنر.....'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''آپ اب گواہ کو پیش کرسکتے ہیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد استغاثہ کی سب سے اہم گواہ سلمٰی وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوگئی۔ اس امر کی پہلے بھی کئی بار وضاحت کی جاچکی ہے کہ عدالت میں باری باری ایک ایک گواہ کو بلا کر اس کا بیان لیا جاتا ہے تاکہ کسی ایک کی گواہی، دوسرے کے بیان کو متاثر نہ کرسکے۔ میں نے فوٹو کی شناخت کے حوالے سے شاہدہ کے ساتھ جو بھی ٹرائل کیا تھا، سلمٰی اس کی تفصیل سے واقف نہیں تھی اور یہ میری پلاننگ کا حصہ تھا..... وہ پلاننگ جس کی مدد سے میں شاہدہ بی بی اور سلمٰی کو چاروں خانے چت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سلمٰی نے اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ سلمٰی نے عدالت کے روبرو کم وبیش وہی بیان دیا تھا جو وہ وقوعہ کے روز پولیس کو بھی دے چکی تھی۔ وکیل استغاثہ نے مختلف سوالات کے ذریعے، سلمٰی کے تصدیقی جوابات کی مدد سے شاہدہ بی بی کی ''فریاد'' کو حق سچ ثابت کرنے کی کوشش کی۔

جج بڑی دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کردی۔

میں اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کرکے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔

''سلمٰی بی بی!'' میں نے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ آپ ملزم کی بیوی ہیں.....؟''

میرے اس عجیب وغریب سوال پر وہ الجھن زدہ سی مجھے دیکھنے لگی پھر اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''ہاں..... یہ سچ ہے!''

''اور یہ بھی سچ ہے کہ ملزم آپ کا شوہر ہے؟''

''ظاہر ہے..... جب میں اس کی بیوی ہوں تو وہ میرا شوہر ہی ہوگا نا.....!''

''اس تصدیق کے لیے بہت بہت شکریہ۔''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست یہ کس قسم کی جرح کررہے ہیں؟''

''جب اس جرح پر استغاثہ کی سب سے اہم گواہ بیگم کو کوئی اعتراض نہیں اور وہ بڑے صبر وسکون سے میرے سوالات کے جوابات دے رہی ہیں تو پھر استغاثہ کی جانب سے کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی.....'' میں نے بڑے مضبوط انداز میں کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وکیل سرکار کو کیا پریشانی ہے.....؟''

جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ.....''

''سلمٰی بیگم!'' میں گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کے سامنے اس بات کی تصدیق کریں گی کہ شاہدہ آپ کی سگی بیٹی ہے؟''

''جی ہاں۔ شاہدہ میری سگی بیٹی ہے۔''

''لیکن..... شاہدہ ملزم ریحان کی سگی بیٹی نہیں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بڑی رسان سے بولی۔

''ریحان، شاہدہ کا سوتیلا باپ ہے.....؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''شاہدہ کے سگے باپ کا نام قادر ہے؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

''قادر سے آپ نے ساڑھے تین، چار سال پہلے نجات حاصل کرلی تھی؟'' میں نے بڑے سنجیدہ انداز میں جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... جی ہاں!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''وقوعہ کے روز آپ گھر میں موجود نہیں تھیں؟''

''میں اپنی بڑی بہن فریدہ سے ملنے منظور کالونی گئی ہوئی تھی۔''

''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز آپ سہ پہر چار بجے گھر سے نکلی تھیں اور مظلوم شاہدہ سے سات، آٹھ بجے تک واپس آنے کو کہا تھا۔'' میں نے پوچھا۔ ''لیکن آپ کی واپسی رات گیارہ، سوا گیارہ بجے ہوسکی تھی؟''

''جی، یہ درست ہے۔'' وہ نفرت بھری نظر سے ریحان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور جب تک یہ شیطان، میری بچی کو تباہ کرچکا تھا۔''

''جب وقوعہ کی رات آپ منظور کالونی سے واپس گھر پہنچیں تو آپ نے کیا دیکھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، اپنے گھر کے اندر کیا دیکھا؟''

''میرا خیال تھا، میں زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے رات تک واپس آجاؤں گی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں خود یہ نہیں چاہتی تھی کہ جب ریحان دکان سے واپس آئے تو شاہدہ اسے گھر میں اکیلی ملے۔ شاہدہ مجھے ریحان کی بری نیت کے بارے میں تفصیلاً بتا چکی تھی لیکن ایک تو فریدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، مجھے وہاں سے نکلنے میں دیر ہوگئی، دوسرے ٹریفک جام نے بھی بہت سا وقت ضائع کردیا تھا چنانچہ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے کوئی گیارہ بج گئے تھے، آپ سوا گیارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور سوال کیا۔ ''پھر آپ نے گھر کے اندر کیا تماشا دیکھا؟''

''بتا تو دیا ہے.....'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''جب میں گھر پہنچی تو میری بچی کی عزت کا جنازہ اٹھ چکا تھا۔ یہ اجڑی پجڑی زار وقطار رو رہی تھی۔ اس کے بدن کا لباس تار تار ہوچکا تھا اور..... اور..... بس، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کی رات جب آپ گھر پہنچیں تو آپ نے گھر کے اندر سے مظلوم شاہدہ کی چیخ پکار تو سنی ہوگی؟''

''چیخ پکار سن کر ہی تو میں تیزی سے اندر کی طرف بھاگی تھی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''شاہدہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔''

''آپ مظلوم کی پکار پر دوڑتے ہوئے ملزم کے کمرے میں پہنچ گئیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس وقت تک، آپ کے بیان کے مطابق ملزم اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل کرچکا تھا..... پھر آپ کے شور مچانے پر محلے والے بھی وہاں جمع ہوگئے تھے جن میں سے دو افراد، استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے بیان بھی دے چکے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''ایسا ہی ہوا تھا۔''

''وقوعہ کی رات آپ منظور کالونی سے واپس آئیں۔ گھر پہنچ کر آپ کو پتا چلا کہ مظلوم شاہدہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ وہ مدد کے لیے پکار بھی رہی تھی۔ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دوڑتے ہوئے سیدھی اس کمرے میں پہنچ گئیں جہاں آپ کے بہ قول، ملزم نے آپ کی دلاری کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا۔'' میں نے رفتہ رفتہ اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''گھر کے مین گیٹ سے جائے وقوعہ یعنی ملزم کے کمرے تک رسائی حاصل کرنے میں آپ کو کسی دشواری کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تھا.....؟''

''جی، بالکل نہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میں کسی پرندے کی طرح اڑ کر پلک جھپکتے میں وہاں پہنچ گئی تھی۔''

میں نے جج کی سمت دیکھتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کی معزز گواہ کے بیان میں شامل اس نکتے کو خاص طور پر نوٹ کیا جائے کہ یہ وقوعہ کی رات مظلوم کی پکار، بلکہ فریاد پر، کسی پرندے کے مانند اڑ کر سیدھی اس کمرے میں جا پہنچی تھی جہاں استغاثہ کے مطابق ملزم نے مظلوم شاہدہ کو بے آبرو کیا تھا۔''

میری اس اسپیشل استدعا پر وکیل استغاثہ اور سلمٰی بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی نظروں کو نظر انداز کرکے سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ کی بیٹی مظلوم شاہدہ بی بی کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے؟''

''نہیں..... نہیں تو.....'' اس استفسار پر وہ گڑبڑا گئی۔ ''اس کے ساتھ جو ظلم اور زیادتی ہوئی ہے اس میں کسی غلط بیانی کا ہاتھ نہیں۔ اس کی فریاد کا ایک ایک لفظ سچ میں ڈوبا ہوا ہے۔''

''میں نے ایک عمومی عادت کی بات کی تھی۔'' میں

اپنے دماغ کو دیجئے
طاقت اور توانائی

BRAINICA
BRAIN ENERGIZER SYRUP

Rs.500/=
برینکا

0315-3830001, 0315-3830002

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اصلی نقلی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

محفل شعر و سخن

گرہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آئینہ ایام

[illegible]

[illegible]

03012454188

[illegible]

jdpgroup@hotmail.com

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مسافر

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

☆☆☆

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور اس کا ڈنک نکالنا ضروری تھا جو تمہارے ذمے لگایا گیا تھا۔ تم نے اسے کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسے استعفا دینے پر مجبور کرنا، مجھ سے معافی کا طلب گار ہونا اور اپنا رویہ بدلنا تمہارے مشن کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ویل ڈن! تم بہت ذمے دار اور ایکٹو ہو۔''

میں حیرت زدہ نظروں سے حاضرین کے بے حد سنجیدہ چہروں کو دیکھ رہا تھا جو میری دانست میں، ناٹک کر کے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میڈم خاموش ہوئی تو سبھی نے جمال کو کامیابی کی مبارک باد دی۔ میں نے بھی شرکائے محفل کی دیکھا دیکھی اجنبیت کے باوجود اسے جملۂ تحسین سے نوازا۔ پھر میڈم کے مطالبے پر اُس نے اپنے مشن پر تفصیلی گفتگو کی۔ پتا چلا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کاغذ کی ہتھیلی بناتا تھا اور اس ہتھیلی پر سرسوں جما کر دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

میڈم بولی۔ ''وارث نے گزشتہ ماہ مال کی سپلائی حسبِ معمولی بروقت اور بنا رکاوٹ کی ہے۔ اس ماہ اس کے پاس کرنسی کی وصولی اور ترسیل کا اضافی کام سونپا گیا تھا جس کا بونس اسے دے دیا گیا ہے۔ چونکہ وارث کا کام سب سے مشکل اور حساس ہے، اِس لیے میں نے وارث کو زیادہ نفری دی ہے۔ میں وارث کو ان گنت کامیابیوں کی مبارک باد دیتی ہوں اور اس پر فخر کرتی ہوں۔ وارث! دوستوں کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتاؤ۔''

وارث گلا کھنکار کر تقریر کرنے کے سے انداز میں بتانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے پر میڈم نے ایک ادا سے مسکرا کر تالی بجائی۔ سبھی نے اُس کی تقلید کی اور تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد میڈم نے میروشاہ سمیت سبھی شرکا کی کارکردگی پر گفتگو کی۔

امیر شاہ عرف میروشاہ مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ وہ جیسا بھی تھا، سب لوگوں کے نزدیک اہم تھا اور وہ اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس سے دب کر بات کرتے تھے۔ انتظامی تقسیم کی بدولت اُس کے ذمے پولیس کے معاملات، پارٹیوں سے ڈیلنگ اور منصوبہ سازی تھی۔ اس کانفرنس میں دو خواتین بھی شریک تھیں۔ شمائلہ خانم قدرے فربہ مگر خوب صورت خال وخد والی تیس بتیس سالہ خاتون تھی۔ ابھی اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی میں تڑپ اور کسک موجود تھی۔ اس نے میک اَپ بڑے قرینے سے کر رکھا تھا اور لباس کا انتخاب عمدہ تھا۔ اس کے ذمے نوعمر اور ضرورت مند جوانیوں کی کھوج اور تعاون پر آمادہ نہ ہونے والیوں کے اغوا کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے میڈم کے اسکواڈ میں ایک لڑکی کا اضافہ کیا تھا۔ دوسری خاتون ادھیڑ عمر تھی۔ وہ اغوا شدہ لڑکیوں کے معاملات کو سنبھالتی تھی اور میڈم کے حکم پر انہیں تیار کر کے مقررہ مقامات پر بھجواتی تھی۔ لین دین بھی اُسی کے ذمے تھا۔ اس نے کرخت اور بے سری آواز میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

پانچواں شریک ڈاکٹر ظہور اختر تھا۔ وہ میڈم کے جدید طرز کے اسپتال 'میڈی کمپلیکس' کو چلاتا تھا۔ یہ اسپتال شہر کی مصروف شاہراہ پر واقع تھا۔ دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں تھا مگر یہاں جدید آلات اور سرجری کی قابلِ ذکر سہولیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر ظہور اختر کی زیرِ نگرانی چار ڈاکٹر اور چھ نرسوں کے علاوہ پانچ دفتری اہلکار وہاں کام کرتے تھے۔ ویسے تو یہاں عام مریض بھی خاصی تعداد میں آتے تھے مگر اس کمپلیکس کے قیام کا بنیادی مقصد میڈم کے گروپ کے زخمی ہونے والے ارکان کا روایتی رکاوٹوں اور قانونی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر بروقت علاج معالجہ تھا۔ اس نے سب سے آخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد آنے والے مہینے کے ٹارگٹ زیرِ موضوع آئے۔ میڈم نے سبھی کے ذمے نئے پراجیکٹ لگائے۔

میروشاہ کی ترغیب پر میں نے پہلے رنگو قسائی کی وعدہ خلافی کا ماجرا پھر زور آور کی دیدہ دلیری کا مقدمہ پیش کیا۔ غیر متعلقہ ہونے کی وجہ سے میں نے شاہد سلیم سے اتفاقیہ طور پر ہونے والی ملاقات کو گول کر دیا۔

میڈم نے میرے سنائی ہوئی کہانیوں کو بڑے انہماک سے سنا۔ سن کر خاموش رہی۔ دوسرے بھی لب بستہ رہے۔ جمال نے بھڑک کر کہا۔ ''اس نالی کے کیڑے کی یہ جرأت! نو...... نو...... یہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ میڈم! زور آور کو اس کے کیے کی سزا دینا ہوگی ورنہ وہ حد سے بڑھ جائے گا۔''

میڈم نے ہاتھ کے اِشارے سے اُسے خاموش کرایا۔ بولی۔ ''ایسے نہیں...... ہمیں جو بھی قدم اُٹھانا ہے، سوچ کر اُٹھانا ہے۔ فیصلے جذبات سے نہیں کیے جاتے۔''

میروشاہ نے کہا۔ ''ماڑی میڈم! یہ سن لیوت ہے کہ اگر ہم کجور (کمزور) ہووت تو پھر پورا جمانہ (زمانہ) ماڑے پر گند بلا لادیوت ہے۔ ماڑی دنیا میں ایسا نہ ہونے کا، جیسا رنگو اور جور آور نے کر دکھاوے ہے۔''

میروشاہ کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ میڈم نے یکے بعد دیگرے ہر چہرے پر نظر دوڑائی، کچھ سوچا پھر تمکنت سے بولی۔ ''یہ درست ہے کہ ان دونوں نے اپنی

شامت کو آواز دی ہے۔ اگر ہم لوگ ایک دوسرے پر ایسے وار کرنے لگیں گے تو کوئی بھی سروائیو نہیں کر سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان دونوں سے رابطہ کرنا چاہیے اور یہی بات باور کرانی چاہیے۔"

"وہ اِسے ہماری بزدلی قرار دیں گے میڈم!" شائلہ خانم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

جمال نے زوردار انداز میں تائید کی۔ "بالکل ٹھیک کہا خانم نے۔ میڈم! یہ لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔"

"مگر کیا ہم جواباً وہی کچھ کریں گے، جو انہوں نے کیا؟" میڈم نے سمجھانے کے سے انداز میں سوال کیا۔ "میرا خیال ہے کہ محاذ آرائی کے بجائے ہمیں مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔"

میروشاہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے، باچھیں کھنچ گئیں اور استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اڑے واہ مہارانی جی! محاج اَرائی..... کیا کھوب کہوت ہے۔ پھر کاہے کو یہ بھاجا دوڑی (بھاگ دوڑ) کرت؛ کالی وردی سے بھی مفاہمت کر لیوت ناں..... میروشاہ کیوں ماراماری کرتا پھرت ہے تیرے نام پر!"

"یوشٹ اَپ....." میڈم کا پارہ یک لخت چڑھ گیا۔ آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ "میروشاہ! تم حد سے بڑھ جاتے ہو۔ تمہیں یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ تم کس کو مخاطب کر رہے ہو۔ یہاں ہم نے مل بیٹھ کر یہی کچھ طے کرنا ہے۔ دیکھو! اگر ہم زورآور اور رنگو قسائی کو بہ یک وقت چھیڑ دیتے ہیں تو ان دونوں کی جوابی کارروائیاں ہمیں نقصان پہنچائیں گی۔ رنگو کے پیچھے میاں دلبر حسین ہے۔ زورآور کے پیچھے مرغوب گیلانی ہے۔ دونوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے مالکوں کو بتایا جائے، انہیں باور کرایا جائے کہ ان کے بے وقوف کتوں کی احمقانہ چھیڑ چھاڑ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور وہ ان کی گردنوں میں پٹے ڈال دیں۔"

ہال میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس کی آواز میں شامل برہمی بتدریج کم ہونے لگی، بولی۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ان کی گردنوں میں پٹا ڈالا جائے یا کچلا پھینک کر ہلاک کر دیا جائے اور انہیں بھونکنے کا موقع نہ دیا جائے مگر جارحانہ انداز میں نہیں، بلکہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں۔ دیکھو! زورآور اپنے یار موبی کی وجہ سے شاکی ہے۔ رنگو قسائی کے ہم نے تین جوان مار دیے ہیں۔ وہ بھی آگ بگولا ہے۔ سردار حیدر خان اور استاد ببلو اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہے ہیں۔ ایسے میں ہماری طرف سے کیا گیا حملہ اعلانِ جنگ تصور ہوگا اور ہم تین مختلف دشمنوں کے نرغے میں آجائیں گے۔"

جمال بولا۔ "پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"ہاں جمال! یہ ہوئی ناں بات!" میڈم نے سر ہلا کر کہا۔ "ہمیں اپنی توجہ دفاع پر مرکوز رکھنی چاہیے اور پھر جونہی حالات موافق ہوں، زورآور اور استاد ببلو کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر کے بیچ میں آگ لگا دی جائے۔ دونوں میں سے جو جیتے گا، وہی سکندر قرار پائے گا۔ جو ہارے گا، وہ آگ میں جل مرے گا۔ رہی بات رنگو قسائی کی، تو وہ اس علاقے میں نووارد ہے۔ اُسے پیر جمانے کا موقع نہ دیا جائے اور ہاتھ پاؤں بچا کر اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔ یعنی میں ایک طرح سے فی الحال انتظار کرنے کی پالیسی کو ترجیح دیتی ہوں۔"

میروشاہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ میڈم کی طرف سے پہلو پھیر کر بیٹھ گیا اور منہ بنانے لگا۔ میڈم نے اُسے دیکھا اور نظر انداز کر کے جمال اور شائلہ سے باتیں کرنے لگی۔

اس میٹنگ کا آخری سیشن پرتکلف طعام پر منتج ہوا۔ یہ کھانا شہر کے ایک مہنگے فائیو اسٹار ہوٹل سے پیک ہو کر آیا تھا۔

میٹنگ برخاست ہوگئی۔ میں پیا جی کے ساتھ جانے کے ارادے سے اُٹھا۔ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا حکم دیا۔ پیا سے مخاطب ہوئی۔ "تم جاؤ، میروشاہ اور شہریار میرے ساتھ جائیں گے۔"

میروشاہ بولا۔ "مہارانی جی! اتنا بھی ماڑے غنچے کو سر پر نہ چاڑھاہت کہ یہ سالا ماڑے کو ہی آنکھیں دکھانے لگ جاوت....."

میڈم نے اُسے غصے سے دیکھا۔ ڈاکٹر ظہور اختر مسکرایا، بولا، "میڈم! شاہ جی کی بات پر غور کیجیے گا۔"

میڈم نے میرا ہاتھ تھاما اور باہر کھینچتے ہوئے بولی۔ "میروشاہ! تم نہ صرف خود بکواس کرتے ہو بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہو۔ لگتا ہے پھر دو چار دن حوالات کی سیر کرنے کا دل کر رہا ہے تمہارا۔"

اس نے مضحکہ خیز انداز میں ہاتھ باندھ دیے اور گڑگڑایا۔ "ناں مہارانی! یہ غجب (غضب) نہ کیجیو سالے میروشاہ پر..... وہ جالم انسپکٹر، اجہر (اظہر) دھمکی دیوت ہے کہ اب کے میروشاہ ماڑے شکنجے میں آوے تو اس کی

بھاوت..... مہارانی شہر کے لونڈوں کو برائلر کہوت ہے، تجھے اصیل بانگا ککڑ جان کر تجھ پر ریجھ جاوت ہے۔ ماڑے کو پتا ہووے۔"

میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ "تم مجھے سبز باغ دکھا رہے ہو۔ میں بھی ساون کا اندھا ہوں۔ ہر طرف ہریالی دیکھ رہا ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میر وشاہ کی سجائی ہوئی اس دنیا میں چاند نہیں چڑھتا، پھول نہیں کھلتے، اوس نہیں پڑتی۔"

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پوری وسعت میں کھول کر استعجاب سے مجھے گھورنے لگا، بولا۔ "اڑے! تو تو غجب (غضب) کا پیدا گیر بن جاوت ہے۔ سالا شاعر بن جاوت..... جراہٹ کے!"

میں نے ہنس کر سیڑھیوں پر قدم رکھا اور دو دو زینے ایک قدم میں عبور کرتا ہوا فرسٹ فلور پر آ گیا۔ رُک کر پلٹا، دیکھا، وہ ابھی تک گراؤنڈ فلور پر سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے کھڑا تھا اور مجھے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر قدرے اونچی آواز میں بولا۔ "شالا جوانی سلامت رہوے ماڑے غنچے کی!"

میرے عقب میں 'ٹک ٹک' کی مخصوص آواز گونجی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میڈم کے کمرے سے نکل کر زرمینا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ دراز قد تھی۔ اونچی ہیل والے جوتے پہن کر کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ اس نے بڑا جاندار میک اَپ کر رکھا تھا۔ قریب آ کر رُک گئی۔ میری سانسوں کو اپنی ہتھیلی پر دیکھ کر کمال نفاست سے لپیٹتے ہوئے مسکرائی اور بولی۔ "یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

میں جواب دیے بغیر اُسے دیکھے گیا۔ اس نے ایک ادا سے مجھے، پھر سیڑھیاں چڑھتے میر وشاہ کو اور دھیمی آواز میں بولی۔ "کیا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے اُسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ تب دیکھا تھا جب وہ گیسٹ روم میں وحید کو لینے کے لیے آئی تھی۔ کھالا بھی میرے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ میں نے کہا۔ "حسن کا وصف ہے کہ جب بھی نظر آتا ہے، آنکھوں کو پہلے سے بہتر اور نیا لگتا ہے۔"

"ابے! آنکھوں کو نہیں؛ دل کو نیا لگت ہے....." میر وشاہ نے میری بات سن لی تھی تبھی پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اڑے واہ غنچے! چھپا رستم نکلا ہے تو..... اے بانکی چھوکریا! آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھت ہے لاڈے خان کو۔ کیا نجر (نظر) لگانے کا..... جرا (ذرا) حیا کو ہاتھ مار لے تو چار دن حیاتی کے بڑھ جاویں..... یہ سالا میر وشاہ سچ بولت ہے، جرمینا بی بی!"

وہ پچھلے قدموں ہٹ کر دیوار گیر وِنڈو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ادائے قاتلانہ سے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "شاہ جی! میں بھی سچ بولتی ہوں کہ آنکھیں جلیں کہ آپ کی موجودگی میں کچھ اور دیکھیں۔ آپ اپنے لاڈے خان کو سنبھال کر لے جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کسی کام کاج کا ہی نہ رہے۔"

اس کے چہرے پر بڑی ہوش ربا مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے میر وشاہ کو دیکھا جو آنکھیں نچا رہا تھا اور زیرلب بڑبڑا رہا تھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میڈم کے کمرے کی طرف کھینچتا ہوا زرمینا سے مخاطب ہوا۔ "ابھی تیری سسری مالکن کے پاس جاوت ہوں اور تیرے تن کی آگ پر گھڑا ساون کا ڈالت ہوں....."

ہمارے عقب میں اس کے حلق سے نکلی مندر کی گھنٹیوں کی مترنم صدا گونجی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے ہاتھ لہرا رہی تھی۔

ہم آگے پیچھے میڈم کے کمرے میں داخل ہوئے۔ میڈم جوتے اُتارے بیڈ پر دوزانو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے جام و صبو کی بساط سجی ہوئی تھی۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میر وشاہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "رانی! یہ شراباں نہ پیوت، یہ جھوم جھوم مستی سے دور رہوت؛ نہیں تو کسی کام کی نہ رہوت..... جوانی کو آگ لگانے میں مجا (مزا) تو آنے کا، پَر جوانی درواجا (دروازہ) کھول کر جانے کا....."

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میر و کی بات سن کر سر اُٹھ گیا۔ جوڑے سے نکل کر سوختہ جاں جھولتی ہوئی لٹ کو بے نیازی سے جھٹک کر بولی۔ "میں زیادہ نہیں پیتی۔ کم پیتی ہوں۔ ویسے بھی آگ پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوتا میر وشاہ۔ یہ تم زرمینا سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"ماڑے کو کوئی بات نہ کرنا ہووے جرمینا سے، وہ میرے غنچے پر لائن مارت ہے۔"

میڈم نے مجھے دیکھا۔ چند ثانیے سپاٹ چہرہ لیے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "لائن مارنے دیتے، تمہارا کیا جاتا؟"

"وہ سالی ہر روج (روز) نیا عاشق دیکھت پَر اُس کا دِل نہ بھرت....."

"تمہاری باچھیں بھی تو پھیل جاتی ہیں، سونیا کو دیکھ کر....."

"گدی پر فائر نہ مارت مہارانی! وہ اور بات ہووت

ملت ہے..... تیرے کو گولی مارنے کا اس کے سینے میں، پر پہلے بتانے کا....."

میڈم نے آنکھیں بند کرلیں۔ آدھے گلاس میں ہوا، آدھے میں مائع آگ بچی تھی۔ اس نے گلاس لبوں سے لگا کر خالی کردیا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "میں نے کہہ دیا ناں کہ یہ کام شہریار کرے گا۔ لیکن ابھی نہیں..... چند دن بعد..... جب میں کہوں گی۔ اب تم جانا چاہو تو نیچے جاؤ اور ڈرائیور سے کہو۔ وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے۔"

میرو شاہ نے جیب سے پان نکال کر منہ میں ٹھونسا، سگریٹ کارٹن پیک کا خاکی رنگ کا موٹا کاغذ تہ کرکے ڈسٹ بن میں پھینکا اور کھڑا ہوگیا۔ ایک اچٹتی نظر مجھے، پھر میڈم کو دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ نکلتے نکلتے ایک ذرا رُکا، پلٹا اور انگلی تان کر بولا۔ "مہارانی! ماڑے ساتھ غصہ نہ کیا کرت ورنہ ماڑے کو جندگی (زندگی) بھر نہ دیکھ سکت....."

میڈم نے نہ اُس کی طرف دیکھا اور نہ کوئی جواب دیا۔ وہ ایک نگاہِ برہم ڈال کر چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "ادھر آؤ!"

میں سمجھ گیا۔ وہ کچھ دیر کھیلنا چاہتی تھی۔ اپنے جذبات کے منہ زور گھوڑے کو چارہ دکھانا چاہتی تھی۔

میں نے بہ عجلت مگر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "اگر آپ مجھے اجازت دے دیں تو میرو شاہ کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ ڈرائیور کو دو مرتبہ....."

"کہا ناں..... ادھر آؤ!" وہ قدرے غصے سے بولی۔

میں بیڈ کے قریب جا کر تھم گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑی ہوگئی۔ گلاس کو دیوار کی طرف اچھالتے ہوئے تھوڑا جھومی، لہرائی اور بانہیں کھول کر مجھے دعوت کناں نظروں سے دیکھنے لگی۔ آنکھیں بولتی ہیں تو کبھی نہ سمجھنے والوں کو بھی سمجھانے لگتی ہیں۔ میں نے اس کی مخمور اور بدن میں اُترنے کی الگ خوبی رکھنے والی آنکھوں میں لکھے ہوئے جذبات خیز لفظوں کو پڑھا، اپنے قلب و ذہن میں ابھرنے والی سرسراہٹوں کو محسوس کیا اور چاہا کہ اس کی ناراضی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دروازہ کھولوں اور یہاں سے بھاگ جاؤں..... مگر سیاہ پینٹ شرٹ سے جھانکتا گلاب گوں حسن خیرہ کن چمک سے آنکھوں پر کامیاب حملہ کر چکا تھا۔ جان کے قلعے کی فصیلوں میں شگاف ڈال چکا تھا۔

مجھے ایک دم ساکت کھڑا دیکھ کر اس نے آنکھوں سے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ "میڈم! میں آپ کے جتنا مضبوط نہیں ہوں۔"

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا، پھر مسکرائی اور بولی۔ "کم آن! مضبوطی آزمانے پر اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ آؤ اپنی منگیتر سے محبت کرتے ہو۔ اس محبت کی طاقت کو میرے قریب آ کر آزماؤ..... ڈرتے کیوں ہو؟ آؤ ناں....."

ناچار ایک قدم بڑھا۔ گھٹنے مخملیں بیڈ شیٹ میں چھپے فوم سے ٹکا کر کھڑا ہوگیا اور مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل پر چلتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر، میرے عین مقابل آ کر تھم گئی۔ وہ جب بھی میرے قریب آتی تھی، میری سانسیں تھمنے لگتی تھیں۔ اب بھی مجھ پر عجیب سی بے خودی طاری ہونے لگی۔ میں چاہنے کے باوجود پیچھے نہ ہٹ سکا۔ اس نے سر اُٹھایا، میری آنکھوں میں جھانکا اور ہونٹوں کو دائرہ شکل میں نیم وا کرتے ہوئے میرے چہرے پر پھونک ماری۔ نامانوس مہک نے میرے حواس کا احاطہ کر لیا۔ اس کے منہ سے شراب کی ناگوار بو کے بجائے خوشبو پھوٹتی دیکھی تو تعجب ہوا۔

اس نے کانفرنس میں یہی پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ تب فاصلے پر بیٹھی تھی۔ دل قابو میں رہا تھا۔ اَب قریب از جان تھی۔ دل کو مٹھی میں لے چکی تھی۔ میں نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر اندر کہیں مزاحمت جنم لے چکی تھی اس لیے تھما رہا۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں، مزید قریب نہیں ہوسکتی تھی مگر ہوگئی اور اپنا وزن مجھ پر ڈال کر بولی۔ "عمومی طور پر لڑکیاں قریب آنے کی خواہش دل میں پالتی ہیں اور عین موقع پر ان کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ مرد ہو کر بھی مجھ سے دور بھاگتے ہو۔ مجھ میں کوئی کمی ہے یا....."

اس نے اپنی بانہیں میرے گرد پھیلاتے ہوئے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر میرے ذہن کو چیلنج کے حصار میں دے دیا تھا۔ بعض ادھورے جملے اپنے تئیں پورا متن دیتے ہیں۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے میڈم! میں اپنی اوقات کو دیکھتا ہوں تو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔"

"میری بانہوں میں کھڑے ہو، میری سانسوں سے سانسیں چُرا رہے ہو، پھر بھی اوقات کا گلہ کرتے ہو۔" اس کی آنکھوں میں شرارت اور عشق کی بساط پر پیادے بڑھانے کی کھلی دعوت عیاں تھی، بولی۔ "میرے بزنس نیٹ ورک میں سب سے اہم فرد میرو شاہ ہے۔ وہ مجھے انکار کرسکتا ہے، ڈانٹ لیتا ہے اور روٹھنے کی اداکاری بھی کر دکھاتا ہے۔ اس کی اوقات تم نے دیکھ ہی رکھی ہے۔"

اس کی سانسوں کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ اچانک علیحدہ ہو کر بیڈ سے اُتری۔ میرے عقب میں آئی۔ میں بے اختیار پلٹا۔ دیکھنا چاہا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ تب اس نے میری چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور کا دھکا دیا۔ میں کمر کے بل بیڈ پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنا چاہا مگر اس کے کوٹ سے جھلکتے بدن کی لپک میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ وہ مجھ پر لیٹ گئی اور اپنا چہرہ میری چھاتی پر رکھ کر یک دم ساکت ہوگئی۔ اس کی سانسوں کا گرم لمس میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر سرسرانے لگا۔

میں نے اُٹھنا چاہا۔ نہ اُٹھ سکا۔ مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "میڈم!"

اس نے میرے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے خاموش ہونے پر کھیلنے لگی۔ قدرے بھاری آواز میں ہولے سے بولی۔ "میرا جوڑا کھول دو۔"

میں نے اپنی زندگی میں کسی کو جوڑا باندھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نہ کبھی کھولا ہی تھا۔ کیسے کھلتا تھا؟..... پتا چلا مگر اس کی ریشمی زلفوں نے تب تک مجھ سے تمام منظر چھین لیے کیونکہ اس کے بال کھل کر میرے چہرے پر پھیل گئے تھے۔ بالوں سے پھوٹنے والی بھینی بھینی خوشبو نے میرے ذہن کو اپنی مسحور کن گرفت میں لے لیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی تاب نہ رہی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

اس کے مضطرب ہاتھ نے میرے لبوں کو آزاد کردیا۔ گریبان کے بٹن کھول دیے۔ جونہی اپنے سینے پر اُس کے ہاتھ کا گداز اور پُرحدت لمس جاگا، میری سانسیں تھمنے لگیں۔ میں نے مزاحمت کی مگر اس میں جان نہیں تھی۔ میں نے بدقت تمام کہا۔ "میں زرخرید کھلونا ہوں مگر آپ یہ خیال کیوں نہیں رکھتیں کہ اس کھلونے میں ایک دل بھی موجود ہے۔"

چونکی، سر اُٹھایا اور میرے چہرے پر اپنی زلفوں کی آبشار کو سرسراتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔ "تم کھلونے نہیں، میرے دوست ہو۔ دوست کا دل ڈھونڈ رہی ہوں۔"

"میں دوست نہیں؛ ملازم ہوں۔ آپ مجھے اپنے کمرے میں لا کر کچھ دیر کھیلتی ہیں۔ پھر دور جانے کا حکم دیتی ہیں۔ میں آتا ہوں، چلا جاتا ہوں، بے جان انداز میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہوں مگر اپنی مرضی سے آپ کو چھو نہیں سکتا۔ آپ کو دیکھ نہیں سکتا..... کیا میں دوست ہوں؟" میرے لہجے کی بے بسی نے موہوم طنز کی صورت اختیار کرلی۔

"تم غلط کہتے ہو۔"

"ٹھیک کہا ہے؟"

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ کچھ فاصلے پر بوتل پڑی تھی۔ بوتل کے ساتھ اس کا موبائل فون پڑا تھا۔ اس نے فون تھاما، میرے سینے پر رکھ کر سر ڈال دیا۔ زلفوں نے پھر میرا احاطہ کرلیا۔ وہ مجھ پر لیٹے لیٹے فون سے کھیلتی رہی، پھر فون میرے سینے پر رکھتے ہوئے مترنم آواز میں گنگنائی۔ "تجھ میں رب دکھتا ہے، یارا میں کیا کروں....."

وہ خاموش ہوئی تو فون بول پڑا۔ مدھم موسیقی کی لے کے ساتھ کمرے میں مردانہ آواز گونج گئی۔ "تو ہی تو جنت میری، تو ہی میرا جنوں..... تو ہی تو منت میری، تو ہی روح کا سکوں..... اور کچھ نہ جانوں، میں بس اتنا ہی جانوں؛ تجھ میں رب دکھتا ہے، یارا میں کیا کروں....."

گیت چل رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے سن رہے تھے۔ گیت تھم گیا۔ یوں لگا جیسے دنیا تھم گئی ہو۔ کارِ جنوں میں مبتلا، اپنے ہاتھ کی پیدا کردہ سرسراہٹوں سے بے خبر، جذبات سے مغلوب لہجے میں بولنے لگی۔ "شہریار! میں امیر ہوں۔ پڑھی لکھی ہوں۔ جو چاہتی ہوں، خرید لیتی ہوں۔ انسان بھی..... مگر میرا دل بھی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا شخص ہو جو میری ان خوبیوں سے ماورا ہو کر مجھ سے پیار کرے۔ تم تازہ دل شخص ہو۔ دیہات کی تازہ فضا سے نکل کر سیدھے یہاں آئے ہو۔ تبھی ڈرتے ہو۔ دل کی بات کرنے سے بھی گھبرا جاتے ہو۔ میں جس دم چاہوں کہ تم ہاتھ بڑھا کر مجھے توڑنے کی کوشش کرو، تم اپنے ہاتھوں کی رگوں سے خون کھینچ لیتے ہو کہ کہیں وہ اپنی گرمی سے مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچا دیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

"کیا عزت کرنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے؟" وہ سر اُٹھا کر تھوڑا اوپر کھسکی، جان لبوں تک آ گئی تو وہ تھم گئی، بولی۔ "شہریار! میرو شاہ نے دھن کی دنیا میرے لیے پلیٹ میں سجا کر رکھ دی۔ میری دولت اور طاقت نے تن کی دھونکنیاں میرے سامنے پیش کردیں۔ جیسے تم! نہ چاہتے ہوئے بھی میرے نیچے پڑے رہنے پر مجبور ہو۔ دل غزالہ، غزالہ کرتا ہے۔ زبان میرے احترام کا کلمہ پڑھتی ہے۔ مگر مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔"

"تو کیا چاہیے آپ کو؟" بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔

"مجھے شیلف میں جھاڑ پونچھ کر رکھی گئی وہ کتاب نہیں بننا جس کو پڑھنے کے بجائے شوق بھری نظروں سے دیکھ کر شیشے میں قید کردیا جاتا ہے۔ مجھے کھولو، پڑھو..... کیا لکھا ہوا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ تحریر مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو۔

ہوسکتا ہے کہ اس تحریر میں بلاخیزی ہو، جنوں ہو یا ورق ورق خالی ہو اور کسی حقیقی شبد کار کا منتظر ہو......''

میں نے سوچا، وہ تشنہ تھی۔ اپنے پڑھے جانے کی آرزو میں گھل رہی تھی۔ تبھی میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ شادی کیوں نہیں کرلیتی ہیں؟''

اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ فون میرے سینے سے پھسل کر پہلو کی طرف گر گیا۔ اس نے چہرہ میری آنکھوں کے مقابل لا کر گہری اور مستفسر آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور ایک ذرا توقف کے بعد پوچھا۔ ''کس سے؟''

میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر گڑبڑا گیا۔ اس نے سر جھٹکا۔ اپنی زلفوں کے احاطے میں رکھتے ہوئے مجھ پر جھک گئی۔ دونوں آنکھوں کو چومنے کے بعد ہونٹوں کو آگ لگانے لگی۔ پھر چابی والے کھلونے کی طرح رُک گئی، بولی۔ ''تمہاری آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ زبان جھوٹ کا سہارا لیتی ہے۔ آنکھوں سے بتاؤ کہ مجھے کس سے شادی کرنی چاہیے؟''

میری آنکھوں میں سوائے اس کے حسن بلائے جاں کی توصیف کے کچھ نہیں تھا۔ مگر وہ اپنے مطلب کی ہی کوئی تحریر کھوج رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے چھوڑ دیں ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔''

وقت جانتا تھا کہ ایسے موقع پر دم نہیں گھٹتا، سانسیں گھٹنے لگتی ہیں، تبھی میرا جھوٹ سن کر روٹھ گیا اور میڈم کی انگلی تھام کر چلنے لگا۔ وہ مسکرائی، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی۔ ''میں جس سے چاہوں، شادی کرسکتی ہوں۔ کس سے شادی کرنی ہے؟ یہ فیصلہ بھی وقت آنے پر کرلوں گی۔ ابھی تم خاموش ہوجاؤ۔ میرے دل کو چند نئی دھڑکنیں لینے دو۔''

ناگن کی طرح بل کھا کر سیدھی ہوئی، پھر نیچے کھسک گئی اور میرے وجود پر رہتے ہوئے کروٹ بدل کر سینے پر سر رکھ کر خاموش ہوگئی۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ جسم ہلکی آنچ پر دہک کر الاؤ گیر ہوگیا۔ سانسیں غیر معتدل ہوگئیں۔ جی چاہا کہ اُسے پرے پھینک کر اس دشتِ جنوں سے نکل جاؤں۔ شاہد سلیم نے کہا تھا کہ یہ دنیا ٹارچر سیل ہے۔ مصیبت گاہ ہے۔ ایک زندہ، گرم اور تڑپتی ہوئی مصیبت میرے سینے پر چڑھی میری جوانی کی سردسل پر مونگ دل رہی تھی اور پُر حدت سانسوں کی ضربوں سے میرے وجود کو چکنا چور کرنے پر کمربستہ تھی۔

میں نے زچ ہوکر کہا۔ ''مجھے جانے دیں۔''

اس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔ بولی۔ ''نہیں...... خاموشی سے لیٹے رہو اور میرے بال سمیٹ دو۔''

میرا ایک بازو آزاد تھا جس سے آدھے بال سمیٹ دیے۔ آدھے بکھرے رہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے نرم اور سرکتے ہوئے بالوں سے کھیلتا رہوں۔ بس اتنی ہی دیر...... جتنی دیر تک میرا دل دھڑک رہا تھا...... وہ سرتاپا حسن کا مکمل شاہکار تھی اور شاہکار کبھی کبھار تخلیق پاتے ہیں۔

اس نے پھر کروٹ بدلی، گردن تلے دونوں ہاتھ ڈالے اور بالوں کو جھٹک کر مجھ پر پھیلا دیا۔ میری بے بسی سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسی اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر اس نے اپنے سینے پر اوپر تلے رکھ کر اپنے ہاتھوں تلے بھینچ لیے۔ میرے تنے ہوئے اعصاب بے جان ہوگئے۔

کافی دیر گزر گئی۔ اس کی سانسوں کے مخصوص تسلسل نے مجھ پر باور کرایا کہ وہ سوچکی تھی۔ عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں تنہائی میں بے فکری کی نیند نہیں لے پاتیں۔ خوابوں کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں آدھی سوتی، آدھی جاگتی ہیں۔ مستزاد یہ کہ وہ جس دنیا میں سانسیں لیتی تھی، اس دنیا میں اپنے سائے پر بھی شک کرنے کا رواج تھا۔ بظاہر یہ اُس کا بیڈروم تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ یہاں سویا نہیں کرتی تھی۔ سونے کے لیے وہ اس کمرے سے گزر کر کسی اور جہان میں جایا کرتی تھی جہاں اس نے اپنی حفاظت کے لیے بہت سے انتظامات کررکھے تھے۔ آج بھی احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر میرے سینے پر لیٹی سوگئی تھی۔ یوں کہ اُسے مجھ سمیت کسی سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

اس کا وجود بھلے موٹے کوٹ اور پینٹ میں چھپا ہوا تھا مگر میرا احساس برہنہ پا تھا۔ میری عمر بھی آتش گیر تھی۔ ایسے میں اس کا شعلے کی نوک پر گہری نیند سوجانا حقیقت کا پرتو نہیں تھا۔ وہ یقیناً بن رہی تھی۔ مجھے بنا رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی، بدن ڈھیلا چھوڑا اور اپنا دھیان بدلنے کے لیے کمرے کے دکھائی دینے والے گوشے پر نظریں جما دیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا میں نے اس سے پیشتر ملاقاتوں میں دیکھا تھا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو وہ میرا مقام تھا، میری حیثیت تھی جو اس وقت شدید ہیجان اور جذباتی بھونچال کا شکار تھی۔

ہاتھ حرکت کے قابل نہیں رہے تھے اور نہ ہی میں انہیں ہلا کر نئے فتنے کو جگا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے ہونٹوں سے اُس کے بالوں کو چھیڑا، کوٹ کے کالر کو دانتوں میں لے کر ننھے ننھے جھٹکے دیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کافی دیر گزر گئی۔ اس کے استغراق اور سکوت میں کوئی تغیر

[...] پذیر نہ ہوا تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں کب تک اپنا دامن بچائے یوں بے جان انداز میں اس کے خوب صورت بدن تلے دبا رہ سکتا تھا؟...... مجھے شبہ تھا کہ وہ جاگتے ہوئے سونے کی اداکاری کررہی تھی مگر پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کوئی شخص اتنی دیر تک ڈھیٹ بن کر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ سوگئی تھی۔

ہم ابتدائے شب میں کمپیوٹر کالج کے کانفرنس روم سے آئے تھے۔ بیڈ کے عین اوپر آویزاں دیوار گیر گھڑی پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات کے دس بجنے لگے تھے۔ اُس کی خوابیدگی کا دورانیہ ایک گھنٹے سے متجاوز ہوگیا تھا۔ اتنی دیر سے میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا، کبھی ہار کی طرف مائل، کبھی جیت پر استوار...... لڑکھڑاتے ہوئے ذہن کو قابو میں رکھنا مشکل تھا مگر اس کی شخصیت کی ٹرانس، حاکمانہ مزاج اور اپنی حیثیت کا حقیقت پسندانہ احساس میری فتح میں بنیادی کردار ادا کرتا رہا اور میں کوئی حرکت کیے بغیر پڑا رہا۔

پھر ساڑھے دس بج گئے۔ دل میں خوف جاگا کہ کہیں اس دار پر لٹکتے ہوئے پوری رات آنکھوں میں نہ کاٹنی پڑ جائے۔ ایسے ہی وقت میں اس کے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ میں نے چہرے پر پھیلے بالوں کو سر ہلا کر ایک طرف ڈھلکایا، دیکھنے کی جگہ بنائی اور موبائل فون کی روشن اسکرین پر جلتے بجھتے ہندسوں کو دیکھنے لگا۔ میڈم کے بدن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ کا فون بج رہا ہے۔''

میں نے اپنے ہاتھوں کو ہلایا۔ میرے یرغمال من میں نیا فتنہ جاگ پڑا۔ لحظہ بھر میں پورے بدن میں بجلی کی رو دوڑی۔ بہ وقت تمام، ہونٹ بھینچ کر، آنکھیں سختی سے میچ کر، میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ کسمسا کر بیدار ہوگئی تو میں نے اپنی بات دہرائی۔

وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔ ''بجنے دو!''

''کوئی ضروری کال ہوسکتی ہے۔''

''نمبر دیکھ رہے ہو تو بتاؤ...... صرف آخری تین ہندسے۔'' اس کی آواز مرتعش تھی۔

میں نے اسکرین پر دیکھا، پھر کہا، ''زیرو ڈبل نائن......''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''اَن نون نمبر ہے۔ کسی کے ہاتھوں میں کھجلی ہورہی ہے۔''

بزر ایک مرتبہ بج کر خاموش ہوگیا۔ پھر بجنے لگا۔ وہی نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''وہی ہے ناں؟''

''جی!'' میں نے کہا۔ مجھے اپنی آواز کی شکستگی کا ازخود احساس ہوا۔ کمزور سی صدائے احتجاج بلند کی۔ ''میڈم! خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔''

اس نے رحم کرنا نہیں سیکھا تھا، نہیں کیا تو میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے ہاتھ کھینچنے چاہے۔ وہ بظاہر بے جان، درحقیقت چوکس تھی۔ میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے ہنسی، بولی۔ ''اوں ہوں...... کچھ دیر ایسے ہی پڑا رہنے دو۔''

''مجھے خود پر ترس آنے لگا ہے۔''

''مجھے بھی...... تبھی کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ دیر تک زندگی کا احساس حاصل کرنے دو۔ پھر تمہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گی۔''

موبائل فون کا بزر تیسری مرتبہ بجنے لگا۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ چھوڑ دیا، بولی۔ ''کال ریسیو کرو اور وائڈ اسپیکر آن کردو۔''

میں نے بتایا کہ مجھے اس کے موبائل سیٹ کے آپریٹنگ پینل کا علم نہیں تھا۔ اس نے میرا دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور ناگن کی طرح تڑپ کر اوندھی ہوگئی۔ ہاتھ بڑھا کر فون قریب کیا مگر بیڈ پر پڑا رہنے دیا۔ کال ریسیو کرتے ہی کوئی بٹن دبایا۔ وائڈ اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ کسی نے 'ہیلو' نہیں کہا تھا بلکہ چند لمحوں تک سائیں سائیں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر ایک چیختی ہوئی نسوانی آواز گونجی۔ ''تیکوں آدھی ہاں پئی جو میکوں اوندھا کئی پتا کائنی...... خدا کیتے ساڈی جان چھوڑ ڈیوو......''

(تجھے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اُس کا علم نہیں ہے۔ خدا کے لیے ہماری جان چھوڑ دو۔)

نسوانی لہجے سے عیاں تھا کہ وہ کوئی بوڑھی اور ان پڑھ خاتون تھی جو بڑے درد میں ڈوب کر چیخی تھی۔ وہ آواز اپنی تمام تر ناتوانی کے باوجود کسی شعلے کی طرح بھڑکی تھی۔ کسی کوندے کی طرح لپکی تھی۔ کیونکہ مجھ پر ڈھیر ہوئے پڑے میڈم شکیلہ کے ست وجود کو اچانک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر اُٹھی۔ اس کے ہٹتے ہی میں بھی اُٹھ گیا۔ اس نے فون اُٹھایا، زور سے 'ہیلو' کہا مگر اسے جواب نہ ملا۔ ایسی آواز سنائی دی جس سے صاف پتا چلا تھا کہ بولنے والی بوڑھی خاتون کو کسی نے زوردار تھپڑ دے مارا تھا۔ اس کی چیخ بڑی دردناک تھی۔

''اللہ دا ناں ہوے...... میکوں ناں مارو...... نا نہ جو ڈسا سگدی جو اَہ موئی کتھ وَدی ہے تاں کیوں نِوے منیندے...... ہائے وے میڈے ربا!''

(اللہ کا نام مانو، مجھے نہ مارو، میں نہیں بتا سکتی کہ وہ کہاں ہے تو تم لوگ کیوں نہیں مانتے۔ ہائے میرے ربا!)

وہ میری طرف پشت کیے گھٹنوں کے بل بیٹھی فون کو گھور رہی تھی۔ میں جلدی سے بیڈ کی پائنتی کی جانب آیا۔ اسے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کا چہرہ بے حد سرخ، آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیلی ہوئیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ فون کے وائڈ اسپیکر میں سے اُسی خاتون کی منت سماجت کی نقاہت سے معمور آواز برآمد ہو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آواز ایک کم سن بچے کے رونے کی آواز میں دب گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میڈم کو ما میں چلی گئی تھی کیونکہ اس کا زندگی سے بھرپور چہرہ موت کی طرح سنگین ہو گیا تھا۔ چہرے کی سرخی پیلی چادر اوڑھنے لگی تھی۔

کوئی تیسری آواز سنائے بغیر کال منقطع کر دی گئی۔ کمرے میں روتے ہوئے بچے اور بوڑھی خاتون کی آوازیں چکرانے لگیں۔ میڈم پہلو کے بل کھلی ہتھیلی پر گر گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''میڈم! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟''

اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فون سے پھوٹنے والی دل شگاف آوازیں سن کر مجھ سے بے خبر ہو گئی تھی۔ میں نے ہمت کی اور اس کے مقابل بیڈ پر ٹک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا پھر فون اُٹھا لیا۔ جس نمبر سے کال آئی تھی، اُس نمبر پر کال 'او کے' کی۔ دوسری طرف گھنٹی بجی پھر کسی نے کال منقطع کرتے ہوئے سمجھا دیا کہ اسے جتنا سنانا ضروری تھا، سنا دیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اُسے کچھ نہیں دیا جائے گا۔

اس نے جھنجلا کر نمبر ری ڈائل کیا۔ اس مرتبہ فون کے اسپیکر میں 'آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے.....' کا ریکارڈ شدہ وائس کلپ چلنے لگا۔ میڈم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے فون بیڈ پر ڈال دیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کے چہرے پر ایسی مردنی چھائی ہوئی دیکھی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے کانوں میں پڑنے والی دونوں آوازوں کا تعلق براہِ راست اس کی ذات سے تھا۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ کی حالت درست نہیں ہے۔''

میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود پر طاری ہونے والی اس جانکاہ کیفیت سے نکل آئے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بدستور پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھے گئی۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''بتائیں ناں، کیا ہوا ہے؟''

میرے جھنجوڑنے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی لہر دوڑی۔ اس نے طویل سانس لے کر، مجھے ایک شناسائی بھری نظر دیکھ کر اپنا موبائل فون اُٹھایا۔ ایک مرتبہ پھر کال ملانے کی کوشش کی۔ ناکام ہونے پر کوئی اور نمبر ملانے کے لیے بٹن پش کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ''ہیلو..... پیا! تم اس وقت کہاں ہو؟''

کمرے میں غیر معمولی سکوت تھا۔ تبھی پیا کی آواز بغیر وائڈ اسپیکر کے میرے کانوں میں پہنچی۔ وہ مؤدبانہ انداز میں بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی ہوٹل میں بیٹھا کھانا سرو کیے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

میڈم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''کھانا چھوڑ دو۔ میں ایک نمبر تمہیں ایس ایم ایس کے ذریعے بھیج رہی ہوں۔ اس کا پتا کرو! کس کا ہے اور کہاں چل رہا ہے۔ او کے؟''

پیا نے جواب دیا۔ ''جی میڈم! آپ کو ایک گھنٹے میں رپورٹ مل جائے گی۔''

میڈم نے سختی سے تاکید کی، ''نہیں..... میرے پاس وقت کم ہے۔ پندرہ بیس منٹوں میں رپورٹ دو۔''

اس نے پیا کی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کیا۔ 'پاور آف' ہونے والے فون کا نمبر پیا کے سیل فون پر 'سینڈ' کیا اور دونوں رانوں پر ہتھیلیاں ٹکا کر بیڈ پر جھکتی چلی گئی۔ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ بے حد مضطرب تھی۔ اسے میرے دلاسے اور تقویت کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی اور سر اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! مجھے پوری طرح تو علم نہیں کہ آپ اس وقت کس الجھن میں گرفتار ہیں مگر یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ شدید تکلیف میں ہیں۔ آپ خود کو سنبھالیے۔ منتشر ذہن انسان کی مدد نہیں کرتا بلکہ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔''

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی پھر لمبی سانس حلق میں اُتار کر مسکرائی۔ آزردگی میں گندھی ہوئی یہ مسکراہٹ بہت دل فگار تھی۔ ہونٹوں پر عمودی سرخ لائنیں واضح ہو گئیں۔ غور کیا تو اس کی آنکھوں کے گوشے نم دکھائی دیے۔ سر اول کٹ کر رہ گیا۔ سارے تکلفات اُس ایک لمحے کی نذر ہو گئے اور میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ تقویت خیز لہجے میں کہا۔ ''میڈم! آپ رو رہی ہیں۔ نہیں..... میڈم! میں بہت چھوٹا ہوں۔ اتنا کہ آپ کے دکھ کو سمجھنے کی قدرت بھی شاید نہیں رکھتا مگر..... اگر میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ انہیں پونچھنے کے

لیے آپ کی اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ میری گستاخی پر درگزر کیجیے گا۔''

اس کا چہرہ بہت گرم تھا۔ آنسو اس سے بھی زیادہ گرم تھے۔ میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے دکھ کے ڈھلتے دریاؤں کو پونچھ لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ مجھے یک ٹک دیکھتی رہی، پھر ڈھلکتے ہوئے میرے زانوؤں پر اوندھے منہ گر گئی۔ میں نے اس کے آبشار بالوں میں اپنی انگلیاں پیوست کر دیں اور کہا۔ ''اگر مناسب سمجھیں تو مجھے حکم دیجیے..... کس نے آپ کا دل دکھایا ہے؟ میں اس پر قہر بن کر ٹوٹ پڑوں گا اور ان دو آنسوؤں کا خراج منوں خون کی صورت میں وصول کر کے پلٹوں گا۔''

وہ چند آنسو رو کر تھم گئی تھی۔ اب رو نہیں رہی تھی کیونکہ اُس کا بدن ساکت تھا۔ کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات مجھ سے چھپا رہی تھی، تیزی سے کچھ سوچ رہی تھی اور فیصلہ کرنے کی مہلت لے رہی تھی۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ دو چار منٹ..... یا..... کچھ زیادہ وقت لینے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی، اچھل کر بیڈ پر کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''شہریار! تیاری کرو! تمہیں اپنے گھر اور مجھے کہیں دور جانا ہے۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کہاں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ فون اُٹھا کر بیڈ سے اُتری اور جلدی جلدی شوز پہننے لگی۔ اس کے اعصاب میں یک لخت بجلی سی بھر گئی تھی۔ بیڈ کے دراز میں سے ایک سلور کلر کا اسمارٹ سا پسٹل نکالا۔ میگزین نکال کر چیک کیا۔ مٹھی بھر فالتو گولیاں نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیں۔ ایک اڑھائی تین انچ چوڑا سنہرے رنگ کا ہیئر بینڈ نکال کر اُس نے اپنے بالوں پر چڑھا دیا۔ اگر جوڑا کھل بھی جاتا تو اس کے لمبے بال اُس کے لیے کوئی فوری پریشانی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ صوفے اور بیڈ کے عین بیچ میں ترچھے پڑے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رُکی، بالوں کو ہاتھوں میں بھر کر جوڑے کی شکل میں سمیٹا اور تیزی سے بولی۔ ''چلیں..... میں تمہیں شہر میں کہیں اُتار دوں گی۔ رکشا پکڑ کر گھر چلے جانا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک خیال آیا کہ وہ بہت زیادہ پریشان تھی۔ اس کا کہیں اکیلے جانا اس وقت کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔ کچھ غلط ہو جاتا تو میرو شاہ میرا جینا دوبھر کر دیتا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''کہاں؟'' وہ بے رُخی سے بولی۔

''جہاں آپ جا رہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر..... نہیں..... میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں جا رہی۔ میرا وقت نہ ضائع کرو اور چلو.....''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو اس حالت میں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ ساتھ جاؤں گا۔''

وہ ٹھٹکی اور مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگی، بولی۔ ''مگر کیوں؟''

''بھلے ناراض ہوں مگر میں نے آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' میرے انداز سے میرا تیقن اور اس کی ذات سے خلوص ہویدا تھا۔ ''میڈم! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت طاقتور ہیں، کسی بھی صورتِ حال سے بہ آسانی نمٹ سکتی ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا؛ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

اس نے کچھ دیر سوچا پھر میرے اصرار کے آگے ہار مان لی، بولی۔ ''او کے! آر یو فٹ فار دی ریشنگ ایکشن؟''

میں نے خلوص دل سے کہا۔ ''یس، آئی ایم فٹ میڈم!''

''ایک اور بات.....'' اس نے بے حد درشتی سے کہا۔ ''تم کچھ پوچھو گے نہیں۔ بس دیکھنے پر اکتفا کرو گے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے قبول ہے میڈم!''

اس نے مجھ پر ایک نگاہ عجب ڈالی، انٹر کام پر سونیا کو اپنی روانگی سے مطلع کرتے ہوئے کنٹرول پینل پر بیٹھنے کا حکم دیا اور ریسیور کو بے دردی سے کریڈل پر پٹخ کر میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''کم آن! ہری اَپ!''

چند منٹ قبل دکھائی دینے والی ملول لڑکی چاق چوبند، زیرک اور سفاک آنکھوں والی میڈم شکیلہ کا روپ دھار کر میری نظروں کے سامنے سج گئی۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ میں آئے۔ اس نے بلند آواز میں ظاہر خان کو گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔ جلدی میں گاڑی کی چابی اُٹھانا بھول گئی تھی۔ احساس ہونے پر، تیز تیز قدموں سے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''شہریار! ٹیبل پر گاڑی کی چابی پڑی ہے۔ اُٹھا لاؤ۔''

میں دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں گیا۔ چابی اُٹھائی اور پارکنگ میں آیا۔ اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں چابی پکڑی، گیٹ کھولا اور اچھل کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بٹن دبا کر برابر والا گیٹ بھی کھول دیا۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے تک میں اگلی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

اس نے کھلے ہوئے گیٹ میں گاڑی روکی، ہاتھ کے

اشارے سے ظاہر خان کو بلایا اور کہا۔ ''اپنی گن اور فالتو راؤنڈز شہریار کو دے دو۔ اپنے لیے اندر سے گن نکال لاؤ۔''

ظاہر خان نے گن اور فالتو میگزین میرے حوالے کردی۔ وہ شاید کوٹ کی بڑی جیب سے اور گولیاں نکال کر مجھے دینے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر میڈم نے ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھادی۔

میں نے گن اپنی ٹانگوں کے بیچ کھڑی کی، میگزین سائڈ پاکٹ میں ڈالی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہونٹ بھینچے ہوئے، آنکھیں سلگتی ہوئیں اور پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنا ہوا..... وہ سخت برہم، افسردہ بھی۔ میں نے دل ہی دل میں 'یا اللہ خیر!' کہا اور ڈیش بورڈ میں نصب ڈیجیٹل کلاک پر وقت دیکھا۔ پونے گیارہ کا عمل تھا۔ شہر جاگ رہا تھا۔ اس وقت تک دیہاتوں میں رہنے والے اپنی آدھی نیند پوری کر چکے ہوتے ہیں۔

وہ خطرناک ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی کو بچا نہیں رہی تھی، لوگ اپنا بچاؤ خود کر رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ٹوکا۔ اس پر اثر نہ ہوا۔ دوسری مرتبہ اسے احتیاط سے چلانے کا مشورہ دینے کی جرأت مجھ میں پیدا نہ ہوئی۔ ہم عزیز ہوٹل کی طرف گئے، پھر اوور ہیڈ برج عبور کر کے شجاع آباد روڈ پر چڑھ گئے۔ یہاں دن میں تنگ سڑک پر انسانوں کا کھوئے سے کھویا چھلتا ہے۔ رات کو بھی سڑک ویران نہیں ہوتی۔ اسٹیئرنگ ویل پر اس کی بانہیں بڑی تیزی سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں اور بڑی جسامت والی نئے ماڈل کی گاڑی شارک مچھلی کی طرح بل کھاتی لہراتی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ میں نے پیا جی اور سخی محمد کی ڈرائیونگ کو باکمال ڈرائیونگ کا درجہ دیا تھا۔ اس کی ڈرائیونگ کو دیکھا تو جو کلمے پڑھ رکھے تھے، سبھی دل ہی دل میں ان گنت مرتبہ دہرا لیے۔ اسے بارہا شاباش بھی دی کیونکہ میرے اندازے کے مطابق جہاں سے گاڑی گزر نہیں سکتی تھی، اُس نے رفتار کم کیے بغیر گزار دکھائی تھی۔ اس کی ٹھہری ہوئی آنکھیں اور سپاٹ چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نہیں تھی اور اس کا یہ جذباتی روپ پہلی مرتبہ مجھ پر آشکار ہوا تھا۔

بیس منٹ بعد ہم ناگ شاہ چوک پر پہنچ کر شاہراہ عبور کر رہے تھے۔ میں اس طرف پہلی مرتبہ آیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ علاقہ زرخیزی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا جبکہ آنکھوں کو بے آباد اور قدرے ویران علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاید سڑک کے قرب و جوار میں فصلیں نہیں تھیں۔

سڑک کے کنارے پر ایستادہ سفید رنگ کے سنگِ میل دیکھ کر اندازہ کر چکا تھا کہ ہم شجاع آباد کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ دور تک باغات کا سلسلہ ہمارے دائیں بائیں چلتا رہا، پھر ختم ہوگیا۔ میڈم کے فون کا بزر بجا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ کال اٹینڈ کی، بولی۔ ''ہاں پیا! جلدی بولو؛ کچھ پتا چلا؟''

اسپیڈومیٹر کی سوئی ایک سو بیس پر تھرک رہی تھی۔ رات کو کراسنگ کا مرحلہ مشکل ہوتا ہے۔ مگر میڈم نے اسپیڈ کم نہیں کی تھی۔ میں نے میڈم کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ پیا کی رپورٹ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ وہ بولی۔ ''نہیں..... تم فکر نہ کرو۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ موبائل جیب میں ڈالنے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر اسٹیئرنگ تھام لیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کچھ پتا چلا؟''

اس نے اوپر والے ہونٹ پر نچلا ہونٹ چڑھایا، سر کو نفی کے انداز میں دائیں بائیں جھٹکا اور بولی۔ ''کم بخت فون کمپنیوں نے بوگس ماڈیولز جاری کر رکھے ہیں۔ پیا نے کمپنی کے فرنچائز آفس کے کلرک کے ذریعے کسٹمر سینٹر سے معلومات حاصل کی ہیں۔ سیریل نمبر ضلع فیصل آباد کا تھا اور کسی اکبر علی کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔''

بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار کم کی۔ سامنے نہر کا پل دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دائیں طرف گاڑی موڑ لی۔ نہر کی پٹڑی پر بنی ہوئی سڑک پر گاڑی مچھلی کی طرح پھسل رہی تھی۔ میں نے اَزحد احتیاط سے کہا، ''میڈم! آپ اپنے غصے پر قابو پائیں ورنہ آپ وہ کچھ نہیں کر پائیں گی جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں۔ میں سگرٹ نہیں پیتا۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔ بولی، ''ہم تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد اس نے نہر کی پختہ پٹڑی چھوڑ دی۔ کوئی فرلانگ بھر کا کچا اور ناہموار راستہ حائل ہوا پھر ہم دریا کے سپر بند پر تعمیر کی گئی پختہ سڑک پر چڑھ گئے۔ بائیں ہاتھ پر سپر کے ساتھ ساتھ نہر بہہ رہی تھی۔ ڈرائیونگ کی تھوڑی سی غلطی ہمیں گاڑی سمیت نہر میں غوطہ زن کر سکتی تھی۔ سپر بند کے اوپر سنگل سڑک موجود تھی جس نے نہر کے ایک پل پر دوسری سڑک کو کراس کیا۔ سڑک کے کنارے پر دو آدمی آگ جلا کر بیٹھے ہاتھ سینک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے

بدنوں پر چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ یہیں سے میڈم نے دائیں ہاتھ پر ٹرن لیا۔ اس سڑک پر لوگوں کی آمدورفت دکھائی دے رہی تھی اور سڑک کی حالت بھی خراب تھی۔ کوئی دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے پر ایک سرکاری اسکول کی مخصوص وضع کی عمارت دکھائی دی۔ سطحِ زمین سے کم و بیش دس فٹ بلند تھڑے پر گھروں کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا۔ سڑک بل کھا کر اُس جھرمٹ میں داخل ہوئی پھر 'ایس' کی شکل میں گھومتی ہوئی اس گاؤں سے باہر نکل گئی۔ سڑک پر جا بجا اسپیڈ بریکر بنے ہوئے تھے جن کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ لبِ سڑک تعمیر شدہ گھروں نے اپنے بچوں کو تیز رفتار ڈرائیوروں سے محفوظ کرنے کے لیے ازخود بنا رکھے تھے۔ میڈم نے کسی بھی بریکر پر اسپیڈ آہستہ کی نہ بریک لگائے۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد، ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر بائیں ہاتھ ایک سرکاری اسپتال دکھائی دیا۔ نیلے رنگ کے بورڈ پر محکمہ صحت کا مونوگرام اور گاؤں کا نام لکھا ہوا تھا۔ پتا چلا کہ ابھی جس گاؤں سے ہم گزرے تھے، اس کا نام پونٹا تھا۔ اسپتال بند تھا۔ سرکاری کالونی میں روشنیاں جل رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ اس علاقے میں بجلی کی سہولت موجود تھی۔

چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میڈم نے دائیں ہاتھ گاڑی موڑ دی۔ پکی سڑک کی جگہ ایک ناہموار اور کیچڑ زدہ راستے نے لے لی۔ یہ تکلیف دہ سفر ایک کچے مکان پر منتج ہوا۔ اس نے گاڑی آم کے پرانے درخت کے نیچے روکی اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے نیچے اُتر گئی۔

میں نے گن سنبھالی، اس کے آپریٹنگ سسٹم کا سرسری جائزہ لیا اور نیچے اُتر آیا۔ گاڑی کے اندر گرمی تھی، باہر سردی..... آدھے چاند کی روشنی نے ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ گاڑی کے عین سامنے چند قدموں کے فاصلے پر کچا کھال گزر رہا تھا۔ کھال میں پانی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ میڈم گاڑی کے بونٹ ہڈ کے ساتھ ٹیک لگائے میرے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں قریب پہنچ کر حکم کا منتظر ہوا۔ اس نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ بولی۔ ''ہم اس گھر میں داخل ہوں گے۔''

میں نے 'یس میڈم' کہا۔ وہ نپے تلے انداز میں کھال پر سے کود گئی۔ اس کے اعضا میں تجلی بھری ہوئی تھی۔ میرے آگے آگے دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی چھوٹے سے کچے مکان کے پہلو میں پہنچی۔ مکان کی چاردیواری نہیں تھی۔ سامنے کی طرف ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی لکڑیوں کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ لکڑیوں کے ڈھیر اور مکان کے درمیان خلا تھا جس میں سے ہم گزر کر صحن میں پہنچے۔ ایسے ہی وقت میں دو بچے اور خستہ حال کمروں والے گھر کے نسبتاً چھوٹے اور نیچی چھت والے کمرے میں بکریوں کے منمنانے کی آواز گونجی۔ ان کی آواز سن کر سردی میں کانپتے ہوئے دو کتوں کے منہ کھل گئے۔ وہ بھونکتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے علم ہوگیا کہ وہ لڑنے بھڑنے والے کتے نہیں تھے بلکہ عام نسل کے تھے جو محض بھونک کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میڈم نے بھی کتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وگرنہ میرے دیکھنے میں یہ آیا تھا کہ شہری لوگ کتوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ نہیں ڈری بلکہ صحن اور کمروں کے بیچ میں بنے ہوئے فٹ ڈیڑھ فٹ بلند تھڑے پر کھڑی ہو کر چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسا کسی عسرت زدہ مزدور یا سیپی کا گھر دکھائی دیتا ہے۔

کتوں کی پُرجوش آوازیں احتجاج میں بدل گئیں پھر ان پر نالہ و فغاں کا احساس ہونے لگا۔ میں نے انہیں دبکا کر بھگا دیا۔ وہ بکریوں والے کمرے میں گھس کر 'کوں کوں' کرنے لگے۔ میڈم بولی۔ ''تم یہیں رکو، میں اندر جاتی ہوں۔''

اس نے دو کواڑوں والا سالخوردہ دروازہ دھکیلا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ ہولے سے بولی۔ ''اماں..... سیمو.....''

جواب میں ایک لاغر مردانہ کھانسی کی آواز ابھری۔ وہ بولی۔ ''بابا..... بابا!''

''کیہڑا ایں.....؟'' (کون ہو؟) کھانسنے والے نے بیزار لہجے میں استفسار کیا۔

وہ اندھیرے کمرے میں گھس گئی۔ میں دم بخود کھڑا کمرے کے اُدھ کھلے دروازے کو گھورنے لگا۔ یہ ماجرا میری فہم و فراست سے بالاتر تھا۔ تجسس کے مارے میں تھڑے پر چڑھ گیا۔ دروازے کے قریب جا کر صحن کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوگیا۔ میرے عقب میں میڈم کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''بابا! تیرے پاس ماچس ہے؟''

میں نے اسے پہلی مرتبہ سرائیکی بولتے سنا تھا ورنہ جب بھی دیکھا، اُسے رواں اُردو بولتے دیکھا تھا۔ اس کے ایک ہی جملے نے مجھ پر آشکار کر دیا کہ اس کی مادری زبان سرائیکی تھی۔

چند لمحوں بعد دیا سلائی جلانے کی آواز سنائی دی پھر

میرے پیروں تلے کی زمین پیلی ہوگئی۔ کمرے میں لالٹین روشن ہوگئی تھی جس کی روشنی کھلے کواڑ سے چھن کر تھڑے پر روشنی کی لکیر کھینچنے لگی تھی۔ بوڑھی کھانسی بدستور سمع خراشی کررہی تھی۔

میڈم بولی۔ ”بابا! اماں اور سیمو کہاں ہیں؟“

”تو؟“ کھانسی ختم ہوگئی، ”تو چندو ہے ناں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں بابا! میں چندو ہوں۔ یہ بول، وہ دونوں کدھر ہیں؟“

”تو یہاں کیوں آئی ہے؟“ بوڑھی آواز میں بلا کی نفرت گھل گئی، ”وہ مریں یا جئیں، تجھے کیا...... جا...... جیسے آئی ہے، ویسے ہی پلٹ جا۔ یہاں نہ تو کوئی تیری اماں رہتی ہے اور نہ ہی سیمو...... چل! میری نظروں سے دور ہوجا......“

دریا کی خنکی ماحول میں رچی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں شل کرنے والی سردی بوڑھے کے چند بول سن کر ذہن سے محو ہو گئی اور میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میڈم منت سماجت کررہی تھی۔ اماں اور سیمو کے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر بڈھا اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ پھر میڈم کی جھلائی ہوئی آواز آئی۔ ”بابا! مجھے سیدھی طرح بتا کہ وہ کہاں ہیں، اچھا...... یہی بتادے کہ تجھے کون باندھ گیا ہے؟“

”پرے دفع ہوجا کلمونہی...... مجھے ہاتھ نہ لگا۔“

میڈم کی بھرّائی ہوئی شکست خوردہ آواز ابھری۔ ”خدا کے لیے بابا! ان کی جان پر بنی ہے۔ اگر تو نے مجھے کچھ نہ بتایا تو وہ مرجائیں گے۔“

”اگر ان کے دن پورے ہوگئے ہیں تو کون مائی کا لعل انہیں بچا سکتا ہے؟...... کھوں، کھوں...... نہ ہاتھ لگا، نہ کھول مجھے...... بندھا رہنے دے...... نی پراں دفع تھی ونج......!“

(اے! پرے دفع ہوجا!)

میں دروازے کے مزید قریب ہوگیا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم نے مجھے بلایا۔ میں جھٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر کا منظر میرے لیے بڑا حیرت ناک تھا۔ تین چارپائیوں میں سے دو خالی تھیں۔ ان پر بستر کھلے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان پر سونے والوں کو بستر سمیٹنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ تیسری چارپائی پر ایک بوڑھا رضائی میں لپٹا پڑا تھا۔ اس کے سر پر میڈم کھڑی تھی۔ سرہانے دیوار کے ساتھ ایک پرانی، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی بیساکھی نظر آرہی تھی۔

میں قریب ہوا تو میڈم بولی۔ ”اس کے ہاتھ کھولو۔ مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔“

میں نے رضائی کھینچ کر ایک طرف کی۔ بڈھا ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ جونہی میری نظر اُس کے نچلے دھڑ پر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی بالشت بھر لمبی داہنی ران کے نیچے بستر خالی تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ میڈم کو غلیظ گالیاں دے رہا تھا اور مجھے بھی بار بار ”پراں دفع تھی ونج“ کہہ کر جھنک رہا تھا۔ میں نے اس کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے اسے الٹا دیا۔ وہ تڑپا، میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ میں نے اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولے اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”بتاؤ! تمہیں کس نے باندھا ہے اور کیوں؟“

وہ سیدھا ہوا۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں اس کے چہرے پر نظر پڑی تو دل عجیب سے تاسف اور دکھ سے معمور ہوگیا۔ وہ بہت نحیف اور معمر تھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر بے حد درشتی کے آثار مترشح تھے۔ غصے کی شدت سے سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور رہ رہ کر کھانسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ٹھیٹھ سرائیکی میں بولا۔ ”بدمعاشی نہ دکھا اور مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا جا۔ اس بے حیا کو بھی لے جا۔ اسے سمجھا دے کہ اس کا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ہم سب مر بھی جائیں، تب بھی اس کی یہاں کوئی جگہ نہیں ہے...... سمجھا؟ کیوں نہیں ہے تو اسے...... لے جا ناں......“

میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور بڑی نرمی سے کہا۔ ”بابا! ہم ابھی چلے جائیں گے۔ بس اتنا بتا دو کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”م...... میں......“ اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ چند لمحوں میں بدحال ہوکر ایک طرف گر گیا، بولا۔ ”ہائے! میری بکریاں بھوکی پیاسی ہیں...... ہائے! اس کلمونہی کو باہر بھیج دے...... میں بتاتا ہوں......“

میں نے پلٹ کر میڈم کو دیکھا جس کا چہرہ اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ طویل سانس حلق میں اُتار کر بولی۔ ”ٹھیک ہے بابا! میں باہر جارہی ہوں۔ اسے ساری بات بتادے ورنہ بڑا نقصان ہوجائے گا۔“

”نی وَنج پراں کالے موہنہ آلی...... جیہڑا زان تھیونا ہائی، ہیڈے ہتھوں تھی گیا ہا...... بس توں پچھے تھی وَنج...... مگروں لہہ ونج!“

(اے جا پرے کالے منہ والی...... جو نقصان ہونا تھا، وہ تیرے ہاتھوں سے ہوگیا تھا۔ بس تو دفعان ہوجا۔ پیچھا چھوڑ دے۔)

بابا بپھر گیا۔ اس کے منہ سے بلغم آمیز رال نکل کر ڈاڑھی کو بھگونے لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی بالشت بھر کی رانیں پیٹنے لگا۔

میرے اشارے پر میڈم میرے عقب سے گزر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے بڈھے کی کمر تھپتھپائی، ردگرد دیکھا، پانی دکھائی نہیں دیا۔ پوچھا۔ ”بابا! پانی کہاں رکھا ہے؟“

”ہا...... مجھے پپ...... پانی...... ادھر گھڑا پڑا ہوگا۔ ادھر دیکھ......“ اس نے اپنے سرہانے دیوار کی جڑ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے گھڑا جھکایا اور مٹی کا پیالہ جسے مقامی زبان میں ’ٹھوٹھا‘ کہا جاتا ہے، بھرا اور اس کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے بندھا پڑا تھا۔ پیاسا تھا۔ پورا ٹھوٹھا خالی کرگیا۔ یخ بستہ پانی رگوں میں سردی اتار گیا۔ وہ چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگا۔ کچھ افاقہ ہوا تو میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تھک گیا تھا۔ شکست خوردہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”تو کون ہے؟ پر جو کوئی بھی ہے، مجھے کیا۔ وہ ظالم مجھے باندھ کر میری ذال (بیوی) اور میرے سیمو کو اُٹھا کرلے گئے۔“

اس نے اٹک اٹک کر کہا تھا۔ اس کی بات مان لی گئی تھی اور میڈم بادل ناخواستہ کمرے سے چلی گئی تھی مگر اس کے باوجود اس کی عسرت و افلاس میں بجھنے والی آنکھیں ابھی تک شعلہ بار تھیں۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”یہ کب کا واقعہ ہے؟“

”دھمی ویلا ہا! ہائے...... بھک توں آندراں ترٹدیاں کھڑیاں ہِن...... کجھ کھاون کیتے چاتی وداہیں؟“

(صبح کا وقت تھا۔ ہائے! بھوک سے آنتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ کچھ کھانے کو لیے پھرتے ہو؟)

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کون لوگ تھے وہ؟“

”بیٹ سے آئے تھے۔ بیٹ خیر پور سے۔ ایک کو دیکھا تھا۔ ہائے! ہائے! وہ کمینہ پیرو ماچھی تھا۔“ اس نے ہانپتے ہوئے بتایا، پھر کھانسنے لگا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی، ”یہ بیساکھی مجھے دو۔ میری بکریاں بھوکی پیاسی ہیں۔“

”پیرو ماچھی تمہاری بیوی اور بیٹے کو کیوں اُٹھا کرلے گیا؟ اس نے بتایا تو ہوگا۔“ میں نے بیساکھی پر ہاتھ رکھا۔

”اس بے حیا نے مجھے مارا پیٹا مگر بتایا نہیں کہ وہ کیوں میرے بوڑھے چہرے پر کلنک ملنا چاہتا تھا۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق اس کلمونہی نے نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ میری جھولی میں زہر کی پڑیا رکھ گیا ہے۔ پتا نہیں، خدا ہم جیسے لولے لنگڑے غریبوں کو کیوں زندہ رکھتا ہے، اُٹھا کیوں نہیں لیتا۔ بس! اب تو جا...... چلا جا، اس بے حیا کو بھی ساتھ لے جا۔“

حسد کیا ہے؟

☆ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ، لکڑی کو۔

☆ حسد ایک ایسی آگ ہے جس میں جل کر انسان خود ہی راکھ ہوجاتا ہے۔

☆ حسد کی صورت یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر تمنا کرنا کہ کاش، اس سے یہ نعمت چھن کر مجھے حاصل ہوجائے۔

☆ حسد کے بجائے رشک کرو۔

☆ کچھ مانگنا ہو تو صرف خدا سے مانگو کیونکہ تمام دنیا کو وہی سب کچھ دیتا ہے۔

☆ خدا سے دعا ہے کہ ہمیں حسد جیسی بدترین بیماری سے نجات عطا فرمائے۔ (آمین)

مرسلہ: اے غفور خان، اٹک

اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھ چھوڑی تھی جو اس وقت اس کے منہ سے نکلنے والی رطوبت سے تر ہوگئی تھی۔ اس کا جسم زندگی کی ٹہنی سے جڑے ہوئے پیلے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”اتنا بتا دے کہ یہ بیٹ خیر پور کس طرف ہے؟“

”تو کہاں سے آیا ہے؟ کیا تجھے بیٹ کا بھی پتا نہیں۔ دریا کے پاس ہے...... وہ کمینی جانتی ہے۔ اس سے جا کر پوچھ لے......“ اس نے ہاتھ لہرا کر کہا اور پھر اپنی بیساکھی تھام لی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بیٹھا رہے، میں اس کی بکریوں کو دیکھتا ہوں۔ اس نے مجھ پر ایک تفصیلی نظر ڈالی اور نفرت سے زمین پر تھوکتا ہوا بیساکھی کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بدن کی غیر معمولی لرزش خدشہ پیدا کر رہی تھی کہ وہ رات کی اس سردی میں کمرے سے نکلے گا تو ٹھٹھر کر مرجائے گا۔ میں نے اسے یہی بات سمجھانا چاہی مگر

اس نے میری بات پر کان نہ دھرا۔ میں اس سے پہلے کمرے سے نکلا۔ میڈم کو مضطربانہ انداز میں دروازے کے سامنے تھڑے پر ٹہلتے پایا۔ مجھے دیکھ کر فوراً میرے قریب آئی، بولی۔ ”ہاں! کچھ بتایا بابا نے؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”بتا دیا ہے مگر...... وہ غضب کی سردی میں باہر نکل کر اپنی بکریوں کو چارا ڈالنا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ سردی سے مرجائے گا۔ اسے سخت بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔“

وہ بولی۔ ”اسے کمرے میں روکو، لالٹین اور کوئی برتن مجھے لادو! میں اس کے کھانے پینے کے لیے کچھ کرتی ہوں۔“

میں نے حیرت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیا کرلے گی! مگر اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”جلدی کرو شہر یار! ہمارے پاس سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔“

میں الٹے قدموں بڈھے کے پاس آیا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بیساکھی چھین کر دوسری چارپائی پر ڈالی، اسے چارپائی پر دھکیل کر لحاف میں لپیٹا اور کہا۔ ”یہیں پڑے رہو۔ میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ تمہاری بکریوں کو بھی چارا ڈال دیتا ہوں۔ ایسی حالت میں باہر نکلتے ہی گرجاؤ گے۔“

اس کے من میں نفرت کا اتنا بڑا الاؤ جل رہا تھا کہ اسے میرے ہمدردی آمیز رویے نے بھی نرم نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے لحاف سے نکلنے لگا۔ میں نے اسے پھر لحاف میں لپیٹا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو...... نجانے کس ڈھیٹ مٹی سے بنے ہوئے ہو کہ اپنے فائدے کی بات بھی نہیں سمجھتے۔ یہاں کچھ کھانے کو پڑا ہے؟“

اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کمرے کے اس گوشے میں دیوار پر لکڑی کا ایک تختہ دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے چند میلے اور پرانے برتن پڑے تھے۔ میں نے لالٹین اُٹھائی اور برتنوں کی تلاشی لی۔ ایک ٹوٹے ہوئے کناروں والی بالٹی اُٹھالی۔ کندوری میں لپٹی ہوئی آدھ کھائی روٹی مل بھی گئی۔ اسے بڈھے کے پاس رکھا اور بالٹی اور لالٹین لے کر باہر آ گیا۔ میڈم نے میرے ہاتھوں سے بالٹی اور لالٹین چھینی، مجھے بڈھے کے پاس رکنے کا حکم دیا اور بکریوں والے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ وہ بڈھے کو پلانے کے لیے بکریوں کا دودھ دوہنے کے لیے گئی تھی۔

پیرو ماچھی اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر رخصت ہو گیا تھا۔ اس ویرانے میں اسے یہ معمولی سا کام سرانجام دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی ہوگی کیونکہ یہاں عملی طور پر قانون بے دست و پا تھا۔ دریا کے دونوں اطراف بیٹ کا وسیع و عریض علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کی محفوظ کمین گاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں رہنے والے لوگ انہی کے رحم و کرم پر زندگی گزارا کرتے تھے۔

مجھے پوٹا کے سرکاری اسپتال سے لے کر اس کچے مکان تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ مکان کے اطراف دور دور تک کوئی گھر آباد نہیں تھا۔ سکوت میں حشرات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں مجھے یا میڈم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا مگر محتاط رہنا ہمارے دھندے کا بنیادی تقاضا تھا۔ میں نے چوکنے انداز میں صحن کا جائزہ لیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، کوئی حرکت دیکھنے کو نہیں ملی تو مطمئن ہو کر اندھیرے میں احتیاط سے چلتا ہوا بڈھے کے پاس پہنچا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ”ادھر دیا پڑا ہے، وہ جلادو۔“

میں نے اس کی نشاندہی پر دیا سلائی کی مدد سے ٹین کا بنا ہوا ننھا سا دیا جلادیا۔ مٹی کے تیل کی بو کمرے میں پھیل گئی مگر مجھے بڈھے کے نقوش دکھائی دینے لگے۔ وہ رضائی کی بکل مار کر چارپائی کے وسط میں بیٹھا ہوا کھانس رہا تھا۔ سینے کو سہلا کر اپنی کھانسی پر قابو پانے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نفرت کے غیر معمولی تاثرات مستقل طور پر ثبت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس دور افتادہ اور ناخواندہ شخص کو میڈم کے وجود سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ میرے حصے میں بھی بڈھے کا وہی رویہ آیا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”بابا! پیرو ماچھی کے ساتھ کتنے آدمی تھے؟“

اس نے بولنا چاہا مگر کھانسی نے بولنے کی مہلت نہ دی۔ اس نے اپنی انگلیاں پھیلا کر مجھے حملہ آوروں کی تعداد بتائی...... چار...... میں نے پوچھا۔ ”ان لوگوں سے تمہاری دشمنی کیا ہے؟“

اس نے پانی کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹھوٹھا تھمایا، چند گھونٹ پینے کے بعد وہ بے بسی آمیز بیزاری سے بولا۔ ”میری کیا مجال کہ میں پیرو ماچھی سے دشمنی مول لوں...... وہ اس علاقے کا بادشاہ ہے۔ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ کوئی اس کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ میں ایک ٹانگ پر پھدک پھدک کر زندگی گزار رہا ہوں۔ جینا چاہتا ہوں تو جی نہیں سکتا۔ مرنے کی دعا کرتا ہوں تو دعا پوری نہیں ہوتی۔ خدا جانے مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم نے پیرو سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ ان معصوموں کو کیوں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟“

”پوچھا تھا۔ جواب میں اس کے ساتھی نے میرے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ پھر کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔“

اس کا چہرہ بے بسی کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کی حالت زار ہی ایسی تھی۔ بھلا ٹانگ سے معذور شخص، جو زندگی کی آخری کیاری کو پانی لگانے جا رہا ہو، ضعیف اور بے حد ناتواں ہو، وہ کس طرح چار ہٹے کٹے اور اسلحے سے لیس ڈاکوؤں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ میرے دل میں ہلکورے لیتا ہوا تجسس میری زبان پر آ گیا۔ پوچھا۔ ”بابا! تم میری میڈم سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہو؟“

اسے میری بات کی سمجھ نہ آئی۔ حیرانی سے بولا۔ ”کون میڈم؟ میں تو کسی میڈم کو نہیں جانتا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہی لڑکی جسے تم نے گالیاں دے کر کمرے سے نکال دیا ہے۔“

اس کا مدقوق چہرہ مزید بجھ گیا۔ فرطِ نفرت سے غلیظ گالی دے کر بولا۔ ”اس حرامزادی کی تو...... میں اس کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے۔ تم کوئی اور بات کرو......“

ایسے ہی وقت میں میڈم نے مجھے پکارا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ میں مستعدی سے باہر آیا۔ اس نے بالٹی اور لالٹین مجھے تھمائی اور سرگوشی کی۔ ”شہر یار! اسے مت کریدو! تم اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، مجھ سے پوچھ لینا۔ میں تمہیں بتادوں گی۔“

اس کے لہجے کی تلخی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ بالٹی پکڑ کر بے ترتیب پڑے ہوئے برتنوں کے پاس گیا۔ ایک پیالے میں دودھ انڈیلا، بڈھے کو تھمایا اور پینے کا حکم دیا۔ وہ بھوکا تھا۔ بھوک انسان کو توڑ دیتی ہے۔ وہ جس سے نفرت کرتا تھا، جس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، اسی کے ہاتھ کا دوہا ہوا دودھ بغیر سانس لیے حلق میں اتار گیا۔ میں پلٹ کر دروازے میں آیا۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر بولی۔ ”بابا نے دودھ پی لیا؟“

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! مزید کچھ پوچھنا ہے یا بس؟“

وہ بولی۔ ”نہیں۔ وہ کچھ اور نہیں بتا سکتا۔ آ جاؤ۔“

میں نے الوداعی نظر بڈھے پر ڈالی جو اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میڈم لکڑیوں اور کمرے کے بیچ کے خلا سے گزر کر باہر جاتی دکھائی دی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر پہنچا، پھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔ ”میڈم! وہ اکیلا پڑا رہے گا؟“

میرا اشارہ بڈھے کی طرف تھا۔

وہ اختصار سے بولی۔ ”پہلے بھی تو پڑا تھا۔ اب بھی پڑا رہے گا۔ اس نے کچھ مزید بتایا؟“

اس نے باقی باتیں سنی تھیں۔ جس دوران وہ دودھ دوہ رہی تھی، اس دوران ہونے والی باتیں میں نے جلدی جلدی اُس کے گوش گزار کردیں۔ پھر ہم دونوں خشک گوبر پر چلتے ہوئے اپنی لینڈ کروزر کی طرف بڑھے۔ ایسے میں میڈم ٹھٹک کر رک گئی۔ ایڑیوں کے بل گھومی۔ چہار جانب دیکھ کر رُک گئی۔ بولی۔ ”خطرہ......“

اس کے ساتھ ہی اُس نے چھلانگ لگائی اور مجھے ساتھ لیتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ ایسے ہی وقت میں فائر کی ہولناک آواز سے فضا گونج اُٹھی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اٹک گئی۔ چند لمحے پہلے میڈم جہاں کھڑی تھی، وہیں اچٹتی ہوئی گولی زمین پر لگی تھی۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اب تک گولی اس کی ٹانگوں میں سوراخ کرچکی ہوتی۔

میں پہلو کے بل اپنی گن پر گرا تھا۔ اس کی مزل میری پسلیوں میں چبھی۔ میڈم مجھ پر لمحہ بھر کو گری تھی پھر لڑھک کر ایک طرف ہو گئی۔ میں مخالف سمت میں کھسک کر دور ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ پہلی مرتبہ پتا نہیں چل سکا تھا فائرنگ کرنے والا کہاں موجود تھا۔ اب پتا چل گیا تھا کہ جو کوئی بھی تھا، وہ لینڈ کروزر پر سایہ فگن آم کے بڑے درخت میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے دوسرا برسٹ مارا مگر تب تک میں کچی اینٹوں کے ڈھیر کے عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بارشوں میں اَدھ گھلی اینٹوں کے تین فٹ بلند ڈھیر اور میرے عقب میں کمرے کی کچی دیوار میں گولیاں لگ کر ٹھنڈی ہو گئیں۔ فضا میں بارود کی بو پھیل گئی اور تڑتڑاہٹ کی خوفناک آواز بازگشت کی صورت چاروں طرف گونجنے لگی۔

میں نے سر نکال کر میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دی جس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں چھپ کر ٹارگٹ فائرنگ سے محفوظ ہو گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے اچانک خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے ہم دونوں کی جان بچا دی تھی۔ باوجود کہ وہ فوری طور پر خطرے کی نوعیت کو بھانپ نہیں سکی تھی مگر اس نے جو ردِعمل ظاہر کیا، وہی بہت تھا۔

میں نے اپنی گن سیدھی کی، لاک پن ہٹائی اور کرولنگ کرتا ہوا اینٹوں کے ڈھیر کی داہنی اخیر تک پہنچ گیا۔ آم کے درخت کی طرف نال کا رُخ کیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دبیز سیاہی میں چھپے ہوئے کو کھوجنے لگا۔ فاصلہ زیادہ

[illegible]

میرے دائیں طرف بڑھا۔ پھر مجھے اس کی موجودگی کا اندازہ ہوگیا۔ وہ کمرے کی نکڑ پر پہنچ کر دوسرا رُخ لے چکا تھا۔ چونکہ ابھی تک کسی چوتھے شخص کی موجودگی کا شبہ نہیں ہوا تھا، اِس لیے میں خطرہ مول لیتا ہوا کھڑا ہوگیا اور بھاگ کر کمرے کی نکڑ پر پہنچا۔ میڈم کی آواز گونجی۔ ''اسی دیوار کے پاس..... اسی سیدھ میں بھاگ رہا ہے..... فائر کرو!''

میں نے اندازے کی بنیاد پر فائر کیا جو خطا گیا۔ میڈم پھر چیخی۔ ''لکڑیوں کی طرف.....''

میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ نظر نہ آیا۔ میں اونچے کمرے کی چھت پر چڑھ کر بھاگا۔ نکڑ میں گیا تو اُسے لکڑیوں کے ڈھیر کی اوٹ میں دوڑتے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کو دکھائی دیا، پھر لکڑیوں کے پرے کسی گڑھے میں کود کر اوجھل ہوگیا۔ مجھے ناچار پھریخ بستہ چھت پر چھاتی کے بل لیٹنا پڑا۔ کھڑا رہتا تو اس کے نشانے کی زَد میں آجاتا۔ میرے حق میں میرا فوری فیصلہ سودمند ثابت ہوا کیونکہ اس نے گولی چلانے میں لحظہ بھر کی دیر نہیں کی تھی۔ گولی میرے اوپر سے گزر گئی۔

جہاں وہ کودا تھا، میں نے اندازے کی بنا پر وہاں دو فائر کیے۔ اگر میرے پاس گولیاں وافر مقدار میں ہوتیں تو میں برسٹ مارتا۔ اسی مجبوری کی بنا پر میں سنگل شوٹ پر اکتفا کررہا تھا۔

دشمنوں کی تعداد کے بارے میں قائم کیا گیا میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میرے عقب میں پھر پسٹل اور گن کی فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ میڈم کو کسی اور شخص سے نبردآزمائی کا مرحلہ درپیش تھا۔ میرا یکبارگی جی چاہا کہ فوراً میڈم کی مدد کے لیے جاؤں، پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ اس حماقت کے نتیجے میں میرے مقابل چھپا ہوا شخص میرے عقب میں پہنچ کر زِک پہنچا سکتا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے لکڑیوں کے پار جھانک رہا تھا کہ اچانک موہوم سی ہلچل محسوس ہوئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ تیسرا فائر ثمر بار ثابت ہوا اور گھٹی گھٹی سی چیخ ابھری۔ اُسے گولی لگی تھی مگر شاید پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔

میں جلد بازی میں کوئی الٹا سیدھا قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہمارے مابین حائل غیر معمولی فاصلہ صبر آزمائی کا درس دیتا تھا۔ جو بھی خود پر قابو پانے میں ناکام رہتا اور جھنجلا کر باہر نکلتا، وہی کام آجاتا، اس لیے میں دم سادھے لیٹا رہا۔

شاید اسے گولی کی تکلیف نے بے چین کردیا تھا یا وہ ازخود مطمئن ہوگیا تھا کہ میں میدان صاف دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ہوں؛ وہ اچانک کھڑا ہوا اور لنگڑاتے ہوئے کھلے کھیت کی طرف دوڑا۔ یہ اُس کی احمقانہ حرکت تھی جس کی کم ازکم مجھے اُس سے توقع نہیں تھی۔ شاید وہ تکلیف کی شدت کو برداشت نہیں کرپایا تھا اور دیوانہ وار بھاگ اُٹھنے پر کمربستہ ہوگیا تھا۔ جو بھی تھا، میرے لیے بڑا فائدہ مند تھا اور میں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوڑتے ہوئے دشمن کا نشانہ لیا، فائر کیا جو خطا گیا۔ دوسرا فائر بھی خطا گیا۔ وہ زگ زیگ کے انداز میں بھاگ رہا تھا۔ یہاں برسٹ کی ضرورت تھی۔ مجبوراً میں نے برسٹ آپریشن آن کیا اور نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ ٹریٹ..... ریٹ..... ریٹ..... کی فضا شگاف آواز اُسے چاٹ گئی اور گن کے خاموش ہونے پر وہ چھلنی ہوکر بالشت بھر اونچی فصل میں گر گیا۔ ایک ہی رات میں اس نے ہماری سانسیں ضبط کرنا چاہیں، پھر اپنی سانسیں بحال رکھنے کے لیے نبردآزما ہوا اور پھر اس کی زندگی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ جان لینے والے کو بھی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ دنیا ایسی ہی ہے، نہ سمجھ میں آنے والی.....

میں نے جلدی سے میگزین نکال پھینکی اور دوسری چڑھا لی۔ اب ایک دشمن باقی تھا۔ میں کرولنگ کرتا ہوا سابقہ جگہ پر پہنچا۔ اس دوران فائرنگ تھم چکی تھی۔ میں نے گوبر کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ میڈم وہاں نہیں تھی۔ شاید اپنی جگہ بدل چکی تھی۔

میں نے آواز دی۔ ''میڈم!..... میڈم!''

میری توقع کے برعکس مجھے گاڑی کی طرف سے جواب ملا۔ ''میں ادھر ہوں..... گاڑی کے پاس..... اگر میدان صاف ہے تو چلے آؤ۔''

میری دانست میں میدان صاف تھا۔ میں کھڑا ہوا، چھت سے نیچے کودا اور بھاگ کر کیکر کے درخت کے پاس پہنچا۔ یہاں میرا ایک شکار پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی کے کے گن دبی ہوئی تھی اور وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ میں اُس پر جھکا۔ نبض چیک کی۔ وہ مر چکا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں تلاشی لی۔ اس نے پنڈلی پر ایک تیز دھار خنجر اور کمر پر سیاہ رنگ کی جرسی کے اوپر لیدر کا بلٹ بیلٹ باندھ رکھا تھا۔ چند نوٹ بھی ہاتھ لگے۔ میں نے نہ صرف تمام سامان کو اپنی تحویل میں لے لیا بلکہ اس کی گن کو بھی اس کی مردہ گرفت سے کھینچ لیا۔

وہ لحیم شحیم اور خاصی خوف ناک شکل کا مالک تھا۔ گھنی سیاہ مونچھیں اور ڈاڑھی اس کی ظاہری دہشت میں اضافہ کرتی تھی۔ اس نے سر پر اُونی مفلر باندھ رکھا تھا۔ دیہاتی

غنڈے اور نچلی سطح کے ڈاکو اسی قسم کا حلیہ بنا کر رکھتے ہیں تاکہ لوگوں پر ان کی شخصیت کا دبدبہ قائم ہوجائے۔

دوسرا آدمی کافی فاصلے پر کھیت میں گرا تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کا ارادہ منسوخ کیا اور مالِ غنیمت اُٹھائے ہوئے میڈم کی طرف بڑھا۔ کچھ فاصلے پر رُک کر بولا۔ ''میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں! جلدی آؤ۔''

اس کی آواز سنائی دی تھی، خود دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید گاڑی کی دوسری طرف کھڑی تھی۔ میں نے کھال پھلانگا تو کھال اور گاڑی کے درمیان پہلو کے بل پڑا ہوا لمبا تڑنگا شخص دکھائی دیا۔ اس کی گن اس کے جسم تلے دبی ہوئی تھی جس کی نال کا تھوڑا سا حصہ باہر تھا۔ میں نے اُسے ٹھوکر ماری۔ ..... وہ گاڑی کی جانب الٹ کر سیدھا ہوگیا۔

میڈم کی آواز سنائی دی۔ ''کوئی فائدہ نہیں...... ادھر آؤ۔''

وہ آم کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ تبھی میری نظر اُس کے پیروں تلے گھاس میں پڑے ہوئے شخص پر پڑی جو چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ میں میڈم کے قریب پہنچا۔

میڈم بولی۔ ''دِس از لاسٹ ون!''

میں نے مالِ غنیمت والی کے کے گن میڈم کو پکڑائی۔ اپنی گن آخری شکار پر تان لی اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''تم کون ہو؟''

وہ بولا۔ ''مم...... میں دِتہ ماچھی ہوں...... اللہ دتہ!''

اس نے مقامی لب و لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

اس کی آواز نے اس کے خوف کا پول کھول دیا۔ وہ موت کو سامنے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''پپ...... پتا نہیں......'' وہ منمنایا۔

میں نے اس کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور درشت لہجے میں کہا۔ ''بکواس نہ کرو ورنہ چھلنی کردوں گا؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا۔ بب...... بشیرے کو ہی پپ...... پتا ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اب کہاں ہے، کوئی پتا نہیں۔''

اس کی لرزتی ہوئی آواز نے مجھ پر اس کی قلبی کیفیت کو آشکار کردیا۔ ایسی حالت میں انسان جھوٹ نہیں بولتا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں کس نے بھیجا تھا یہاں؟''

''استاد پیرو نے...... پیرو ماچھی نے......'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''کیا کہہ کر؟''

''اس نے کہا تھا کہ ملتان کی طرف سے جو بھی مکان پر آئیں، انہیں باندھ کر ڈیرے پر پہنچادینا۔''

''کس ڈیرے پر؟''

''استاد پیرو کے ڈیرے پر...... بیٹ خیرپور میں۔''

''اُسے ہم سے کیا دشمنی ہے؟''

''مم...... مجھے نہیں پتا...... میں تو حکم کا غلام ہوں۔ استاد پیرو نے حکم دیا، میں بشیرے کے ساتھ یہاں آگیا۔''

میرے استفسار پر اس نے اپنے تین ساتھیوں کے نام بتائے۔ وہ عمومی سطح کے بدمعاش تھے اور میرے ہاتھوں قتل ہوچکے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیوں یقین تھا کہ ہم لوگ آج رات کو یہاں ضرور آئیں گے؟''

''استاد پیرو نے کہا تھا۔''

''جس عورت اور بچے کو تم لوگ صبح یہاں سے اُٹھا کر لے گئے ہو، انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟'' میرا لہجہ بے حد ڈراؤنا ہوگیا۔

اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں صبح ادھر نہیں آیا تھا۔''

''کون آیا تھا؟''

''استاد...... اس کے ساتھ تین بندے تھے۔ یہی تینوں میرے ساتھ آئے تھے۔'' وہ بولا۔

''تم اس وقت کہاں تھے؟''

''میں دریا کے پار، روہیلانوالی بستی میں گیا تھا۔ وہاں سے کچھ سامان لانا تھا۔''

''واپسی پر کیا تم نے ان لوگوں کو ڈیرے پر نہیں دیکھا؟'' میں نے اُسے لات رسید کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

وہ بلبلایا۔ ''نہیں۔ انہیں استاد نے کہیں بھیج دیا ہوگا۔''

میں نے اس کے ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ٹریکٹر، جس پر تم لوگ یہاں آئے تھے، کس کا ہے؟''

''یہ زبیر خان کا ہے۔ لین دین کے چکر میں استاد پیرو کے ہاتھ لگا ہے۔'' اس کی آواز بتدریج کمزور ہوتی جارہی تھی۔

''اس آم پر چھپنے والا...... وہ جو گاڑی کے بمپر کے پاس انٹاغفیل ہوا پڑا ہے، کیا تم سے پہلے یہاں موجود تھا؟''

''ہاں! سردی بہت تھی۔ اس لیے ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ درخت پر چھپ جائے گا۔ تم لوگوں کے پہنچتے ہی ٹارچ سے ہمیں مطلع کرے گا۔ ہم فوری طور پر یہاں پہنچ جائیں گے اور تم لوگوں کو پکڑلیں گے۔''

وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے انہیں یقین تھا کہ ہم یہاں چوڑیاں پہن کر آئیں گے اور انہیں دیکھتے ہی ہینڈز اَپ ہوکر اپنی گرفتاری پیش کردیں گے۔

''پیرو ماچھی کے گینگ میں کتنے آدمی ہیں؟'' میں غرایا۔

''مجھ سمیت پانچ...... ایک ڈیرے پر موجود ہے۔''

''کیا وہ جانتا ہے کہ پیرو ماچھی نے اس عورت اور بچے کو کہاں رکھا ہوا ہے؟'' میں نے اپنے لہجے کو ازحد کرخت بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! مگر شاید نہیں......'' وہ گڑبڑا گیا۔

میں نے دانت پیس کر کچھ کہنا چاہا کہ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کرادیا۔ اس نے آم کے تنے کی ٹیک چھوڑ دی۔ قریب آئی اور اس کے دل پر پستول کی نال رکھ کر بولی۔ ''آخری سوال...... پیرو ماچھی اس وقت کہاں ہے، کیا اپنے ڈیرے پر ہے؟''

وہ خاصا توانا اور طویل قامت انسان تھا مگر موت نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھٹنے کو آگئیں اور ہکلا کر بولا۔ ''نہیں...... وہ...... وہ...... جھوک لوری میں...... یاروالے پتن کے پاس۔ مم...... مجھے مت مارو...... میں معافی مانگتا ہوں......''

''وہ کمینہ جھوک لوری میں کس کے پاس گیا ہے؟'' میڈم کے لہجے میں موت کی سی خنکی چھپی ہوئی تھی۔

''جمیل دتی کے پاس...... وہاں کوئی پروگرام تھا۔ کہہ گیا تھا کہ صبح تک لوٹ آئے گا۔'' اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ اگر کچھ دیر اور پوچھ گچھ چلتی رہتی تو وہ مارے خوف کے بے ہوش ہوجاتا مگر میڈم نے اسے خوف سے نجات دلاتے ہوئے ٹرائیگر دبادیا۔ گولی اس کے دل میں گھس گئی اور وہ لمبی اور دردناک 'آہ' کی آواز نکال کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میڈم نے اس کی کھوپڑی میں بھی سوراخ کردیا۔ اس کے جھٹکے لیتے ہوئے وجود کو پھلانگ کر گاڑی کی طرف بڑھی۔ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئی اور گیٹ کھول کر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھنے تک اُس نے نہ صرف لینڈ کروزر کا انجن بیدار کردیا تھا بلکہ ہیڈلائٹس بھی روشن کردی تھیں۔

میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ان لوگوں کی لاشیں ایسے ہی پڑی رہیں گی؟''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''لاشوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ معذور بڈھا مصیبت میں پڑ جائے گا۔ پولیس اُس کا جینا حرام کردے گی۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو ہے...... مگر انہیں فوری طور پر کیسے ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے؟'' میڈم نے میری طرف دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

میری چشمِ تصور میں سائیں دل جیت شاہ کی خون میں لت پت لاش گھوم گئی جسے میں نے اپنے ڈیرے پر آگ کے بھڑکتے ہوئے بلند و بالا شعلوں کی نذر کردیا تھا۔ آگ بانس کو نگل گئی تھی اور بانسری آج تک بج نہیں پائی تھی۔ اپنا آزمودہ نسخہ بتایا۔ ''انہیں لکڑیوں کے ڈھیر پر ڈال کر آگ لگادیتے ہیں۔ ان کی چتا جل جائے گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا، سوچ کر بولی۔ ''نہیں شہریار! یہ اچھا طریقہ نہیں ہے۔ ایک تو ان کی ہڈیاں جلنے سے بچ جائیں گی......''

میں نے بات کاٹی۔ ''وہ راکھ تلے دب جائیں گی اور فوری طور کسی کو نظر نہیں آئیں گی۔''

اسے میری جلد بازی بُری لگی جس کا اظہار اس کے متفکر چہرے پر لمحہ بھر کو نقش ہوا، پھر مٹ گیا، بولی۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ اس منحوس ٹریکٹر کا کیا کیا جائے گا جو مکان کے اُس طرف درختوں تلے کھڑا ہے؟''

میں نے اس کا حل بھی پیش کردیا۔ ''اُسے میں سڑک پر چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ مطمئن نہیں ہوئی۔ ''اور اس کے ٹائروں کے نشان؟ انہیں اتنے کم وقت میں مٹائے نہیں جاسکتا۔ بس! انہیں ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ پولیس اٹھا کر لے جائے گی۔ مجھے اندازہ ہے کہ پولیس والے بابا کو تنگ نہیں کریں گے۔ روایتی پوچھ گچھ کریں گے اور پھر چھوڑ دیں گے۔ بابا کو جب کسی بات کا علم ہی نہیں تو وہ پولیس کو کیا بتائے گا۔ رہی بات اسے حوالات میں یا جیل بھیجنے کی، تو وہ پہلے کون سا جنت میں رہ رہا ہے۔ جیل کے قیدیوں سے کہیں بدتر زندگی گزار رہا ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے اور خاموش ہوگیا۔ اس نے گاڑی ریورس کی۔ مناسب جگہ دیکھ کر ٹرن لیا اور واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہم اب ملتان جائیں گے؟''

وہ قدرے تلخی سے بولی۔ ''کیا ہم نے اپنا مشن مکمل کرلیا ہے؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ہم اس عورت اور بچے کو اغوا کاروں سے تحویل سے نکالنے کے لیے ادھر آئے تھے۔ ان تک ابھی پہنچ نہیں پائے تھے، بازیابی کا مرحلہ تو بعد کا تھا۔ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''سوری میڈم! مجھے خیال نہیں رہا تھا۔''

وہ بولی۔ ''شہریار! تم بہت اچھے ہو۔ مگر مجھے سہارے کی نہیں، کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم اِس کمی کو پورا کرو، مجھے ماتحتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

وہ اُس دکھ کی گہری ٹرانس سے نکل چکی تھی جس نے ملتان سے نکلنے سے پہلے اس کے قلب و ذہن پر اپنا غمناک حصار کھینچا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی تک بالکل نارمل نہیں ہوئی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ ہی دیر میں پوری طرح سنبھلنے والی تھی۔ یہ ہم دونوں کے لیے اچھی بات تھی۔

میں نے آہستگی سے کہا۔ ''جی شکریہ! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔''

گاڑی میں چلنے والے ہیٹر نے ہمارے بدن کو خاصی حرارت پہنچائی۔ میڈم نے سڑک سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی اور سر سیٹ سے ٹکا کر، آنکھیں موند کر، سوچتے ہوئے بولی۔ ''شہریار! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے یاد دلایا۔ ''ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ کو سہارے کی نہیں، ساتھی کی ضرورت ہے۔ ساتھی سے کچھ مانگا نہیں جاتا، لے لیا جاتا ہے۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی کے اندر جلتی ہوئی دودھیا لائٹ اس کے آدھے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ آدھے چہرے پر سایہ تھا جبکہ سر پر بندھا ہوا سنہرا ہیئر بینڈ چمک رہا تھا۔ بولی۔ ''بولئے دوناں! ہم اِس وقت بیٹ خیر پور کے ویران علاقے میں کھڑے ہیں۔ یہاں سے بہت تھوڑے فاصلے پر، شاید ایک کلومیٹر دور، دریائے چناب مختلف نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ سردیوں میں پانی کم ہوتا ہے۔ ایک آدھا نالہ چلتا ہے؛ باقی خشک ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف جنگلات کے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہے۔''

میں ہمہ تن گوش اسے سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے آئندہ درپیش آنے والے متوقع حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنے چلی تھی، بولی۔ ''دریا کے اسی کنارے پر، جنگل کے بیچ، پیرو ماچھی کا ڈیرا واقع ہے۔ وہاں ہماری مڈبھیڑ کئی خطرناک لوگوں سے ہو سکتی ہے مگر وہ اس وقت جمیل دستی کے ہاں جھوک لوری پہنچا ہوا ہے۔ کسی غریب کی عزت پر موج میلا کر رہا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں نفرت گھل گئی، بولی۔

''جھوک لوری دریا کے پار واقع چند ملاحوں کے گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی ہے۔ جمیل دستی کا گھر بستی سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب واقع ہے۔ ہم وہاں جائیں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ''یہاں سے بالکل سامنے دریا کے پار جھوک اللہ یار کا پتن ہے۔ اگر کشتہ (بڑی کشتی) اِس پار کھڑا ہوا تو ہم دریا پار کر سکیں گے۔ اگر پار کھڑا ہوا تو پھر مشکل ہو جائے گی، دریا پار نہیں کیا جا سکے گا۔ میری معلومات کے مطابق یہاں صرف ایک ہی کشتہ ہے۔ لوگ اپنے ٹریکٹر اس پر لاد کر آر پار منتقل کرتے ہیں۔ یعنی اس پر لوڈ کر کے ہم اپنی لینڈ کروزر پار لے جا سکتے ہیں۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے کہا۔ ''جی میڈم! میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ بات کیجیے۔''

''ہم جھوک اللہ یار جانے کے بجائے اوپر کی جانب، جدھر سے پانی آتا ہے، ایک کچے راستے پر کشتے سے اُتریں گے۔ وہاں سے جمیل دستی کا ڈیرا بہ مشکل پندرہ منٹوں کی مسافت پر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم یہاں سے ناگ شاہ چوک جائیں، پھر مظفر گڑھ اور خان گڑھ سے ہوتے ہوئے براستہ پل عمر پور ہم جھوک اللہ یار کی طرف واپس آئیں۔ ہم وہاں تک پہنچنے کے لیے تلیری نہر کی پختہ پٹڑی پر بھی ڈرائیو لے سکتے ہیں۔ مگر اس روٹ سے وہاں جانے میں ہمیں کم از کم دو گھنٹے یا کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا۔'' وہ مجھے تفصیل سے بتا رہی تھی۔ ''تب تک سورج طلوع ہونے والا ہوگا اور ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

میں سمجھا کہ شاید وہ واپس جانے کا تہیہ کرنے لگی تھی، تبھی بولا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں سے لوٹ جاتے ہیں۔ صبح دم میں اور سخی محمد یا پیاجی اِس مشن پر نکلیں گے اور مغویان کو برآمد کر کے آپ کے پاس لے آئیں گے۔''

اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ ''نہیں شہریار! تم نہیں جانتے کہ وہ دونوں کون ہیں؟ میں چاہتی ہوں کہ کسی کو بھی یہ علم نہ ہو کہ وہ دونوں کون ہیں..... اور جب تک میں انہیں کمینے پیرو ماچھی کے چنگل سے رہا نہیں کروا لیتی، چین سے بیٹھ نہیں سکتی۔''

مجھے اندازہ تھا کہ وہ دونوں اس کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ بڈھے نے اُسے 'چندو' قرار دیا تھا۔ میڈم نے اُسے 'بابا' اور اس کی بیوی کو 'اماں' کہا تھا۔

زیادہ قیاس یہی تھا کہ بڈھا میڈم کا باپ تھا جبکہ اغوا کی جانے والی بڑھیا اور بچہ، اس کی ماں اور بھائی تھے۔ چونکہ ہمارے ہاں خالہ، پھوپی وغیرہ کو بھی 'اماں' کہا جاتا تھا، اِس لیے میں ابھی تک کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کے کون تھے؟..... یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ میڈم کو بہت پیارے تھے؛ تبھی وہ رات کے اِس پہر میں اس خوفناک علاقے کی خاک چھاننے پر کمربستہ تھی۔

میں نے کہا۔ ''اوکے میڈم! آپ بہتر جانتی ہیں۔''

''تم یہ سوچو کہ پیرو ماچھی کی ان دونوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ان دونوں کی خاطر بھری دنیا میں کوئی بیس تیس ہزار روپے بھی تاوان میں دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ پھر..... اس بے غیرت نے انہیں کیوں اغوا کیا؟''

میں نے غلط سمجھا تھا کہ اس کا ارادہ متزلزل ہو گیا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس سے یہ اُلجھن سلجھائی نہیں جا رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کوئی زمین جائداد کا تنازعہ تو نہیں ہے؟''

وہ بولی۔ ''نہیں..... یہ زمین بھی بابا کی نہیں ہے۔ وہ مزارعہ ہے۔ آدھ پر فصل کاشت کرتا ہے اور بکریاں چرا کر پیٹ پالتا ہے۔'' اس نے ایک طویل سانس سینے میں اُتاری اور بولی۔ ''سگریٹ بھی نہیں ہے؛ پی لیتی تو ذرا دماغ کی رگیں کھل جاتیں..... تم میں یہی خامی ہے شہریار! سگریٹ پیا کرو..... ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ اس بوڑھی عورت اور بچے کو پیرو ماچھی نے کیوں اغوا کیا ہوگا؟..... مجھے ان کی آوازیں کیوں سنائی گئی تھیں..... یعنی میرے کسی دشمن نے پیرو ماچھی کو ٹوکن دیا ہے۔ ہیں ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔''

اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا موبائل فون اُٹھایا۔ کوئی بٹن دبا کر اسکرین روشن کی۔ دیکھا، پھر مایوسی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''سوچا تھا کہ اس منحوس نمبر پر کال بیک کروں؛ شاید رابطہ ہو جائے مگر افسوس! یہاں سگنلز ہی نہیں ہیں.....''

میں نے اس کے آدھے روشن چہرے پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر دھاوا بولنا چاہیے۔ وہاں کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو ہماری اُلجھن دور کر دے اور بتا دے کہ پیرو ماچھی نے کس کے کہنے پر یہ قدم اُٹھایا ہے۔ یوں ہم دریا پار کرنے کے عذاب میں پڑے بغیر اس کے پیچھے جائیں جس نے اماں اور سیمو کو اغوا کرایا ہے۔ کیا خیال ہے؟''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا، زیرِ لب کہا۔

''اماں اور سیمو'' پھر ایک طویل سانس کھینچی، اُسے ننھے ننھے جھٹکوں سے خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''قسمت کو آزمانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اس نے فوراً فیصلہ کیا، فوراً ہی اس پر عمل کرتے ہوئے گیئر لگا کر ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری توقع کے عین مطابق اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر بیٹھی ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ذہن کو دوڑا رہی تھی۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک بولی۔

''تمہارے پاس کتنی گولیاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''چند ایک..... مجھے برسٹ مارنا پڑا تھا۔''

''دوسری گن میں..... میرا اشارہ لوٹی ہوئی گن کی طرف ہے۔''

''وہ فل ہے۔ فالتو راؤنڈز بھی ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''آپ پیرو ماچھی کے ڈیرے سے کچھ فاصلے پر کسی محفوظ جگہ پر گاڑی چھپا کر رُک جائیں۔ آگے میں اکیلا جاؤں گا اور معلومات حاصل کر لاؤں گا۔''

''کیوں؟'' اس نے چونک کر میری طرف رُخ کیا۔

ایسے ہی وقت میں گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے جلدی سے سامنے دیکھا اور اسٹیئرنگ ویل کو دائیں جانب گھما دیا۔ اگر اُسے لمحہ بھر کی تاخیر ہو جاتی تو گاڑی کیچڑ بھرے گڑھے میں دھنس چکی ہوتی۔

دوسری مرتبہ اس نے میری طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی اور کہا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ڈیرے پر نہ جاؤں؟''

''جی میڈم! یہ اکیلے آدمی کا کام ہے۔''

''یعنی میں آگ کے اس دہکتے ہوئے دریا میں تمہیں جھونک دوں اور خود بالکل محفوظ رہوں۔ ہیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''گولی تو تمہیں بھی لگ سکتی ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس طریقے سے محفوظ رکھنا نہیں چاہو گے جو طریقہ تم نے میرے لیے تجویز کیا ہے؟'' اس کے لہجے کی کاٹ نے مجھے چونکا دیا۔ ''یعنی ہم دونوں گولی کے ڈر سے یہیں گاڑی روک کر بیٹھے رہیں۔''

''میڈم! سردی بہت ہے۔ دریائی علاقے میں ہوا نم ہوتی ہے جس کی وجہ سے سردی بعض اوقات خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یہ تجربہ آپ کو کچھ دیر پہلے ہوا تھا۔ آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں دیہاتی ہوں۔ سردی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے آپ کو گاڑی

میں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔''

راستہ بہت پر پیچ اور دشوار ہو گیا تھا۔ ٹریکٹروں اور ریہڑیوں کی آمدورفت کی وجہ سے چکنی زمین پر نالیوں کی سی دو لائنیں جھاڑیوں کے بیچ سے گزر رہی تھیں جن پر ہم چل رہے تھے۔ کانہہ اور لائی کی ٹہنیاں گاڑی کی باڈی سے ٹکرا کر عجیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کیچڑ اور پھسلن کی وجہ سے میڈم نے گاڑی کی رفتار خاصی کم رکھی ہوئی تھی۔ پھر فور ویل لیور دبا کر کیچڑ سے گاڑی نکالتے ہوئے بولی۔ ''شہر یار! انسان کبھی باہر کی سردی سے نہیں مرتا۔ جب بھی مرتا ہے، اپنے اندر اترنے والی سردی یا گرمی سے مرتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''جس طرح مرغی کو لپ اسٹک لگانا یا ہاتھی کو گود میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے، ایسے ہی دل کی دنیا کو آباد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ دل کبھی چاند تو کبھی سورج مانگتا ہے۔ فلک کے شہزادوں کو اس کی مٹھی میں اُتارنا پڑتا ہے یا بہلا پھسلا کر دھیان بدلنا پڑتا ہے ورنہ جینے نہیں دیتا۔''

وہ شاید راستہ بھول گئی تھی۔ تبھی چونک کر، بریک لگا کر اردگرد دیکھنے لگی۔ اس راستے سے کئی راستے نکلتے تھے۔ اس نے باتوں میں دھیان نہیں رکھا تھا اور بھٹک گئی تھی۔ بڑبڑائی۔ ''اب کیا کروں؟''

گاڑی اس وقت بلند ٹیلا نما جگہ پر رکی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اُتر گئی۔ چند قدم دور جا کر رُک گئی۔ میں نے بھی سیٹ چھوڑ دی اور گن سنبھالتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے چند لمحوں میں ہی بدن کو سن کر دیا تھا۔ یہ علاقہ چھوٹی بڑی مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا۔ کہیں پانی کا جوہڑ، کہیں جھنگی، کہیں اونچے درختوں پر مشتمل گھنے جنگل کا ٹیلا نما خطہ تو کہیں چٹیل ریتلا میدان...... ہم ایک پہاڑی نما ٹیلے پر کھڑے تھے جس کے درمیان میں سے راستہ گزرتا تھا اور اسے دو برابر گنبدوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ہوا کم و بیش بیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے گزر رہی تھی۔

میڈم ٹیلے کے اوپر کھڑی تھی۔ ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ ''وہاں، دریا کے پار، جھوک اللہ یار کا پتن ہے۔ اس سیدھ میں آگے روہیلانوالی بستی ہے۔ اس طرف! بہ مشکل پانچ سات کلومیٹر کے فاصلے پر خان گڑھ واقع ہے۔ ہم نے اسی طرف جانا ہے۔ مگر پہلے پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جانا ضروری ہے۔ مجھے اَب سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اِدھر ہے یا اُدھر...... بھول گئی۔''

میں نے دریا کی جانب نظر دوڑائی۔ اندھیرے کی گود میں ایک بل کھاتی سفید لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے کناروں والا، گھنے جنگل پر مشتمل ایک جزیرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اور جنگل کے بیچ ایک بڑی سی جھیل حائل تھی۔ اسے مقامی زبان میں 'ڈھنڈ' کہا جاتا تھا۔ شکاری ایسی جگہوں پر جال لگا کر مچھلیاں پکڑتے تھے۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

''میڈم! گاڑی میں چلیں۔ سردی بہت ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے تو تمہیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ تب تم چھتیں پھلانگتے پھر رہے تھے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''تب میں ایکشن میں تھا۔'' میں نے خفت سے کہا۔

''ہم تو اَب بھی حالت جنگ میں ہیں۔'' وہ میری طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی، جدھر سے ہم آئے تھے۔ پھر ایڑیوں کے بل گھومی اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی۔ شاید اسے منزل کا کوئی کلیو مل گیا تھا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہم دریا کے بہاؤ کے اُلٹے رُخ چل رہے تھے۔ نصف کلومیٹر چلنے کے بعد میڈم نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ اِس طرف راستہ نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے ایک ننھے سے ڈھنڈ کے کنارے پر ڈرائیو کر رہی تھی۔ کیچڑ کی وجہ سے گاڑی متعدد بار پھسل کر ڈھنڈ کے پانی کی طرف لپکی مگر اُس نے کمال مستعدی سے سنبھل کر گاڑی کو پانی میں گرنے سے بچا لیا۔ میں نے تحسین آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ''میڈم! یوں لگتا ہے جیسے آپ نے اس علاقے کی گرداوری کر رکھی ہو۔''

وہ مسکرائی، پھر ہنسنے لگی۔ بولی۔ ''واہ شہر یار! کیا تشبیہ دی ہے تم نے...... میں نے واقعی اس علاقے کو اچھی طرح کھنگال رکھا ہے۔''

مجھے تعجب ہوا۔ پوچھا۔ ''سیر کی غرض سے......''

اس نے مبہم جواب دیا۔ ''یہی سمجھ لو۔''

''ان جنگلوں میں جانور بھی ہوتے ہیں؟''

''ہاں...... ڈاکوؤں کے علاوہ بھیڑیے اور جنگلی بلے...... سنا ہے کہ ہرن بھی ہوتے ہیں مگر میں نے آج تک اس علاقے میں کوئی ہرن دیکھا نہیں ہے۔''

''کیا یہ آپ کا آبائی علاقہ ہے؟''

وہ مسکرائی۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ بولی۔ ''تم جو پوچھنا چاہتے ہو، مناسب وقت آنے پر از خود بتا دوں گی۔''

میں خفت سے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ایسے ہی پوچھ بیٹھا۔''

ڈھنڈ ختم ہو گیا۔ جنگل شروع ہو گیا۔ دس پندرہ میٹر کے بعد لینڈ کروزر کے گزرنے کے لیے جگہ بھی معدوم ہو گئی۔ اونچے درختوں اور بیچ میں اگی ہوئی خار دار جھاڑیوں میں سے گزرنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا، گاڑی کہاں سے گزرتی۔ میڈم نے بتیاں گل کیں، ہینڈ بریک کا لیور کھینچا نیچے اُترتے ہوئے مجھے دونوں گنیں اُٹھا لانے کا حکم دیا۔ میرے نکلنے اور دروازہ بند کرنے تک وہ چند قدم دور جنگلی کیکر کے گھنے جھنڈ تک پہنچ چکی تھی۔ باہر تیز یخ بستہ ہوا بدن کو چیر رہی تھی۔ جھنڈ کے اندر ہوا نہیں تھی مگر خون کو منجمد کرنے والی خنکی استقبال کرنے کو موجود تھی۔

''میری یادداشت کے مطابق یہاں تنگ اور دشوار گزار راستہ ہونا چاہیے تھا جس پر سے گاڑی گزر جاتی جبکہ یہاں تو پیدل چلنا مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ میں بھول گئی ہوں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ''تھوڑا آگے تک جاتے ہیں۔ شاید کچھ یاد آ جائے۔''

جنگلی کیکر کی آکٹوپس کی طرح پھیلی ہوئی خار دار ٹہنیوں سے بچ کر چلتے ہوئے ہم بہ مشکل چند قدم ہی بڑھے تھے کہ اچانک کانوں میں گاڑی کے انجن کے گھر گھرانے کی آواز پڑی۔ پلٹ کر دیکھا۔ دریا کی جانب بلند قامت درختوں پر ہیڈ لائٹس کی روشنی تھرک رہی تھی۔ میڈم کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ''اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ پونٹے والی سڑک پر کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔''

''ہوں......'' میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ہم دونوں ٹھہر گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہیڈ لائٹس کی لہراتی ہوئی روشنی ڈھنڈ پر پڑی۔ میڈم بولی۔ ''جو بھی، ادھر آ رہا ہے۔ ہمیں کہیں چھپنا ہو گا۔''

میں نے چہار اطراف نگاہ دوڑائی۔ بائیں جانب بیس قدم دور گھنی جھاڑیاں دکھائی دیں۔ چھپنے کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ میں نے میڈم کو بتایا۔ اس نے جست بھری اور ننھے سے گڑھے کو عبور کرتی ہوئی اس طرف بھاگی۔ میں نے تقلید کی۔ کانٹوں کی بدولت جھاڑیوں تک پہنچنا محال تھا۔ جیسے تیسے پہنچے، میں نے میڈم کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا، کہا۔ ''مجھے پہلے جانے دیجیے۔ ہو سکتا ہے، جھاڑیوں میں کوئی سانپ یا جنگلی جانور چھپا ہو۔''

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''فضول باتیں مت کرو، میرے پیچھے آؤ۔ یہ بات یاد رکھا کرو کہ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ سمجھ میں آیا کہ میں نے کچھ زیادہ ہی مہر و خلوص کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ اس کا کہنا بجا تھا کہ وہ بچی نہیں تھی اور نہ کوئی گھریلو عورت ہی تھی کہ میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا۔ اس نے ٹہنیوں کو ہٹا کر راستہ بنایا اور سر جھکا کر گھس گئی۔ میں اُس کے عقب میں تھا۔ دل ہی دل میں شکر کیا کہ وہ جھاڑیاں خار دار نہیں تھیں ورنہ بہت مشکل پیش آتی۔ ایسے ہی وقت میں فضا گھر گھراہٹ کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ گاڑیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شاید تین یا چار...... اتنی رات گئے اس طرف کوئی نہیں آتا تھا۔ جو بھی آیا تھا، وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا تھا۔ ہم جھاڑیوں کے قلب میں دس بارہ فٹ تک گھس کر رُک گئے۔ کان لگائے۔ میرے اندازے کے مطابق آنے والی گاڑیاں لینڈ کروزر کے قریب آن رکی تھیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنی عین اُس جگہ پر پڑ رہی تھی جہاں کچھ دیر پہلے ہم موجود تھے۔ چند دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے ایک سے زیادہ لوگ لینڈ کروزر کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئے ہوں۔

جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ کوشش کے باوجود ہم کچھ نہ دیکھ پائے۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں دبیز اندھیرا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ ہم تک صرف روشنی کا احساس پہنچ رہا تھا۔ میں نیچے بیٹھ کر جھاڑیوں کے بیچ سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میڈم میرے عقب میں مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی، سرگوشی میں بولی۔ ''کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمارے تعاقب میں یہاں آئے ہیں۔''

''نہیں......'' وہ پورے وثوق سے بولی۔ ''ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ فائرنگ کی آواز سن کر کسی نے پولیس کو مطلع کر دیا ہو اور پولیس ادھر آ نکلی ہو۔''

''نہیں میڈم!'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ بڈھے کے مکان تک آتے۔ ادھر تک ہمارا پیچھا نہ کرتے کیونکہ انہوں نے ہمیں اس طرف آتے نہیں دیکھا ہو گا۔ ہم فائرنگ کے بعد کچھ دیر تک دِتے ماچھی سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے اور سڑک پر آنے تک ہم نے کسی گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی۔ پھر کس طرح ان لوگوں نے اتنے کم وقت میں مکان کا جائزہ لے لیا، یہ بھی طے کر لیا کہ ہم اِس طرف آئے ہیں اور ہمارے یہاں رُکنے کے چند ہی لمحوں بعد یہاں پہنچ گئے...... نہیں، ایسا عملی طور پر ناممکن ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو مگر یہ ہماری پولیس ہے۔ واردات کے دوسرے دن موقع ملاحظہ کرنے پہنچتی ہے۔ مجرموں تک کبھی نہیں پہنچتی، مجرم اس تک پہنچتے ہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''پیرو ماچھی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ دریا پار گیا ہوا ہے۔ ویسے بھی اس کی آدھی سے زیادہ نفری ہلاک ہوگئی ہے۔ دتے ماچھی کے بعد اس کے پاس دو آدمی بچے ہیں جبکہ یہ زیادہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔''

''تو پھر یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟'' وہ متردد ہوگئی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا جب میرے کانوں میں ایک پاٹ دار آواز پڑی۔ ''اوئے اِدھر دیکھ..... کوئی جھنگی میں چھپا ہوا نہ ہو۔''

ایک اور بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ''گاڑی تو ایک دم فرسٹ کلاس ہے چودھری..... لگتا ہے کوئی امیر جوڑا ہنی مون پر نکلا ہے۔''

اسے جواب میں ایک شاندار گالی سے نوازا گیا۔ ''اوئے بھوتنی کے! یہ تیرے باپ کی سیرگاہ ہے کیا؟ دیکھو..... کسی کو زبردستی یہاں نہ لایا گیا ہو۔''

وہ شخص بولا جسے گاڑی کی تلاشی لینے کا حکم صادر ہوا تھا۔ ''چودھری صاحب..... گاڑی بالکل خالی ہے لیکن پتا چلتا ہے کہ کوئی ابھی یہاں سے نکلا ہے۔''

''کیا یہ بات گاڑی کے میٹر پر لکھی ہوئی ہے؟'' چودھری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں چودھری صاحب! گاڑی کا انجن گرم ہے اور اندر گرمی ہے۔ کسی نے تھوڑی دیر پہلے انجن اور ہیٹر کو بند کیا ہے۔ شاید ہمارے ڈر سے نکل بھاگا ہے۔''

''ہاں بھئی..... اوئے غضنفر! سن رہے ہو ناں کالو خان کی بات..... اس کے ڈر سے کوئی اپنی نئی نکور فورویل جیپ جنگل میں چھوڑ بھاگا ہے۔ ہشکے بھئی ہشکے!''

چند آدمیوں کا ملا جلا قہقہہ گونجا۔ جدھر ہم چھپنے سے پیشتر کھڑے تھے، اُدھر ایک غیر معمولی فریکوئنسی والی تیز آواز ابھری۔ ''سر! ادھر تو کوئی نہیں ہے۔ میں نے سارا جھنڈ کھنگال مارا ہے۔''

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ کوئی بھی اتنے مختصر وقت میں جھنڈ کے ایک چوتھائی حصے کا جائزہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ شاید نہ دکھائی دینے والے جنگلی جانوروں سے ڈر گیا تھا یا کانٹوں کے خوف میں مبتلا ہوکر جھوٹ بول گیا تھا۔ پھر اسے ان گھنی جھاڑیوں کو دیکھنے کا حکم صادر ہوا جس میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ قریب آئی۔ اس نے ایک جگہ کھڑے ہوکر ارد گرد دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ اگر جھاڑیوں کے اندر بھی گھس آتا تب بھی اُسے ہم نظر نہ آتے۔ اس نے حکم دہندہ چودھری کو مطمئن کرنا تھا، کر دیا اور لینڈ کروزر والوں کو کوستا ہوا لوٹ گیا۔

اُسے چودھری نے ڈانٹا ڈپٹا اور سخت سست کہا۔ پھر اس نے چند اور لوگوں کو ہماری تلاش پر روانہ کیا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ تلاش کرنے والے اس جھنگی کے قریب بھی آئے، جس میں ہم سانسیں روکے بیٹھے ہوئے تھے اور ٹارچوں کی مدد سے جھاڑیوں کے بیچ جھانکتے رہے۔ ٹارچ کی تیز روشنی بے ترتیب ٹہنیوں کے بیچ سے چھنتی ہوئی ہم تک پہنچی مگر میری توقع کے مطابق وہ ہماری موجودگی کو بھانپ لینے میں ناکام رہے۔

پھر قدرے بلند آواز میں ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ''کوئی ہے..... یہ گاڑی کس کی ہے؟ اگر اس گاڑی کا مالک سن رہا ہے تو فوراً اپنی گاڑی کے پاس آجائے.....''

مجھے میڈم کی سانسوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کا آدھا بوجھ بھی مجھ پر ڈال رکھا تھا۔ بولی۔ ''مجھے تو یہ پولیس والے لگتے ہیں۔''

میں نے جواباً سرگوشی کی۔ ''شاید!''

ایسے میں ایک دروازہ کھلا، بند ہوا اور ہماری لینڈ کروزر کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ چونکہ آنے والوں نے اپنی گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ رکھے تھے، اس لیے ہمیں فوراً پتا چل گیا کہ انہوں نے ہماری لینڈ کروزر ہی اسٹارٹ کی تھی۔

میڈم گھبرا کر بولی۔ ''یہ کیا؟ ان لوگوں نے ہماری گاڑی کیوں اسٹارٹ کردی ہے؟''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''تو کیا آپ گاڑی کی چابی اگنیشن میں ہی چھوڑ آئی تھیں؟''

''ہاں! یہ غلطی مجھ سے ہوگئی ہے۔''

ایک بھرائی ہوئی کرخت آواز سنائی دی۔ ''امانت! تم اسی گاڑی میں ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ..... نہیں، بلکہ ہمارے درمیان میں چلو۔ واپسی پر اسے تھانے لے چلیں گے۔ جس کی ہوگی، آکر لے جائے گا۔''

امانت بولا۔ ''صاحب! یہ جیپ کسی بڑے آدمی کی لگتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''بکواس نہ کرو۔ بڑا آدمی اس وقت جنگل میں اپنا زوجہ محترمہ کو ڈانس کی ٹریننگ دلانے لائے گا..... ابے بھوتنی کے! مجھے لگتا ہے کہ پیرو گینگ اسے شہر سے چوری کر

لایا ہے۔ یاد رکھو کہ ہم نے اس گاڑی کو بڑی مشکل سے خطرناک ڈاکوؤں سے چھینا ہے، اِسے.....''

''پر چودھری صاحب.....''

''زیادہ ٹاں ٹاں نہ کر..... جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ وقت کم ہے۔ یہ نہ ہو کہ پیرو گینگ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے اور ڈی ایس پی صاحب ہماری کھال کھنچوا دیں۔''

چودھری نے اُسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

ایک ساتھ کئی دروازے بند ہوئے اور آن کی آن میں کسی سخت مزاج ڈی ایس پی صاحب کے اختیاراتی پلاس سے اپنی کھال بچانے والے ہماری گاڑی لے کر چلتے بنے۔

میڈم نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جھنگی سے باہر نکلے۔ جھنگی میں سردی زیادہ تھی۔ جبھی ہم دونوں ہاتھ رگڑ کر ہاتھوں کو حرارت پہنچا رہے تھے۔ دیکھا! میدان صاف ہو چکا تھا۔ وہ ڈھلوان خالی تھی جس پر میڈم نے لینڈ کروزر کھڑی کی تھی۔ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر، ڈھنڈ کی دوسری جانب گاڑیوں کی ایک قطار جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کی ٹیل لائٹس کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ہماری لینڈ کروزر سمیت ان کی تعداد چھ تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے آگے جانے والی گاڑیاں پچھلی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں چند لمحوں کے لیے نہائیں۔ پتا چلا کہ وہ بھی پولیس کی موبائل وین تھیں۔ ان کی گفتگو سے ہمیں علم ہوا تھا کہ وہ پیرو گینگ پر ریڈ کرنے جا رہے تھے۔ ریڈ کا انجام کیا ہونا تھا؛ یہ پولیس کی پیشہ وارانہ کارکردگی کو دیکھ کر قبل از وقت طے کیا جاسکتا تھا۔

میڈم نے زمین پر زور سے پاؤں مارا اور بے حد غصے سے بولی۔ ''شٹ..... ان کمینوں کو بھی اِس وقت ادھر آنا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی برسٹ میں ڈھیر کردوں۔''

گاڑیوں کی قطار کچھ فاصلے پر دریا کی مخالف سمت میں جنگل میں گھس کر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میڈم نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے اور برہمی سے بولی۔ ''میں اگر راستہ بھول نہ جاتی تو ہم ان لوگوں سے پہلے پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جاتے اور اپنا کام کر کے ہم لوگ وہاں سے نکل جاتے۔ مگر افسوس! سارا کیا کرایا کھوہ کھاتے پڑ گیا۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اور پولیس کے نرغے میں آکر پیرو ماچھی کے ساتھی قرار پاکر بھون دیے جاتے.....''

ہم دونوں ڈھنڈ کے کنارے گاڑیوں کے ٹائروں سے بننے والی لکیروں پر متوازاً چل رہے تھے۔ ہمارا رُخ اسی جنگل کی طرف تھا جس میں گاڑیاں داخل ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! میرا خیال ہے کہ ہم کچھ ہی دیر میں ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔''

اس نے میرے ہاتھ سے ایک گن پکڑتے ہوئے کہا۔ ''دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے.....'' اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے جس کی وجہ سے وہ گرم تھے۔ گن ٹھنڈی تھی۔ تبھی اُس کے منہ سے کلمۂ حیرت نکل گیا۔ ''اف!..... یہ تو برف کے مانند ٹھنڈی ہے۔''

ڈھنڈ کے ٹھنڈے پانی سے ٹکرا کر اُٹھنے والی ہوا یخ بستہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم باقاعدہ کپکپانے لگے۔ ہماری آوازیں بھی لرزنے لگیں۔ میڈم بولی۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہاں بہت سردی ہے۔''

یخ بستہ ہوا بدن کے پار ہو رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ جب ہم بڈھے کے کچے گھر میں اچھل کود کر رہے تھے، ہمیں سردی کا مطلق احساس نہیں ہوا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے برابر چلتی ہوئی میڈم کو دیکھا۔ مجھے سردار حیدر خان کی بیلے والی حویلی یاد آگئی جہاں سے رات گئے نکلا تھا اور جلدی میں کوئی گرم کپڑا، دیا سلائی یا سردی سے بچاؤ کے لیے کچھ بھی اُٹھا نہیں پایا تھا۔ حویلی سے نہر کے پل تک، طے کی جانے والی مسافت کو میں شاید عمر بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ وہی غلطی میں نے دہرائی تھی۔ ملتان سے چلتے ہوئے میں نے سردی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ میڈم نے چونکہ خاصا گرم سوٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا، اس لیے سردی کے اِس جانکاہ محاذ پر اس کی حالت مجھ سے بہتر تھی۔ اسے بھی اِس بات کا احساس ہوگیا تھا، تبھی اس نے میرے ہاتھ سے گن پکڑ لی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں اپنا ایک ہاتھ سائڈ والی جیب میں ڈال کر گرم کرنے کے قابل ہوگیا۔

چاند ایک سیاہ بدلی کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ ماحول پر چھائی ہوئی چاندنی ماند پڑنے لگی تھی اور اندھیرا بتدریج گہرا ہونے لگا تھا۔ ہماری رفتار کم نہیں تھی مگر راستے کی ناہمواری، پھسلن کا احتمال اور راستے سے لاعلمی کے باعث ہمیں چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ دائیں جانب چکنی مٹی تھی۔ بائیں ہاتھ ریتلا میدان تھا۔ ہم دونوں کی سرحدی پٹی پر چل رہے تھے جب میڈم نے مجھے کہا۔ ''شہریار! چکنی مٹی اگر

گیلی ہوتو اس پر چلنا محال ہوجاتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے توجہ بٹنے سے چلنے والا سر کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم خاصی بے پروائی سے چل رہے ہو۔ مجھے خدشہ ہے کہ گر جاؤ گے۔''

اچانک اس کا پاؤں کیچڑ پر پڑا اور وہ پھسل کر 'دھپ' کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گئی۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ پھسل کر گرنا بڑا عجیب حادثہ ہوتا ہے۔ بجائے ہمدردی کے اظہار کے، دیکھنے والوں کے لبوں پر قہقہہ مچل جاتا ہے۔ میں نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ مجھے اس کی ناراضی کا اندیشہ تھا مگر اسے کوئی جھجک نہیں تھی۔ اسی لیے وہ بجائے برہم یا شرمندہ ہونے کے، ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس پر گزشتہ طویل دورانیے سے گہری سوگوار کیفیت طاری تھی جس سے اس نے آخر کار نجات حاصل کر لی تھی۔ میں اُسے اُٹھانے کے لیے بڑھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا اور جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

میں نے پوچھا۔ ''میڈم! چوٹ تو نہیں لگی؟''

وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''اصولاً تمہیں ایسا کرنا چاہیے تھا۔ تم نے نہیں کیا، میں نے سوچا، میں کرلوں۔ کسی ایک کو تو ہنسنا چاہیے ناں۔''

اپنے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھنے لگی۔ کولھوں کے بل گرنے کی وجہ سے پینٹ کا عقبی حصہ بھی کیچڑ زدہ ہوگیا تھا۔ اپنے آپ کا جائزہ لینے کے بعد بولی۔ ''سوٹ کا ستیاناس ہوگیا ہے۔'' پھر کندھے اُچکا کر بولی۔ ''خیر! تمہیں تنبیہ کر رہی تھی، خود ہی گر گئی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ چلو!''

میں نے اس کی گن اُٹھا کر کندھے سے لٹکا لی اور چل پڑا۔ وہ جوگنگ کے سے انداز میں دوڑتی ہوئی میرے برابر پہنچی اور بولی۔ ''شہر یار! ہم تھوڑی دیر میں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جائیں گے جہاں پولیس کی بڑی نفری ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوگی۔ کیا تم نے یہ سوچا کہ ہم ان سے اپنی گاڑی کس طرح حاصل کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ بہتر جانتی ہیں۔''

اس نے منہ بنا کر مجھے دیکھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد تفکر آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہمارے پاس یہاں موجودگی کا جواز نہیں ہے۔ کوئی معقول سا جھوٹ تراشو ورنہ وہ ہمیں گاڑی نہیں دیں گے۔ یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ یہاں سگنلز بھی نہیں ہیں جس کی وجہ سے فون پر کسی سے رابطہ نہیں کیا جاسکتا۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ دِتے ماچھی کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق ڈیرے پر صرف ایک آدمی موجود تھا۔ اب اس تک رسائی ممکن نہیں رہی تھی کیونکہ پولیس ہمیں اس حصار کے اندر نہیں جانے دے گی۔ اگر ہم چھپ چھپا کر ڈیرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو پھر ہمیں پولیس کی اندھا دھند فائرنگ میں باہر نکلنے کا موقع نہیں ملنا تھا۔ ایسی حالت میں بہتر یہی تھا کہ ہم اپنی گاڑی کی فکر کرتے۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مالِ غنیمت کے علاوہ بھی چند نوٹ موجود تھے مگر کم تھے۔ ان نوٹوں سے کسی وردی پوش کو خریدنا محال تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ مجھے پولیس سے مک مکاؤ کا عملی تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت سوچا مگر کوئی معقول بہانہ سجھائی نہیں دیا تو میں نے مایوسانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم پولیس کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔''

اسی اثنا میں ہم سطحِ زمین سے آٹھ دس فٹ بلند واقع خودرو جنگل میں داخل ہوگئے۔ دو متوازی نالیوں والا راستہ جنگل میں بل کھا کر یوں غائب ہو رہا تھا جیسے سانپ لہرا کر بل میں گھس جاتا ہے۔ میڈم نے بے ساختگی سے کہا۔ ''ہاں! یہی راستہ پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاتا ہے۔ میں نے اس جھنڈ کی طرف جانے کی غلطی کی تھی.....''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک تیز چیختی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ کوئی اہلکار مائیکروفون پر مقامی زبان میں اعلان کر رہا تھا۔ ''پولیس نے ڈیرے کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ چاروں طرف نفری تعینات ہو چکی ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ بھی ڈیرے کے اندر موجود ہیں، وہ اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر باہر آجائیں ورنہ انہیں برے انجام تک پہنچا دیا جائے گا۔''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور رُک گئے۔ آگے جانا بے سود تھا۔ خطرے سے خالی بھی نہیں تھا کیونکہ پیرو ماچھی اور پولیس کے مابین خوف ناک پیچ کھیلا جانے والا تھا۔ میں نے آواز سے اندازہ کیا کہ مائیکروفون والا مجھ سے کم و بیش ایک فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا بول رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے الفاظ بدل کر اعلان کر رہا تھا۔ متن ایک ہی تھا کہ پیرو گینگ کے تمام ارکان ہتھیار ڈال کر گرفتاری دے دیں ورنہ انہیں گولی ماردی جائے گی۔

میڈم نے موبائل فون نکالا۔ اسکرین روشن کی اور وقت دیکھ کر بڑبڑائی۔ ''دو چالیس..... شہر یار! ہم کس

ستان سے نکلے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''پونے گیارہ بجے تھے۔ یعنی ہمیں شہر نکلے تین گھنٹے ہونے والے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''کیا ہمیں ڈیرے کی طرف جانا چاہیے؟''

''وہاں جا کر کیا کریں گے؟'' میں چونکا۔

''صورتِ حال کا جائزہ لیں گے۔ اگر موقع ملا تو اپنی ازی نکال لائیں گے۔''

''میڈم! وہاں ہمارا دکھائی دینا ہمارے لیے خطرناک ابت ہوگا۔'' میں نے تشویش آمیز لہجے میں باور کرایا۔

''تو پھر ان کے لوٹنے کا انتظار کیا جائے؟''

''بہتر تو یہی ہے.....'' میں نے اپنی دانست میں بہتر مشورہ دیا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور راستے سے ہٹا کر درختوں کی طرف چل دی۔ اس کا نہہ اور لائی کے غیر معمولی گھنے جنگل میں کیکر کے بلند قامت درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جنگل کے کنارے پر چلتے ہوئے چند گز دور پہنچ کر رُک گئے۔ ایک طرف جنگل تھا۔ دوسری طرف کٹاؤ یافتہ گڑھا..... وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولی۔ ''شہر یار! ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں پولیس والوں کو الو بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''وہ کیسے میڈم؟''

میرے اور اس کے بیچ دو تین فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ وہ میری جانب کھسک آئی۔ انہی ساعتوں میں چاند سیاہ بدلی سے دامن چھڑا کر دنیا کو دیکھنے لگا۔ پہلے سے قدرے شوخ چاندنی پھیل گئی۔ دریا کی سفید لکیر، دلہن کے پاؤں میں بندھی ہوئی چاندی کی پازیب سی، نظروں کو بھلی لگنے لگی۔ میڈم شکیلہ دریا پر نظریں جمائے شوخ انداز میں گویا ہوئی۔ ''تم نے سنا تھا، پولیس والا کیا کہہ رہا تھا؟''

پولیس والوں کی بہت سی باتیں ہم نے سنی تھیں جب ہم ڈھنڈ کے پاس گھنی جھنگی میں دبکے بیٹھے تھے۔ وہ نہ جانے کس بات کا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''چودھری کو کسی اہلکار نے رپورٹ دینے کے بعد کہا تھا کہ 'لگتا ہے کوئی امیر جوڑا ہنی مون پر نکلا ہے..... یاد کرو!''

میں جھینپ کر بولا۔ ''میڈم! وہ تو بکواس کر رہا تھا، ایسی باتیں یاد رکھنے کی کہاں ہوتی ہیں۔''

رات کے سناٹے میں جلترنگ سی بج اُٹھی۔ اس کی ہنسی

روزمرہ تھکن کو بدل ڈالئے
چستی اور توانائی میں!
VITALITA SYRUP
Food Supplement for Vitality
Verified by PCSIR
ایک انمول خزانہ، ہر دم رکھے توانا
Rs.250/=
★ بدن کو معدنیات کی فراہمی
★ پروٹین کی کمی کا خاتمہ
★ دماغی کارکردگی میں بہتری
★ بدن کے لئے چستی اور توانائی
★ بیماریوں کے خلاف بھرپور مدافعت
★ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں کے لئے
★ سائڈ ایفکٹ سے مکمل محفوظ
★ روزمرہ کاموں کے لئے بھرپور توانائی
وائٹالیٹا سیرپ بذریعہ کوریئر/ وی پی پی
اپنے گھر منگوانے کیلئے فون کیجئے
0315-3830001, 0315-3830002
کراچی میں وائٹالیٹا سیرپ حاصل کرنے کیلئے
مراد میڈیکو اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال 0213-4943664
786 میڈیکل اسٹور بلاک 17، گلستان جوہر، نزد جوہر چوک 0213-4010647
یاد رکھیے، وائٹالیٹا سیرپ کسی اور دوسرے میڈیکل اسٹور یا رابطہ نمبر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا

زندگی سے بھرپور تھی۔ اس نے یک لخت مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑ لیا، بہ مشکل گھنٹیوں کی کھنک دباتے ہوئے بولی۔ ''ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کاسٹیبل بکواس نہیں کر رہا تھا، سچ کہہ رہا تھا۔ ہم جس کمیونٹی کے لوگ ہیں، وہاں ایسی خرمستیاں روا ہیں۔ ہم بھی جوانی کی آگ پر دریا کی برف ڈالنے ادھر آ نکلے تھے۔ کئی گاڑیوں کو ادھر آتا دیکھ کر ڈر گئے تھے اور گاڑی چھوڑ کر چھپ گئے تھے..... بس!''

حیرت ہوئی کہ اس نے کتنی بڑی بات کو کتنے عام سے انداز میں لیا تھا۔ مایوسی ہوئی کہ اس خام کہانی پر کسی کو یقین دلانا بہت محال تھا۔ اس نے میرا ردِعمل بھانپ لیا اور چیلنج کرنے کے سے انداز میں بولی۔ ''دعا کرو، پولیس جلد آپریشن سے فارغ ہو جائے تاکہ ہمارا وقت بچ جائے۔ تم بھی دیکھ لو گے کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔''

اس کے انداز نے مجھے باور کرا دیا کہ اس نے دل ہی دل میں اس احمقانہ سوچ پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اُسے مؤدبانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بہت بھونڈی کہانی ثابت ہو سکی اور ہمیں بقیہ رات تھانے کی حوالات میں گزارنا پڑے گی مگر وہ مجھ سے متفق نہ ہوئی۔

مائیکروفون سے متواتر پھوٹنے والی آواز خاموش ہو گئی۔ ہمیں یہاں بیٹھے دس منٹ کے لگ بھگ وقت ہو گیا تھا جب پیرو ماچھی کے ڈیرے کی طرف سے پہلے فائر کی گونج دار آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والوں نے 'نعرۂ تکبیر؛ اللہ اکبر' کی یک آواز صدائے پُرجوش بلند کی۔ پھر فائرنگ کا لگاتار سلسلہ چل نکلا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فائرنگ یک طرفہ تھی یا دوطرفہ.....

میڈم بڑے انہماک سے دریا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چاندنی سمٹ رہی تھی اور اس کے خال وخد کو مجھ پر آشکار کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، یوں لگا جیسے اس نے بڈھے کی بیوی اور بچے کے اغوا کو وقتی طور پر فراموش کر دیا تھا۔ وہ قطعاً مغموم، افسردہ یا متفکر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! ایک بات پوچھوں؟''

اس نے اپنا رُخ بدلے بغیر کہا۔ ''ہاں ہاں! پوچھو۔''

''آپ کا مزاج بڑا عجیب سا ہے۔ کسی پل پریشان، کسی ساعت برہم تو کسی لمحے بچوں کی طرح شوخ..... ایسا کیوں ہے؟''

وہ تھوڑی نخوت سے بولی۔ ''میں ڈیفرنٹ ہوں۔''

''کیوں؟''

''تم بتاؤ، تم اتنے پیچیدہ کیوں ہو؟ کسی وقت بہت چالاک، دلیر اور فتنہ پرداز دکھائی دیتے ہو تو کسی وقت سادہ لوح، دیہاتی اور بزدل..... ایسا کیوں ہے؟'' اس نے میری نقل اتاری۔

میں نے بات بنانی چاہی مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ بولی۔ ''اس لیے کہ تم بھی ڈیفرنٹ ہو۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب تمہارے پاس نہیں ہے۔ ہے نا؟..... میرے پاس بھی نہیں ہے۔''

اسی لمحے فائرنگ رُک گئی۔ میڈم نے چونک کر بڑی تیزی سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ یہ اُس کی غیر اختیاری حرکت تھی ورنہ ہمارے عقب میں سوائے گھنے جنگل کے کچھ نہیں تھا۔ کوئی پانچ سات منٹ بعد گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ریڈ مشن مکمل ہو چکا تھا اور پولیس کی فاتحانہ واپسی عمل میں آ رہی تھی۔

میڈم تیزی سے بولی۔ ''گنیں اس جھاڑی کے پیچھے رکھ کر میرے پیچھے آؤ۔ ہم دونوں نے چند دن پہلے شادی کی ہے..... یاد رکھنا!''

اس کے ساتھ ہی اُس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بلٹ بیلٹ اور دونوں بندوقیں جھاڑی کے پیچھے پھینکیں اور اس کے تعاقب میں تھڑے سے نیچے ریتیلی جگہ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ میں اس کے نقشِ قدم پر دوڑ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ریتیلے میدان میں چکرانے لگی۔ پولیس کی گاڑیاں تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ میڈم مجھ سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر دوڑ رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے منہ سے 'ہاؤ، ہو' کی تیز آوازیں نکال رہی تھی۔ اچانک رُکی، پلٹ کر چیخی۔ ''ہم زندگی کو انجوائے کر رہے ہیں، ڈو یو نو ڈارلنگ..... کم آن..... زندگی پھر کبھی دریا پر اس طرح کھیلنے کا موقع دے گی یا نہیں..... آج دے رہی ہے۔ انجوائے اِٹ.....''

وہ پارک میں کھیلتی ہوئی دس سالہ بچی کی طرح اچھل کود رہی تھی۔ میں نے پھولی ہوئی سانس میں قدرے برہمی سے کہا۔ ''میڈم! یہ کیا حماقت ہے؟''

میں رُکا تو وہ کچھ دور ہو گئی۔ اسی لمحے جنگل میں پولیس کی پہلی گاڑی نمودار ہوئی۔ میڈم اس کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں نہا گئی۔ ہاتھ لہرا کر دوڑتے ہوئے چیخی۔ ''کم آن ڈارلنگ..... اس حماقت پر عقل نثار..... اس لمحے پر ہزاروں تنہا صدیاں قربان.....''

اس کی آواز سناٹے میں بہت دور تک سنائی دے رہی تھی اور وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی جانب بلا رہی

تھی۔ مجھے ناچار اُس کی طرف دوڑنا پڑا۔ وہ پولیس کی گاڑی کی طرف بھاگ رہی تھی۔ جونہی گاڑی کے قریب پہنچی، یک ذرا رُکی پھر پلٹ کر میری جانب دوڑی۔ میرے سنبھلنے سے پیشتر اچھل کر مجھ پر لد گئی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اسے لیے زمین پر آن گرا۔ وہ تڑپ کر پہلو کے بل پلٹ گئی اور اپنا چہرہ میرے چہرے پر رگڑنے لگی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس ناٹک سے پولیس کو کیا دکھانا چاہتی تھی؟ تب سمجھ میں آیا جب پولیس کی اگلی گاڑی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پچھلی گاڑیاں بھی رُک گئیں اور ان کے ڈرائیور ہارن بجانے لگے۔ چند لمحوں بعد، جب گاڑی کے اندر بیٹھے ہوؤں کو ہمارے خالی ہاتھ ہونے کا یقین ہو گیا، گاڑی کا دروازہ کھلا اور بھاری رعب دار آواز گونجی۔ ''اوئے! تم کون ہو..... یہ فحاشی بند کرو اور ہاتھ سروں سے بلند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔''

میڈم نے سرگوشی کی۔ ''یہ تو وہی چودھری ہے۔ تم نے کچھ نہیں بولنا۔ میں اس سے نمٹتی ہوں۔''

ہم دونوں بیک وقت کھڑے ہوئے۔ میڈم نے میری کمر میں ہاتھ حائل کیا، میرا بازو پکڑ کر اپنے کندھوں پر ٹکایا اور چیخ کر کہا۔ ''تم ہماری پرائیویسی، جسے تم نے فحاشی کا نام دیا ہے، دیکھنے کے لیے یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے تھی ناں.....''

چودھری کے عقب میں کئی قہقہے گونجے اور ایک شوخ آواز سنائی دی۔ ''ڈو جا پا سا کرو چودھری صاحب! آپ کو شرم آنی چاہیے تھی ناں!''

چودھری نے گردن موڑ کر کسی کو ڈانٹا۔ ''اوئے اپنی گندی چونچ بند کر بھتنی کے.....''

پھر گن ہاتھ میں پکڑ کر تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ چونکہ اس کے عقب میں وین کی تیز ہیڈ لائٹس روشن تھیں، اس لیے ہمیں اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قریب آ کر رُک گیا۔ بولا۔ ''تم کون ہو؟''

میڈم نے میری کمر سے ہاتھ نکال لیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''ہم وہ ہیں جن کی لینڈ کروزر تم لوگ پوچھے بغیر لے کر چلتے بنے۔ پولیس اگر چوری چکاری کا کام سنبھال لے تو پھر چور بے چارے بھوکے مرنے لگیں گے۔ اپنے آدمیوں کو بولو، وہ میری گاڑی اِدھر لا کھڑی کرے۔''

وہ جواں سال اور خوب صورت لڑکی تھی۔ قیمتی لباس میں ملبوس تھی۔ شکر تھا کہ لباس کا اگلا حصہ کیچڑ سے محفوظ رہا تھا۔ مضبوط اور حاکمانہ انداز میں، چودھری کے رعب و دبدبے کو خاطر میں لائے بغیر اپنی لینڈ کروزر مانگ رہی تھی۔ چودھری ٹھٹک گیا۔ نادان نہیں تھا۔ سمجھ گیا کہ اس پر اعتماد انداز میں پیش آنے والی لڑکی عام نہیں ہوتی، خاص ہوتی ہے۔ خاص لوگوں سے خاص برتاؤ کیا جاتا ہے، جانتا تھا۔ تبھی قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''اچھا! تو وہ گاڑی آپ کی ہے۔ ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ پیرو گینگ شہر سے چرا لایا ہے۔''

''اگر تم لوگ واپس نہ آتے تو ہمیں ساری رات ادھر ہی گزارنا پڑتی۔'' میڈم نے منہ بنا کر کہا۔ ''تم نے پوچھا تھا کہ ہم کون ہیں۔ سنو! میں ملک عظمت اللہ خان کی بھتیجی ہوں۔ ملک عظمت اللہ کون ہیں؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔ نہیں جانتے تو بتا دیتی ہوں۔ ایڈیشنل آئی جی پولیس ہیں۔ کہو تو فون پر بات کرا دیتی ہوں..... اور یہ میرا ہزبینڈ ہے۔'' پھر ہنس کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بتاؤ ناں اِسے کہ تم 'زوں' کر کے جہاز اُڑاتے ہو اور ملک دشمنوں پر بڑے بڑے بم گراتے ہو.....''

وہ اتنی روانی سے بول رہی تھی کہ چودھری کو کچھ بولنے اور پوچھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ ''بتاؤ ناں..... تم نے جہاز کے جو کرتب مجھے ائربیس پر دکھائے تھے، ان کا خلاصہ انسپکٹر کو سناؤ ناں.....''

ساتھ ہی اُس نے جھپٹ کر میرے دونوں کان پکڑے اور کھینچ کر اچھلتی ہوئی، خوشی سے چیختی ہوئی ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں 'ٹھہرو، ٹھہرو' کے نعرے بلند کرتا ہوا اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ کچھ فاصلے پر پہنچ کر ایک ذرا رُکی اور چیخ کر بولی۔ ''انسپکٹر! میری گاڑی ادھر ہی کھڑی کر جانا..... میں بزی ہوں، پھر ملاقات ہو گی۔ انکل سے بات کراؤں گی تمہاری۔ بائی بائی!''

اس کی ہنسی فضا میں گونجی۔ ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کر گئے۔ ایک بڑی ٹارچ کی تیز روشنی کا ہالا ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے دبوچ لیا۔ وہ بولی۔ ''مجھے پکڑ کر کھینچو.....''

میں نے اس کی بانہیں پکڑ کر ایک جانب کو کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ بلند آواز میں چیخی۔ ''پولیس..... ہیلپ می..... پولیس..... مجھے میرے شوہر سے بچاؤ..... بچاؤ..... ہیلپ می.....''

اس کی آواز سناٹے میں بازگشت پیدا کرنے لگی۔ عجیب

ماحول بنا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ٹارچ کی تھرکتی ہوئی روشنی نے ہمیں آزاد کرتے ہوئے کھل کھیلنے کا موقع عنایت کر دیا۔ چودھری کی شوخ آواز سنائی دی۔ ''جہاز اُڑانے والے شوہر سے خدا بچا سکتا ہے، پولیس نہیں۔ ہم آپ کی گاڑی چھوڑے جا رہے ہیں۔ سنبھال لیں۔ گڈ بائی!''

ایک اور آواز سنائی دی۔ ''یہ خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں سے فوراً نکل جائیں ورنہ.....''

میں نے میڈم کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ دریائی ریت پر گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تمہیں ہماری اتنی ہی فکر ہے تو دو چار سپاہی بھی بندوقوں سمیت یہاں چھوڑے جاؤ۔ ہم انہیں علی الصباح تھانے پہنچا دیں گے۔''

اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قطار کی صورت میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ لینڈ کروزر سب سے پیچھے تھی۔ اس میں سے دو سپاہی نکل کر اگلے ڈالے میں سوار ہوئے اور بھی گاڑیاں رینگنے لگیں پھر غراتی ہوئی ڈھنڈ کی طرف مڑ گئیں۔

میں آہستگی سے میڈم کے سامنے جا کھڑا ہوا پھر اُس کے مقابل گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور تحسین آمیز انداز میں بولا۔ ''میڈم! آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ واقعی ڈیفرنٹ ہیں۔''

اس نے چہرہ اُٹھایا، آسودگی سے آنکھیں بند کیں اور کمان کی طرح پیچھے کی طرف دہری ہو گئی۔ اگر میں اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر لیتا تو وہ گر گئی ہوتی۔ اُسے سنبھالا اور کھینچ کر سیدھا کرنا چاہا تو وہ ایک جھٹکے سے میرے سینے سے آن ٹکرائی۔ اپنے ہاتھ چھڑا کر مجھ سے لپٹ گئی اور میرے سینے پر آہستگی سے گال رگڑتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کتنے نمبر حاصل کیے ہیں؟''

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، 'سو بٹا سو' اور پھر غیر متوقع جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر زور سے بھینچ لیا۔ اس کی بھنچی بھنچی آواز ابھری۔ ''تھوڑا اور.....''

میرے بازوؤں کے اعصاب کھنچے۔ وہ بولی۔ ''اور کس دوناں!''

اس نے اپنا بند آنکھوں والا چہرہ اوپر اُٹھایا اور ہولے سے کھانسی۔ میں نے اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ اچانک وہ تڑپی اور میری گرفت سے نکل کر کھڑی ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ بولی۔ ''تھک گئی ہوں۔ چلو؛ سردی لگ رہی ہے۔''

وہ تھکی نہیں تھی مگر تھکاوٹ کے پردے میں چھپ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے حد سے گر کر شاید خود کو اس کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ میں اٹھ اور گاڑی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''سوری میڈم! دراصل مجھے اختیار.....''

اس نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ''نہیں ڈیئر! ایکسکیوز نہ کرو۔ انسان اور کمپیوٹر میں یہی بنیادی فرق ہے۔ وہ صرف فیڈ کیا گیا مواد لوٹاتا ہے۔ انسان ہر بار نیا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ دریا پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔''

اس نے بڑی لاجواب اداکاری کی تھی۔ چند ہی لمحوں میں چودھری نامی انسپکٹر مطمئن ہو گیا تھا تو یہ میڈم کے غیر معمولی اعتماد، بچگانا طور اور بے خوف رویے کا کمال تھا۔ میڈم نے اسے نہ تو پوچھ گچھ کے لیے وقت دیا تھا، نہ اُسے تشکیک کا کوئی موقع فراہم کیا تھا۔

وہ مسرور کن انداز میں مجھ سے چمٹ کر چل رہی تھی۔ دھیمی آواز میں کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اگر وہ آپ کے کہنے پر ملک عظمت اللہ کو فون کر لیتا تو؟''

وہ ہنسی۔ ''کیسے؟ یہاں تو سگنلز ہی نہیں آتے۔''

''وہ ہمیں تھانے لے جاتا اور وہاں سے فون.....''

''اوہ یار! بھلا ایک انسپکٹر میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ ایڈیشنل آئی جی کو فون کرے۔ وہ بھی اتنی رات گئے۔''

ہم گاڑی کے پاس پہنچے۔ اس نے سرسری انداز میں گاڑی کا جائزہ لیا۔ سب کچھ 'اوکے' تھا۔ پھر کچھ فاصلے پر چاندنی میں چمکتی ہوئی ریت پر ٹانگیں پسار کر جا بیٹھی۔ بولی۔ ''اپنا اسلحہ اُٹھا لاؤ۔ میں تب تک ٹھنڈی ریت سے کھیلتی ہوں۔''

میں تیز تیز قدموں سے جنگل تک پہنچا۔ ٹیلے پر چڑھا۔ جھاڑی کے پیچھے پڑی ہوئی گنیں اور بلٹ بیلٹ اُٹھائیں۔ ابھی بلٹ بیلٹ کمر پر باندھ ہی رہا تھا کہ اچانک میڈم کی تیز چیخ سناٹے کا سینہ چیر گئی۔ میں نے جھٹکے سے پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ میرا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا اور یوں لگا جیسے چار سو گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

ہم نشیں

منظر امام

عہدِ حاضر میں زندگی جس قدر تیزی سے اپنی قیمت گنوا رہی ہے اسی شدت سے بناوٹ اور تصنع ہمارے معمولات میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ حالات کا اتار چڑھاؤ نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کی زندگی میں بھی بدلاؤ کا سبب بن رہا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی ہم نشین و غمگسار تھا جسے زمانے کے بدلاؤ نے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اور... احساس کوئی بھی ہو جب طاقت پکڑتا ہے تو دنیا ادھر سے ادھر کر دیتا ہے۔

انسان اور جانور کی زندگی کا ایک دلچسپ تقابلی جائزہ

میرا دل چاہا کہ میں اس کم بخت کو پتھر مار مار کر بھگا دوں۔

اتنی مشکلوں سے تو میں نے یہ کچرا گھر تلاش کیا تھا جو ایک شادی ہال کے برابر میں تھا اور اکثر یہاں بچا ہوا کھانا پھینک دیا جاتا تھا شیرمال، تافتان، بریانی وغیرہ۔

میں نے سوچا تھا کہ چلو خوراک کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ میں اس کچرا گھر کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہوں۔ یہاں مجھے ڈسٹرب کرنے کوئی نہیں آئے گا لیکن وہ کم بخت آن ٹپکا

تھا وہ تھا تو خوب صورت، گول مٹول سا لیکن کتا ہی تھا، گلیوں میں آوارہ پھرنے والا، جس کی کوئی اوقات نہیں ہوتی، جس کا کوئی نام نہیں ہوتا، جس کو پتھر مار مار کر بھگا دیا جاتا ہے۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال خود میرے ساتھ بھی تھی۔ لیکن میں اس سے برتر اس لیے تھا کہ میں انسان تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے، میری ڈاڑھی جھاڑیوں کی طرح لٹک آئی تھی۔ میرے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے یا چپل نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میرے گندے اور غلیظ بدن پر کھرنڈ سی جم چکی تھی۔ اس کے باوجود میں ایک انسان تھا، اشرف المخلوقات۔

یہ اور بات ہے کہ اس اشرف مخلوق نے گزشتہ تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا اور جب اس نے ایک شادی ہال کے برابر والا یہ کچرا گھر تلاش کر لیا تو یہ ناہنجار کتا نہ جانے کہاں سے آن مرا تھا۔

میں نے اس کتے کو مخاطب کرتے ہوئے باقاعدہ تقریر کر ڈالی۔ ”اے دو کوڑی کے آوارہ کتے! تیری حیثیت ہی کیا ہے کہ تو انسان سے مقابلہ کرے۔ تو چلا جا یہاں سے ورنہ پتھر مار کر سر پھاڑ دوں گا۔ آوارہ انسان کا علاج تو ہو جاتا ہے، لیکن تیرا علاج کوئی نہیں کرے گا اور تو کتے کی موت مارا جائے گا لیکن تجھ سے کیا کہوں کیونکہ تو تو ویسے ہی کتا ہے۔“

میری تقریر سن کر کتے نے اپنی گردن اوپر اٹھائی۔ کتے کی طرح ہلکی سی آواز نکالی پھر مجھ سے کہنے لگا۔ ”بے وقوف انسان۔ اپنا رزق تلاش کرنے کچرا گھر تک تو آ گیا ہے۔ پھر بھی خود کو مجھ سے افضل سمجھ رہا ہے۔“

مجھے امید نہیں تھی کہ کتا باقاعدہ باتیں کرنے لگے گا۔ اس لیے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی اور بول رہا ہو۔ اس پر کتے نے مجھے ڈانٹ پلا دی۔ ”اب اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ میں بول رہا ہوں، تیرے سامنے کھڑی ہوئی وہ مخلوق جس کو تو کتا کہتا ہے۔“

”تو کیا تم کتے نہیں ہو؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بے وقوف میں کتا ہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ اور بات ہے کہ بولنا سیکھ گیا ہوں۔“

اسی دوران ایک آدمی وہاں نمودار ہوا۔ اس نے ایک پیکٹ کچرا گھر کی طرف اچھال دیا۔ اس نے مجھ پر دھیان نہیں دیا تھا یا چونکہ میں کتے کے پاس کھڑا ہوا تھا، اس لیے مجھے بھی کتا ہی سمجھا ہو۔ نہ جانے اس پیکٹ میں کیا تھا۔ بیک وقت ہم دونوں ہی اس کی طرف لپکے تھے۔ میں نے وہ پیکٹ اٹھا لیا۔ اس میں شیر مال کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ ”یہ دیکھ۔“ میں نے کتے کو وہ ٹکڑے دکھائے۔ ”یہ ہم انسانوں کی خوراک ہے، شیر مال۔ ہم شادی کے موقعوں پر اس سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں لیکن تجھے کیا معلوم کہ تو، تو کتا ٹھہرا۔ تو کیا جانے کہ ہم انسان کیا کیا مزے مزے کی چیزیں کھاتے ہیں۔“

”انسان کھاتے ہیں نا۔“ کتا میری بات سن کر ہنسنے لگا تھا۔ ”تو اپنی بات کر۔“

”کیا پاگل ہو گیا ہے؟“ میں غصے سے بولا۔ ”میں بھی انسان ہی ہوں۔“

”غلط فہمی ہے تیری۔“ کتے نے کہا۔ ”انسان تو وہ ہے، وہ دیکھ۔ وہ جو سامنے گاڑی سے اترا ہے۔ کیا شاندار کپڑے پہن رکھے ہیں اس نے اور اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ کتنی خوب صورت ہے۔ انسان یہ سب ہیں، تو کہاں کا انسان ہے۔“

”بے وقوفی کی بات مت کر۔ میں بھی انسان ہوں، ان ہی جیسا۔“

”اچھا۔ تو پھر ان کے پاس جا کر کھڑا ہو جا۔“ کتے نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہاں چار پانچ سوٹ اور ٹائیوں والے ایک دائرہ بنائے کھڑے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

ان کی مضبوط آوازیں یہ ثابت کر رہی تھیں کہ ان کی جیبیں بھری ہوئی ہیں۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں اور ان کے بینک بیلنس بھرے ہوئے ہیں۔

”اب جا نا..... سوچ کیا رہا ہے؟“ کتے نے مجھے اکسایا۔ ”جا۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ تو کتنا بڑا انسان ہے۔ تو بس ان کے پاس جا کر کھڑا ہو جا۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی اپنا انسان ہونا ثابت کر دیتا ہوں۔“

میں ٹہلتا ہوا ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے غصے سے کہا۔ ”ابے کیا کر رہا ہے یہاں، دفع ہو جا۔“

”بھائی صاحب، میں تو.....“ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”جاتا ہے یا نہیں۔“ ایک باڈی بلڈر قسم کے شخص نے آگے بڑھ کر مجھے دھکا دے دیا۔

مجھ میں جان ہی کتنی تھی۔ فاقوں نے تو مجھے بے

حد کمزور کر رکھا تھا۔ اس لیے میں اس کا دھکا برداشت نہیں کر سکا اور کچھ دور جا گرا۔ وہ لوگ پھر اپنی باتوں میں اس طرح مصروف ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ کیسا دکھ ہوا تھا مجھے۔ میں آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا کتے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کم بخت زور زور سے ہنسے جا رہا تھا۔

”دیکھ لیا تم نے۔“ اس نے کہا۔ ”تم انسان نہیں ہو سکتے کتے سے بھی بدتر ہو۔“

اس وقت میرا دھیان اس پیکٹ کی طرف تھا جس میں شیر مال کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جھپٹ کر وہ پیکٹ اٹھا لیا پھر ہم دونوں مل کر وہ شیر مال چبا رہے تھے۔

اس وقت مجھے یہ ہوش نہیں رہا تھا کہ میں ایک کتے کے ساتھ بیٹھا ہوا کھا رہا ہوں۔ اس کی بھی فکر نہیں تھی کہ یہ کتا کم بخت باقاعدہ باتیں کرتا ہے اور اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ انسانوں نے مجھے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ کیونکہ میں ان کے قریب کھڑے رہنے کے قابل نہیں تھا۔

شیر مال کے ٹکڑے پیٹ میں اتار لینے کے بعد جان میں جان آ گئی اور میں نے احسان کرنے والی نگاہوں سے کتے کی طرف دیکھا۔ ”او بدبخت کتے۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”جا میں نے تجھے معاف کیا۔“

”معاف کرنے کی شرط بھی بتا دو۔ کیونکہ انسان شرط لگائے بغیر کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ احسان بھی کرتا ہے تو پہلے فائدہ سوچتا ہے، تم بتاؤ..... تم نے کیا سوچا ہے؟“

”تو یہاں سے چلا جا۔ یہ کچرا گھر میری ملکیت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ برابر میں جو شادی ہال ہے یہ مجھ جیسے انسانوں کا ہے، تجھ جیسے کتوں کا شادی ہال نہیں ہے۔ یہاں انسانوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ خیر تم کتوں کو کیا معلوم کہ شادی کیا چیز ہوتی ہے۔“

”اوہو، تو کیا تمہیں معلوم ہے۔“ کتا میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ”تمہاری حالت سے تو پتا نہیں چلتا۔“

اس بدبخت نے مجھے ایک بار پھر اداس کر دیا تھا۔ میری زندگی ایسی کہاں تھی کہ میری شادی ہو سکتی۔ میں نے تو صرف شادیاں ہوتے ہوئے دیکھی تھیں۔ مفلسی نے کبھی اس کا تجربہ کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔

میں نے اپنی زندگی ایک یتیم خانے میں گزاری تھی۔ وہاں کے منشی کا یہ کہنا تھا کہ کوئی مجھے یتیم خانے کے دروازے پر ڈال گیا تھا۔ اس وقت میں صرف ایک ہفتے کا تھا۔

چونکہ وہ یتیم خانہ کچھ اس قسم کا تھا کہ اِدھر اُدھر پھینکے ہوئے بچوں کی پرورش کیا کرتا تھا اور ان ہی کے نام پر سالانہ لاکھوں روپے بٹورتا تھا اس لیے مجبوراً یتیم خانے والوں کو میری پرورش کرنی پڑ گئی تھی۔

جب میں سات آٹھ برس کا ہوا تو ایک میاں بیوی یتیم خانے سے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ویسے تو ان کے یہاں کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ انہوں نے کسی حد تک مجھے تعلیم بھی دلوائی۔ میرے کھانے پینے کا بھی خیال رکھتے تھے لیکن ان کے یہاں ایک دشواری یہ تھی کہ دونوں آپس میں ہر وقت لڑتے رہتے تھے اور ہر لڑائی کے بعد بجائے ایک دوسرے کو مارنے کے مجھے مارتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہونے لگتا اور میری شامت آ جاتی۔ ایک دن میں نے تنگ آ کر پوچھا۔ ”آپ لوگ اپنے جھگڑے کے بعد میری ٹھکائی کیوں کرتے ہیں؟“

”بیٹے، ہم اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔“ شوہر نے بتایا۔ ”کیونکہ ہمارے یہاں عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔ بہت برا سمجھا جاتا ہے، اسی لیے میں غصے میں آ کر تمہیں مارنے لگتا ہوں۔“

”اور یہی میرے ساتھ بھی ہے۔“ بیوی نے کہا۔ ”ہمارے یہاں بھی شوہر پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے میں تمہیں مارتی ہوں۔“

”یعنی آپ لوگ مجھے یتیم خانے سے صرف اس لیے اٹھا کر لائے ہیں کہ میری ٹھکائی کرتے رہیں؟“

”اب کیا کریں بیٹا۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو آپس میں خون خرابا ہو جائے۔“

میں چونکہ مار کھا کھا کر تنگ آ چکا تھا اس لیے میں اس گھر سے بھاگ گیا۔ خدا جانے میرے بھاگ جانے کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کا کیا حشر کیا ہوگا۔

بہر حال میں نے اس طرح کی زندگی گزاری۔ گیرج پر کام کیا۔ ہوٹلز میں برتن دھوئے۔ ایک دفعہ چوری بھی کی۔ صفائی کا کام کیا اور نہ جانے کیا، کیا کرتا رہا اور وقت گزرتا چلا گیا۔

میرے پاس رہنے کے لیے نہ گھر ہو سکا اور نہ پہننے کے لیے کپڑے اور نہ کھانے کے لیے مناسب کھانا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔ میں نے کئی برسوں تک بھیک بھی مانگی۔

اس وقت تک میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو لوگ مجھے بھیک دیتے ہیں وہ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد یہ پتا چلا کہ اس دنیا میں صرف دو قسم کے لوگ ہیں۔ بھیک دینے والے اور بھیک لینے والے۔ ان کے علاوہ اور کوئی قسم نہیں ہے۔ پھر ایک بار دو مذہبی گروہوں

کے درمیان جھگڑے دیکھے اور اندازہ ہوا کہ شاید دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ جن کا مذہب اس طرف جھنڈے اور ڈنڈے لیے کھڑا ہے اور دوسرے وہ جن کا مذہب دوسری طرف جھنڈے اور ڈنڈے لیے کھڑا ہے۔

پھر دو سیاسی پارٹیوں کے درمیان جھگڑے دیکھے، تو یہیں خیال ہوا۔ دو زبانیں بولنے والوں کو دیکھ کر ایسا ہی لگا، پھر میں نے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

میرا مسئلہ تو کچھ اور تھا۔

میرا مسئلہ تھا، بھوک اور سر چھپانے کی جگہ۔

خاص طور پر جب بارش ہوتی تو بہت پریشانی ہوجاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں۔ کسی دکان کے چھجے کے نیچے پناہ لے لیتا یا کسی ایسی ہی جگہ پہنچ جاتا اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا۔

پھر رات بھی میرے لیے پرابلم لے کر آتی تھی۔ دن میں تو کہیں بھی پڑا رہتا تھا کسی پارک میں، کسی پل کے نیچے یا کسی فٹ پاتھ پر لیکن رات میرے لیے عذاب بن کر آتی۔ کہیں بھی سونے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی۔

ایک دفعہ راجا نام کا ایک نوجوان مجھے مل گیا۔ پتا نہیں وہ نوجوان ہی تھا یا کیا تھا کیونکہ اس کو دیکھ کر پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ جوان ہے یا بوڑھا ہے کیونکہ اس کی حالت بہت سوختہ تھی۔

بہرحال وہ ایک عقل مند آدمی تھا۔ میں نے جب اپنی پرابلم بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ ''کتنے دنوں سے نہیں سوئے ہو؟''

''کئی دن ہوگئے۔'' میں نے بتایا۔ ''سونے کے لیے ترس رہا ہوں۔ میری آنکھیں باہر آنے والی ہیں۔ سر پھٹنے والا ہے۔ گردے جواب دینے والے ہیں اور زندگی ہاتھ سے نکلی جارہی ہے۔''

''خیر، خیر یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔'' وہ مسکرادیا۔ ''اچھا یہ بتا کبھی چوری کی ہے؟''

''چوری! نہیں تو، بھیک مانگی ہے، کام کیا ہے لیکن چوری نہیں کی۔''

''اب چوری کر۔'' اس نے کہا۔

''کیوں، اس سے کیا ہوگا؟''

''تیری نیند پوری ہوجائے گی۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن کوشش یہ کر کہ تیری چوری پکڑی جائے۔''

''یہ تم کیسی الٹی ترکیب بتا رہے ہو۔ نیند سے چوری کا کیا تعلق؟''

''بے وقوف ..... پکڑا جائے گا تو پولیس والے تجھے جیل بھیج دیں گے۔ بس وہاں آرام سے سوتے رہنا۔''

''ہاں؟ یہ ترکیب اچھی ہے۔ میں ابھی چوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے ایک دکان سے چوری کی اور وہ بھی اس طرح کہ دکان والے نے مجھے دیکھ لیا لیکن اس نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا بلکہ میری ٹھکائی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔

جھلا کر میں نے ایک محلے میں جا کر چوری کی۔ وہاں بھی یہی تماشا ہوا۔ کم بختوں نے میرا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر پورے محلے میں گھمایا لیکن پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ میں ان کی خوشامدیں کرتا رہا۔ کہتا رہا کہ خدا کے لیے مجھے پولیس کے حوالے کردو۔ جیل بھیج دو، لیکن کسی نے میری بات نہیں مانی۔

پھر میں نے چوری کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ میری قسمت میں نہ تو جیل تھی اور نہ ہی نیند۔

اسی دن میں ایک پارک میں بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک بندے کو مجھ پر ترس آ گیا۔ اس نے میرا حلیہ دیکھ کر میری حالت کا اندازہ کرلیا تھا۔ میں نے اسے اپنی ساری داستان سنادی کہ میں کس طرح نیند کے لیے ترس رہا تھا۔

وہ شریف آدمی مجھ پر ترس کھا کر مجھے اپنی کھولی میں لے آیا۔ یہ کھولی لائنز ایریا میں تھی اور میں ابھی اس کا شکریہ ادا کر کے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔

وہ آدمی ایک مشہور چور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جیل ہوگئی۔ خود سوچیں، جب تک میں اپنے طور پر جیل جانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس وقت کچھ نہیں ہوا اور جب ایک شریف آدمی اپنے گھر لے گیا تو چھاپہ پڑ گیا اور مجھے جیل ہوگئی۔ اس طرح میں جیل بھی ہو آیا۔

تو یہ ہے میری داستان۔ اور تازہ صورتِ حال یہ تھی کہ میں نے کئی وقتوں سے کچھ نہیں کھایا تھا اور بھٹکتا ہوا شادی ہال کے برابر والے کچرا گھر میں آ گیا تھا۔

ہاں ایک بار بہت دلچسپ بات ہوئی تھی۔ ایک شام میں اسی طرح نڈھال فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا کہ کچھ لوگ وہاں سے گزرے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر آپس میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر وہ میرے پاس آ گئے۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''نام، یہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''نام، نام ہوتا ہے..... جیسے میرا نام ہے نواز۔ یہ میرے ساتھی ہیں مختار اور یہ نسیم۔ اسی طرح تمہارا بھی تو کوئی نام ہوگا جس نام سے لوگ تمہیں پکارتے ہوں گے۔''

''منشی صاحب مجھے نمبر آٹھ کہا کرتے تھے۔'' میں نے بتایا۔ ''ہوسکتا ہے میرا یہی نام ہو۔ اس کے علاوہ جو ہاں بیوی مجھے صرف مارنے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ مجھے چھوکرا کہا کرتے تھے۔''

''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتا، یہ کون ہوتے ہیں؟'' میں نے بتایا۔ ''البتہ سنتا آیا ہوں کہ لوگوں کے ماں باپ بھی ہوتے ہیں۔''

ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''یہ آدمی یا تو پاگل ہے یا بہت بڑا فلاسفر ہے۔''

''چلو۔ یہ بتاؤ تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''بھوک۔ میں سوائے بھوک کے اور کچھ نہیں جانتا۔''

''تم نماز پڑھتے ہو؟''

''لوگوں کو مسجدوں میں جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔ خود مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' میں نے بتایا۔

''یہ تو کافر معلوم ہوتا ہے۔'' دوسرے نے فتویٰ دے دیا۔

''زندگی میں کبھی روزہ رکھا ہے؟''

''یہ کس طرح رکھا جاتا ہے؟''

''اس میں کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔''

''پھر تو میں نے ساری زندگی روزہ ہی رکھا ہے۔ اس وقت بھی میں روزے سے ہوں کیونکہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

وہ لوگ مجھے لعنت ملامت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ان میں سے ایک نے جاتے جاتے مجھے جہنم رسید ہونے کی بشارت بھی دے دی تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ جہنم کیا چیز ہے اور جنت کیا ہوتی ہے۔ ہاں البتہ ایک بار ایک جلسے میں بیٹھ گیا تھا۔ وہاں مولوی صاحب لوگوں کو جہنم اور جنت کے بارے میں بتا رہے تھے۔

میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ جس دن مجھے کچرے سے کھانے کو مل جاتا تھا۔ میں وہ دن جنت میں گزارتا تھا اور جس دن کچھ نہیں ملتا تھا میرے لیے وہ دن جہنم کا ہوتا تھا۔ بس اس کے علاوہ مجھے جنت اور جہنم کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر کتے نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے دوست۔ اتنے چپ چپ کیوں ہو؟''

مجھے اس کا دوست کہنا بہت برا لگا تھا۔ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ کسی کتے کو دوست سمجھ لیتا۔ اس لیے

اطالوی موسیقار کی دو باتیں مشہور تھیں

ایک اس کی بدصورتی دوسری خواتین کے لیے محترم رویہ۔ ایک مرتبہ وہ اوپیرا میں ریہرسل کروا رہا تھا جہاں امریکی لڑکی گا رہی تھی۔ بار بار بے سری ہوجاتی۔

موسیقار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا مگر عادت سے مجبور وہ صنف نازک کے لیے کوئی سخت کلمہ نہ کہہ سکتا تھا چنانچہ بولا۔ ''کرسٹوفر کولمبس پر لعنت ہو جس نے امریکا دریافت کیا۔''

مرسلہ: مقبول حسین ابن عاشق حسین، خوشاب

میں نے اس سے کہا۔ ''زبان سنبھال کر بات کر کتے! میں انسان ہوں، اشرف مخلوق، میں تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔''

''اچھا تو پھر ایسا کرو جاؤ کسی انسان سے دوستی کر کے دکھادو۔'' اس نے کہا۔ ''پھر میں تمہیں انسان مان لوں گا۔''

کم بخت نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

میں انسان کہاں تھا، انسان تو صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ کھانے کھاتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ شادیاں کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ میں تو ان کاموں میں سے کچھ نہیں کر پا رہا تھا پھر انسان کہاں سے ہوگیا۔

صرف دو ہاتھ، دو ٹانگیں اور دو کان وغیرہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ کتا اب مجھے زہر لگنے لگا تھا۔ کم بخت میری ہر کمزوری سے واقف ہوتا چلا جارہا تھا۔

''اچھا دوست۔'' تھک ہار کر میں نے اسے دوست کہہ کر مخاطب کر ہی لیا۔ ''چلو مان لیا کہ تم میرے دوست ہو۔ لیکن اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ تم میرے برابر آ گئے ہو۔''

کتا خوش ہوکر دُم ہلانے لگا۔ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ''چلو۔ ابھی اتنا ہی بہت ہے۔''

''دیکھو، اس وقت کھانے کا مسئلہ تو حل ہوگیا ہے۔ اب یہ سوچو کہ رات کہاں گزاریں گے۔''

''اسی کچرے گھر پر۔'' اس نے بتایا۔ پھر خود ہی بول

پڑا۔ ''ہاں تمہارے لیے مشکل ہوگی کیونکہ تم انسان جیسے ہو۔ میرا کیا ہے میں تو کہیں بھی گھس کر سو سکتا ہوں۔''

اس وقت ایک بہت ہی شرم ناک سا خیال میرے ذہن میں آیا۔ وہ خیال یہ تھا کہ کاش میں بھی کوئی کتا ہوتا پھر کتنی آسانی ہوتی لیکن اس بے تکے خیال کو میں نے فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ کیونکہ میں کسی کتے کا دوست تو ہو سکتا تھا لیکن خود کتا نہیں ہو سکتا تھا۔

''اچھا تم یہیں ٹھہرو، میں تمہارے لیے کوئی جگہ تلاش کر کے آتا ہوں۔'' کتے نے کہا۔

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اتنی دیر میں ہم ایک دوسرے سے مانوس جو ہو گئے تھے۔ اس کی واپسی جلد ہی ہو گئی تھی۔ ''آؤ، میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے ایک جگہ ڈھونڈ لی ہے۔''

ایسا کم ہی ہوا ہوگا۔ لوگ آگے آگے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے ان کے کتے دُم ہلاتے ہوئے چلتے رہتے ہیں۔ یہاں کتا آگے آگے جا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے باوجود یہ خناس میرے ذہن میں بسا ہوا تھا کہ میں بھی انسان ہوں، اشرف مخلوق۔ ہت تیری کی۔

وہ مجھے ایک فلیٹ کی عمارت کے پچھلے حصے کی طرف لے آیا تھا۔ یہ ایک گندی گلی تھی۔ اس عمارت کے سارے غسل خانوں اور باتھ رومز کے رخ اسی طرف تھے۔ اگر کوئی میرے علاوہ ہوتا تو وہاں کی بدبو اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی لیکن مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

جگہ جگہ سے گٹر ابل رہے تھے۔ اسی پانی سے گزر کر ہم ایک بالکونی کے نیچے آ گئے۔ یہاں ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔

''بس یہ ہے تمہاری جگہ۔'' کتے نے کہا۔ ''تم یہاں اطمینان سے سو سکتے ہو۔ اس گلی میں کوئی آتا ہی نہیں ہوگا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ دوست۔'' میں چبوترے پر بیٹھ گیا تھا۔ ''اور تم، تم کیا کرو گے۔ تم کہاں رات گزارو گے؟''

''میرا کیا ہے، میں بھی یہیں کہیں تمہارے پاس لیٹ جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ میں تو کتا ہوں اور مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کتا تو اب میں بھی ہو گیا ہوں۔''

اچھا چلو، لیٹ جاؤ۔''

میں چبوترے پر لیٹ گیا۔ آنکھیں نیند سے جھکتی جا رہی تھیں۔ میں جلد ہی سو گیا اور اس وقت آنکھ کھلی جب بارش ہو رہی تھی ..... لیکن نہیں بارش کہاں ہو رہی تھی۔ گلی میں ویسا ہی اندھیرا تھا۔ اوپر بالکونی سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ''کیوں منے، کر لیا پیشاب؟''

''جی امی۔'' بچے کی آواز آئی۔

''تو پھر آؤ۔ آ کر سو جاؤ۔''

تو یہ بارش نہیں، پیشاب کی چھینٹیں تھیں جو براہ راست مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے کتے کو لات مار کر جگایا جو میرے پاس ہی سو رہا تھا۔ ''چل اٹھ یہاں سے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ جگہ میرے لیے نہیں ہے۔ یہاں لوگ انسان پر گندگی پھینک دیتے ہیں۔''

اس نے بڑی سی انگڑائی لی اور کچھ بولے بغیر ایک طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس بار وہ مجھے ایک پارک میں لے آیا تھا۔ ''اب یہاں نخرا مت کرنا۔ سو جاؤ۔''

پارک میں اس وقت بالکل سناٹا ہو رہا تھا۔ میں ایک بنچ پر سو گیا۔ کتا قریب ہی لیٹ گیا تھا۔ پھر میں بے خبر سو گیا۔ میں کسی کی آوازوں سے بیدار ہوا تھا۔

یہ ایک مرد اور ایک عورت تھے جو جاگنگ کرنے پارک میں آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی لوگ تھے۔ وہ سب فیشن ایبل قسم کی وہ دوڑ، دوڑ رہے تھے جس کو یہ لوگ جاگنگ کہا کرتے ہیں۔

''دیکھو تو سہی۔ کتنا پیارا ہے۔'' عورت مرد سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں ہے تو اچھا۔ اعلیٰ نسل کا معلوم ہوتا ہے۔''

اس وقت میری گردن اکڑ گئی۔ یہ مرد مجھے اعلیٰ نسل کا قرار دے رہا تھا۔ انسان ہی انسان کو پہچانتا ہے۔

''سنو، کیوں نہ اسے گھر لے چلیں؟'' عورت نے کہا۔

''ارے وہ چھوٹا کمرا فالتو پڑا ہوا ہے۔ اس میں AC بھی ہے۔ گدے بھی لگے ہوئے ہیں، اسی میں رکھیں گے۔''

اب مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ میرے لیے ٹھنڈے کمرے کی بات ہو رہی تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار آرام اور سکون کے لمحات ملنے والے تھے۔

''دیکھو کہیں کاٹ نہ لے۔'' مرد نے کہا۔

اور اس وقت میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ دونوں اس کتے کی بات کر رہے تھے جو میرے قریب ہی ..... نیچے لیٹا ہوا تھا۔ میری طرف تو دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے ان کی بکواس سن کر غصہ آ گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

''دیکھو، میں ایک انسان ہوں اور یہ تو کتا ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے صرف ایک سائبان چاہیے۔ مجھے اے سی والے کمرے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں بھی رکھو، تم یقین کرو میں تمہارے لیے کتے سے بھی زیادہ وفادار ثابت ہوں گا۔ چاہو تو میرے گلے میں پٹا بھی ڈال سکتے ہو۔''

''پاگل معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔'' عورت نے تبصرہ کیا۔

''تم تو ایک عورت ہو، سنا ہے دنیا کی ہر عورت کے سینے میں ماں کا دل ہوتا ہے۔ تم مجھے اپنی اولاد سمجھ کر ساتھ لے چلو ماں۔ میں دو دنوں سے بھوکا ہوں۔ میرے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے ماں۔ مجھ پر رحم کرو ماں۔''

''چلو یہاں سے۔'' عورت نے مرد سے کہا۔ ''یہ کم بخت تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔''

''ماں۔ میری بات سنو ماں، میری بات سنو۔''

وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلے گئے اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے کیوں اب مجھے شدت سے رونا آ رہا تھا۔ آخر انسان ہی تو تھا۔ ایک ماں اپنی اولاد کو چھوڑ کر جا رہی تھی تو آنکھوں میں آنسو تو آنے ہی تھے۔

کتا میرے پاس کھڑا بف بف کرتا رہا۔ وہ میری حالت پر افسوس کر رہا تھا۔

''دوست۔'' میں نے کتے سے کہا۔ ''اب اس دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ زندہ رہ کر بھی کیا کروں گا اور پھر جس انداز سے میں زندگی گزار رہا ہوں، وہ تو موت سے بھی بدتر ہے۔''

''تو پھر کیا کرو گے؟'' کتے نے بہت بے رحمی سے پوچھا۔

''خودکشی کر لوں گا۔'' میں نے بتایا۔

''وہ مشکل کام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے میرے پاس تمہاری موت کے لیے ایک طریقہ ہے اگر کہو تو اسی کو ٹرائی کروں؟''

''ہاں بتاؤ۔''

''میں تمہیں کاٹ لیتا ہوں۔'' کتا دھیرے سے بولا۔ ''شاید تم نہیں جانتے کہ کتے کے کاٹنے سے بھی موت آجاتی ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں پہلے پاگل ہوتے ہیں، اگر وقت پر ٹیکے نہ لگیں تو مر جاتے ہیں۔''

اتنی جلدی

امجد شہر جا رہا تھا۔ اس کے دوست حامد نے اسے خط دے کر کہا اسے شہر سے پوسٹ کرنا ہے۔

ایک ہفتے بعد امجد واپس آیا۔ حامد نے اس سے خط کے متعلق پوچھا۔

امجد نے جیب سے خط نکال کر واپس کرتے ہوئے کہا۔

اگر اتنی ہی جلدی ہے۔ تو یہ لو خود پوسٹ کر آؤ۔

مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

''ٹھیک ہے دوست۔ جب مرنا ہی مقدر میں ہے تو تمہارے ذریعے کیوں نہ مروں۔'' میں نے کہا۔ ''کاٹ لو مجھے۔''

اور اس کتے نے بہت ہی بوجھل دل کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے میری دونوں ٹانگوں پر کاٹ لیا، بے انتہا تکلیف ہوئی تھی لیکن میں موت کے سفر پر جانے والا تھا اسی لیے یہ سوچ کر خوش بھی ہو رہا تھا کہ چلو اب یہ سب کچھ تھوڑی دیر کا رہ گیا ہے۔ پھر ہمیشہ کے لیے سکون۔ ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں نہ بھوک لگے گی نہ سردی اور گرمی کا احساس ہوگا۔ بس نیند ہی نیند ہوگی جس کے لیے ترس کر رہ گیا ہوں۔

کتا میری طرف معذرت بھری نگاہوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر آ کر لگا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا پتھر اور وہ چیختا چلاتا ہوا ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

کچھ فاصلے پر ایک خوب صورت جوان لڑکی کھڑی ہوئی پتھر چلا رہی تھی۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

''ارے تمہیں تو اس کم بخت نے بری طرح کاٹ لیا ہے۔''

میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا۔ بالکل پہلا کہ کوئی لڑکی میرے قریب آئی تھی۔ اس نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ میں کیسا لگ رہا ہوں۔ میرے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ میری ڈاڑھی بے ترتیب ہو رہی ہے اور میرے کپڑے چیکٹ ہو رہے ہیں۔ اس نے ان باتوں پر دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے انسان سمجھ کر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی

بار کسی نے مجھے انسان سمجھا تھا۔

میں اپنی تکلیف بھول کر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی محبت تھی اس کی آنکھوں میں۔ ''چلو۔ میں تمہیں اسپتال پہنچا دوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں رہنے دیں۔'' میں دھیرے سے بولا۔ ''میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

کیا پاگل ہو گئے ہو، کتے نے کاٹا ہے۔ تم اس طرح ٹھیک نہیں ہو گے۔ تمہیں انجکشن لگیں گے۔'' وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''اگر تم نے اس کا علاج نہیں کیا تو مر بھی سکتے ہو۔''

''اور میں مرنا ہی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ سمجھ گئی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''شاید زندگی سے مایوس ہو گئے ہو۔''

''مایوس تو ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں زندہ رہنا ہی نہیں چاہتا۔''

''بے وقوف ہو تم۔ زندگی بہت خوب صورت ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم میرے ساتھ ہاسپٹل چلو، تمہارا علاج ہو جائے گا۔''

اور میں نے اسی وقت زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لڑکی کی وجہ سے۔ وہ ناہنجار کتا مجھے کاٹ گیا تھا اس لیے مجھے اب اپنا علاج بھی کروانا تھا۔

اگر وہ لڑکی نہیں ملتی تو شاید میں کبھی علاج نہیں کرواتا۔ لیکن اب مجھے زندہ رہنا تھا اسی لیے میں نے اس لڑکی سے کہا۔ ''سنو۔ تم مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ بہت ہمدرد ہو تم۔ میں صرف تمہاری خاطر جینے کا ارادہ کر چکا ہوں لیکن میری ایک شرط ہو گی؟''

''اوہو۔ اب اس وقت کوئی شرط بھی لگاؤ گے۔''

''ہاں، صرف ایک شرط اور وہ یہ ہے کہ تم مجھ سے ملتی رہو گی۔ میں تمہیں بار بار دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''سمجھ گئی۔'' وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ بھی بہت خوب صورت تھی۔ ''شاید۔ میں تمہیں اچھی لگ رہی ہوں، کیوں یہی بات ہے نا؟''

''ہاں۔ یہی بات ہے۔'' میں نے اعتراف کر لیا۔

''تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔''

''چلو۔ تو پھر میں تم سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے ملتی رہوں گی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''اب باتیں مت کرو۔ میرے ساتھ اسپتال چلو۔''

''ایک منٹ۔ میں ابھی آیا۔''

میں دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے پاس آ گیا۔ یہاں میں نے اس کتے کو چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں موجود تھا اور بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آخر تم نے ایک انسان سے دوستی کر ہی لی۔''

''ہاں۔ اے دو کوڑی کے جانور۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم تو صرف ایک کتے ہو۔ یہ لڑکی میری زندگی میں امید بن کر آئی ہے۔ یہ اپنے ساتھ خوشیاں لائی ہے، جاؤ۔ تم اپنے کچرا گھر میں واپس جاؤ۔ میرا مقام کچھ اور ہے کیونکہ میں انسان ہوں۔ اشرف مخلوق۔ سمجھ گئے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں دوڑتا ہوا لڑکی کے پاس واپس آ گیا۔ وہ میرا انتظار ہی کر رہی تھی۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم؟''

میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میں کتے کو اس کی حیثیت یاد دلانے گیا تھا ورنہ اسے یہ اندیشہ ہو جاتا کہ شاید مجھ پر کتے کے کاٹنے کا اثر ہو گیا ہے۔

اس لڑکی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرے خدا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ بالکل پہلی بار ہو رہا تھا۔ لڑکی کا ملنا ہی قیامت تھا اور اب اس کا ہاتھ تھام لینا۔ ایسی بے خودی اور سرشاری کا احساس پہلی بار ہوا تھا۔

پارک کے گیٹ سے باہر اس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔

''چلو بیٹھ جاؤ۔'' وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''کیا میں..... میں بیٹھوں؟''

''ہاں ہاں۔ میں تم ہی سے کہہ رہی ہوں۔''

''لیکن میں کبھی گاڑی میں نہیں بیٹھا۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے بتا دیا۔

''اوہ۔'' اس نے بہت افسوس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''یقین نہیں آتا کہ اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کبھی گاڑی میں نہیں بیٹھے۔ خیر اب تم روزانہ بیٹھا کرو گے۔ چلو جلدی کرو ورنہ کتے کا زہر پھیلنے لگے گا۔''

میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب تو مجھے خود اسپتال پہنچنے کی جلدی ہو رہی تھی کیونکہ زندگی سے محبت ہونے لگی تھی۔ اس زندگی سے جس کو کچھ دیر پہلے میں ایک ناہنجار قسم کے کتے کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔

اسپتال کی طرف جاتے ہوئے اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا نام بتاؤں۔ نام بتانا بھی ضروری تھا اسی لیے میں نے فوراً ہی ایک نام گڑھ لیا۔ ''جی

میرا نام حمید ہے۔'' حمید دراصل یتیم خانے کے منشی کا نام تھا۔ وہ نام مجھے یاد رہ گیا تھا۔

''اور میرا نام روزی ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔

اسپتال پہنچ کر لڑکی نے مجھے انجکشن لگوائے۔ اس نے سارے اخراجات خود ادا کیے تھے جبکہ میں اس کی ہر بات کو ٹالتا چلا گیا تھا۔ واقعی بہت جادو تھا اس لڑکی میں۔

اسپتال سے فارغ ہو کر لڑکی مجھے ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک دکان میں لے آئی۔ یہاں سلے سلائے کپڑے ملتے تھے۔ اس نے میرے ناپ کے چار جوڑے خریدے اور مجھے پھر گاڑی میں بٹھا لیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے ایک بڑے سے سیلون کے سامنے گاڑی روک کر میرے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھ دیا۔ ''اب جاؤ۔ سامنے جا کر اپنے بال بنواؤ اور پوری ڈاڑھی صاف کرواؤ۔ میں تمہیں انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ایک بات تو بتائیں، آپ مجھ پر اتنی مہربانی کیوں کر رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اب جاؤ۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

اگر اس وقت وہ کتا سامنے ہوتا تو میں اس سے پوچھتا کہ بیٹا اب بتا۔ میں انسان ہوں یا نہیں اور تو کتا ہے اور کتا ہی رہے گا۔''

آدھ گھنٹے کے بعد میں سیلون سے باہر آیا تو بالکل بدل گیا تھا۔ سلیقے کے بال اور سلیقے سے بنی ہوئی شیو۔

''واہ!''

لڑکی نے تعریفی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ بات ہوئی نا۔ اب تم انسان کے بچے معلوم ہو رہے ہو۔ بیٹھو گاڑی میں۔'' میں پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لڑکی مجھے ایک خوب صورت سے مکان میں لے آئی تھی۔ کیا خوب صورت مکان تھا۔ میرے تو خوابوں میں بھی کچرا گھر اور گندے نالے ہی آتے تھے۔ آج پہلی بار قسمت مجھے ایک ایسے مکان میں لے آئی تھی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میرا وقت بدل چکا تھا۔

وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ باتھ روم ہے۔ جاؤ اچھی طرح نہا کر یہ کپڑے پہن کر باہر آؤ۔''

میں اس کے باتھ روم کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ کیسا زبردست تھا۔ وہاں ایسی ایسی چیزیں تھیں، میں جن کے نام بھی نہیں جانتا تھا۔ استعمال سے بھی واقف نہیں تھا۔ یہ سب انسانوں کے لیے تھیں اور میں بے چارہ انسان کہاں رہا تھا۔

میں خوب صابن لگا لگا کر دیر تک نہاتا رہا۔ زندگی بھر کی گندگی میرے بدن سے اتر رہی تھی۔ پانی تک گدلا ہو کر بہہ رہا تھا۔

میں نے تقریباً ایک گھنٹا لگایا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب میں نہا دھو کر نئے کپڑے بدل کر باہر نکلا تو خود وہ لڑکی بھی مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ''واہ۔ یہ بات ہوئی نا۔ اب تم ہزاروں نوجوانوں سے بہتر ہو۔''

اس کے ملازم نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔ یہ سب میرے ساتھ پہلی بار ہو رہا تھا۔ کھانے میں نہ جانے کیا کیا چیزیں تھیں۔ شاید اس شادی ہال میں بھی نہیں ہوتی ہوں گی جس کے باہر ایک کچرا گھر تھا اور جہاں مجھے ایک کتا مل گیا تھا۔

''ہونہہ!'' میں نے نفرت اور بے زاری سے ہونٹ سکیڑے۔ ''تیری اوقات ہی کیا ہے۔ آدیکھ، انسان کس طرح رہتے ہیں۔''

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR of U.A.E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

''کیا بات ہے۔تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟'' لڑکی نے حیرانی سے پوچھا۔

''کسی سے نہیں۔'' میں شرمندہ ہوگیا تھا۔''بس ایک خیال آ گیا تھا کہ میں نے بھی کیسی زندگی گزاری ہے۔''

''اب اس قسم کے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔''اب سب ٹھیک ہے۔تم میرے پاس آ چکے ہو۔ پچھلی زندگی بھول جاؤ۔ چلو کھانا شروع کرو۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈیڈی سے ملواؤں گی۔''

اتنا زبردست کھانا کھانے کے بعد مجھے نیند سی آنے لگی تھی۔ انسان کا پیٹ بھر جائے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ بھوکا ہو تو نیند غائب ہو جاتی ہے۔

ویسے ایک بات ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے اس کتے کا بھی خیال آ گیا تھا۔ نہ جانے وہ اس وقت کہاں جھک مار رہا ہوگا۔ خیر اب میرا اس سے کیا تعلق تھا۔ میں تو اب ایک مکمل انسان تھا۔

اس وقت وہ لڑکی پہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی اور مجھے یہ پتا چلا کہ جب پیٹ بھرا ہو تو لڑکیاں بہت خوب صورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔

''چلو۔ اب تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔'' لڑکی نے کہا۔''میں ڈیڈی کو لے کر آتی ہوں۔''

میں اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں کسی شاندار آدمی کی طرح جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد کسی شخص کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکی بھی کچھ بول رہی تھی۔ لیکن دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا تو یہ حال تھا کہ جب پوری طرح اردو سمجھ میں نہیں آتی تھی تو انگریزی کہاں سے آتی۔''

پھر وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک لحیم شحیم خوش پوش انسان اور وہی لڑکی۔ اس شخص نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔''یہ روزی تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائی ہے؟''

''ڈیڈ۔ یہ بے چارہ بھی انسان ہے۔''

''انسان۔تم ہر دوسرے تیسرے دن گندی نالی کے کسی کیڑے کو اٹھا کر لے آتی ہو اور کہتی ہو کہ یہ انسان ہے۔ ختم کرو اپنا یہ احمقانہ تجربہ۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھا۔''یہ پاگل لڑکی مختلف طبقوں کے انسانوں کے رویوں پر ریسرچ کرتی پھر رہی ہے۔ اس لیے تمہیں اٹھا کر لائی ہے۔ اب تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''ڈیڈ۔ کوئی تجربہ تو مکمل ہونے دیں۔''

''نہیں، اب کوئی بے وقوفی نہیں۔ بھگاؤ اس کو۔''

''اچھا اچھا بھگاتی ہوں۔'' لڑکی نے پچاس کا ایک نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔''یہ لو پچاس روپے اور جاؤ یہاں سے۔''

''شکریہ میم صاحب۔'' میں تلخ لہجے میں بولا۔''میں گندی نالی کا کیڑا ہوں اور کیڑوں کو نوٹوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے اپنے پاس ہی رکھیں اور ہاں، میں نے آپ کے دیے ہوئے کپڑے پہن رکھے ہیں، انہیں کیسے واپس کروں؟''

''انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔'' لڑکی نے کہا۔

میں بہت بوجھل دل سے، نڈھال قدموں اس کمرے سے، اس لان سے پھر اس گیٹ سے باہر آ گیا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں چل رہا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ میرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میرے اردگرد بے شمار لوگ چل رہے تھے۔ لیکن وہ انسان تھے جبکہ میں انسان نہیں تھا۔ میں تو کچھ اور تھا۔ میں نہ جانے کب تک چلتا ہی رہا، چلتا ہی رہا اور پھر یاد آ گیا کہ میں اسی شادی ہال والے کچرا گھر پر پہنچ چکا ہوں۔ وہ کتا وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پایا تھا۔

''دوست یہ میں ہوں۔'' میں نے آواز لگائی۔ ''تمہارے پاس واپس آ گیا ہوں۔''

''ارے۔تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔'' اس نے پوچھا۔''تم تو بالکل انسان معلوم ہو رہے ہو۔''

''نہیں دوست؟ میں انسان نہیں ہوں۔ ایک تجربے کی چیز ہوں۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟''

میں نے اسے ساری کہانی سنا دی کہ وہ لڑکی مجھے اپنے ساتھ کیوں لے گئی تھی۔

کتے نے افسوس سے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔''اب بتاؤ، اب کیا ارادہ ہے؟''

''مرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔''تم مجھے پھر سے کاٹو اور اس بار ایک دو جگہ نہیں، کاٹتے چلے جاؤ۔ کاٹتے چلے جاؤ۔''

اور وہ مجھے کاٹنے لگا۔ یہاں وہاں، ہاتھوں میں، پیروں میں۔ ہر جگہ کاٹتا ہی رہا۔ بے پناہ تکلیف، پھر تکلیف کا احساس بھی ختم۔ سب کچھ ختم، اندھیرا، سکون۔

دوسرے دن اخبار میں ایک کچرا گھر کے پاس ایک آدمی اور ایک کتے کی لاشیں ملنے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکا تھا۔

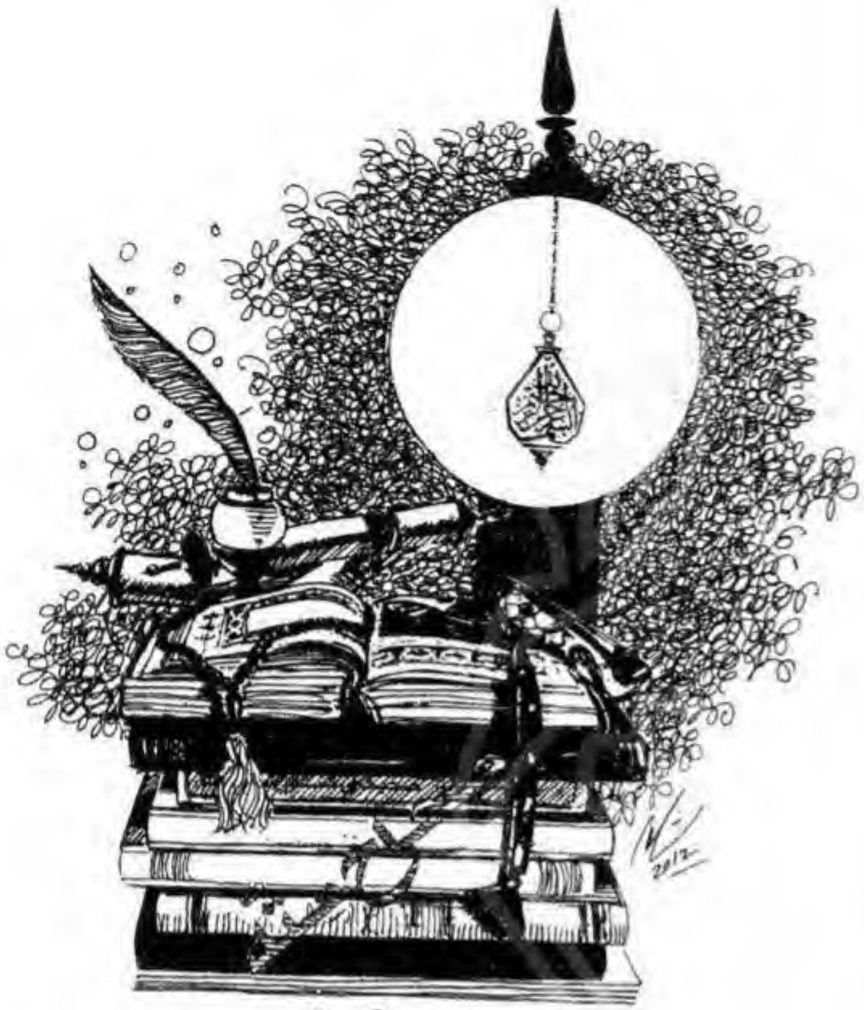

نوشۂ گنج بخش

ضیا تسلیم بلگرامی

ازل سے دنیا کی تیرگی میں نورِ الٰہی سے اجالا پھیلتا آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس اجالے کا سبب ہمیشہ اپنے برگزیدہ بندوں کو بنایا تاکہ بنی نوع انسان کی راہ نمائی کا سلسلہ تا قیامت چلتا رہے۔ انہی بزرگانِ دین میں حاجی محمد کا شمار بھی ہوتا ہے، جن کی ذات سے کتنی ہی کرامات وابستہ ہیں۔

پیدائش سے قبل ہی دھوم مچانے والے ایک ولی کا زندگی نامہ

موضع گھوگا نوالی کی بی بی جیونی نہ صرف یہ کہ بذات خود نیک اور متقی پرہیز گار تھیں بلکہ ان کے شوہر علاؤالدین حسین غازی کی عظمت اور بزرگی مشہور اور مستند تھی۔ گھوگا نوالی، پھالیہ اور پورا گجرات ان سے عقیدت و احترام سے پیش آتا تھا۔ یہ لوگوں میں حاجی غازی صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ حج کر چکے تھے اور ساتویں کی تیاری کر رہے تھے لیکن بی بی جیونی کی ناسازی طبع ان کے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ عزیز رشتے دار اور گاؤں کے دوسرے لوگ نہایت احترام اور عقیدت مندی سے حاضری دیتے اور دریافت کرتے۔

''حضرت! حج کو کب تشریف لے جا رہے ہیں؟''

حاجی غازی صاحب جواب دیتے۔''معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میں جب بھی جانے کا ارادہ کرتا ہوں کوئی میرے ارادے کو توڑ کر بے

بس اور مجبور کر دیتا ہے۔"

خاندان کے ایک بزرگ نے کہا۔ "علاؤالدین! تو کن وسوسوں میں گھرا ہوا ہے؟ حج پر جانا چاہتا ہے تو چلا جا، اس میں فکر، تردد یا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

حاجی غازی صاحب نے جواب دیا۔ "یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ اس میں فکر و تردد یا پریشان ہونے والی کیا بات ہے، لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ کوئی غیر مرئی قوت میرے پاؤں پکڑ رہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس وقت میں سمندر کے ساحل پر کسی بحری جہاز کا انتظار کر رہا ہوتا۔"

اسی دوران، ایک رات خواب میں آپ نے دیکھا، کوئی کہہ رہا ہے۔ "علاؤالدین! تو حج پر جانا چاہتا ہے تو شوق سے جا، لیکن بی بی جیونی کو بتا تا جا کہ اس کے شکم میں جو یکتائے زمانہ فرزند پرورش پا رہا ہے، اس کا بطورِ خاص خیال رکھے۔ کیونکہ تیرا یہ فرزند مقتدائے زمانہ اور فردِ یگانہ ہے۔"

حاجی غازی صاحب یہ خواب دیکھ کر بیدار ہوئے تو بڑی دیر تک اس کی تعبیر کے بارے میں سوچتے رہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا یہ خواب غیر معمولی ہے اور خواب میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ حرف بحرف درست ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی، بی بی جیونی کے پاس تشریف لے گئے۔ بیوی نے انہیں فکر مند جو دیکھا تو دریافت کیا۔

"کیوں جناب، خیریت تو ہے، آپ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں؟" شوہر نے جواب دیا۔ "ہاں میں کل تک واقعی پریشان تھا لیکن آج اس وقت میں بے حد خوش اور ہشاش ہوں۔"

بیوی نے پوچھا۔ "یعنی یہ کیوں؟ خوشی کا سبب کیا غیب سے کچھ ہاتھ آ گیا؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "تم یہی سمجھ لو۔" پھر اپنا خواب سنا کر دریافت کیا۔ "کیا یہ سچ ہے تم ان دنوں امید سے ہو؟"

بیوی نے کہا۔ "کمال ہے کہ تمہیں اس کا اب تک علم نہیں۔"

شوہر نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے اس کا علم تھا لیکن محض شبہے کی وجہ سے خاموش تھا۔"

بیوی نے کہا۔ "تمہارے اس سوال کے جواب میں، میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتی ہوں کہ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تم حج پر جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ، کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو خدا جسد خاکی میں روح پھونکتا ہے وہی اس کا محافظ اور پروان چڑھانے والا بھی ہے۔"

حاجی غازی صاحب نے جواب دیا۔ "نیک بخت! جو میں کہہ رہا ہوں۔ اس کا وہ مطلب نہیں، جو تو سمجھ رہی ہے۔ بلکہ میں نے اس بچے کے سلسلے میں ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ حاجی غازی! بی بی جیونی کے شکم میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے۔ وہ مستقبل کا مقتدائے زمانہ اور فردِ یگانہ ہے، اس لیے اس کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔"

بی بی جیونی اس بشارت سے بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ذات پر ناز محسوس کیا لیکن پھر فوراً ہی توبہ و استغفار کر کے خاموش ہو رہیں۔ حاجی غازی فرماتے رہے۔ "بی بی! میں حج کی نیت کر چکا ہوں۔ اس لیے میں ضرور جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے تمہیں یہ ہدایت کروں گا کہ اس بچے کا خاص خیال رکھنا۔ اگر میں جلدی واپس آ سکا تو میں خود بھی اس کا خاص خیال رکھوں گا۔ لیکن اگر میں جلدی نہ آ سکا تو بچے کی نگہداشت اور حفاظت تمہارے ذمے ہوگی۔"

اس کے بعد حاجی غازی اپنے ساتویں حج پر چلے گئے اور بی بی جیونی آنے والے عظیم انسان کا انتظار کرنے لگیں۔

ساتویں ماہ بی بی جیونی کو ایسا لگنے لگا گویا ان کا پورا وجود ہلکا اور معطر ہے۔ طبیعت ایک ناقابل بیان کیف و مسرت سے سرشار رہنے لگی۔

اس عالم میں بی بی جیونی کے چند عزیزوں نے انہیں مطلع کیا کہ مشہور بزرگ اور صاحب کرامت صوفی شاہ سلیمان اپنے گاؤں میں تشریف لا رہے ہیں۔

شاہ سلیمان کی ذات ایسی نہیں تھی کہ ان کا تعارف کرایا جاتا۔ وہ خود بھی اپنے دور کے یگانہ روزگار تھے۔ بی بی جیونی نے اپنے ایک عزیز سے کہا۔ "شاہ سلیمان قیام کہاں کریں گے؟"

عزیز نے جواب دیا۔ "ان کا کیا ہے، وہ کہیں بھی قیام فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ اس گاؤں کا ہر آدمی آپ کا معتقد اور عاشق ہے۔ وہ جہاں بھی ٹھہرنا چاہیں گے، ٹھہر جائیں گے۔"

بی بی جیونی نے بڑی حسرت سے کہا۔ "افسوس کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ اگر وہ حج پر نہ گئے ہوتے تو شاہ سلیمان کے استقبال اور مہمانداری کا فرض وہ انجام دیتے۔"

عزیز نے جواب دیا۔ "بی بی جیونی! ان حالات میں تو آپ کو سوچنا بھی نہیں چاہیے اور شاید شاہ سلیمان بھی آپ کے پاس ٹھہرنا پسند نہ فرمائیں۔"

بی بی جیونی نے کہا۔ "نہیں، میں یہ نہیں چاہتی کہ شاہ صاحب میرے غریب خانے میں قیام فرمائیں بلکہ میں یہ چاہتی ہوں کہ ان کے روئے جمال دیکھ کر اپنے دل و دماغ کو تازگی اور فرحت بخشوں۔"

عزیز نے عرض کیا۔ "بی بی! اگر یہ بات ہے تو میں میاں جی کو کسی بھی بہانے اس گھر میں ضرور لاؤں گا۔ آپ ہرگز فکر مند نہ ہوں، یہ میرا ذمہ۔"

عزیز چلا گیا اور شاہ سلیمان کا خوش کن خیال بی بی جیونی کو آسودگی اور فرحت نہیں بخش سکا کیونکہ انہیں اپنے شوہر کی عدم موجودگی کا غم کھائے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس عزیز نے بی بی جیونی کو بڑی بے چینی سے مطلع کیا۔ "بی بی! شاہ سلیمان آپ ہی کے گھر کی طرف چلے آ رہے ہیں۔"

بی بی جیونی کو اپنے عزیز کی بات پر یقین نہیں آیا، بولیں۔ "یہ تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ شاہ سلیمان میرے ہی گھر کی طرف چلے آ رہے ہیں، یہ بات تو نے کس سے سنی؟"

عزیز نے جواب دیا۔ "بی بی! میں نے خدا کو دیکھا تو نہیں، قیاس اور عقل سے پہچانا ہے۔ اسی طرح میں نے شاہ سلیمان کے بارے میں نہ تو کسی سے کچھ سنا ہے اور نہ ہی خود شاہ جی نے کچھ بتایا لیکن آثار اور قرائن یہی بتا رہے ہیں کہ شاہ سلیمان آپ ہی کے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ کیوں آ رہے ہیں، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔"

بی بی جیونی نے کہا۔ "اگر یہ بات درست ہے تو مجھے ان کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو گھر کی صفائی ستھرائی پر لگا دیا۔

ابھی صفائی ستھرائی کا کام جاری ہی تھا کہ بی بی جیونی کو یہ خبر سنائی گئی کہ شاہ سلیمان، حاجی غازی کے گھر کو شرف میزبانی بخشنا چاہتے تھے بی بی جیونی نے فرطِ خوشی میں شاہ جی کو ایک صاف ستھرے کمرے میں ٹھہرا دیا اور ان کے مریدوں کے لیے اپنے چھوٹے سے باغ میں انتظام کر دیا۔ بی بی جیونی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر شاہ سلیمان اس پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟

شاہ سلیمان نے قیام فرما ہوتے ہی پوچھا۔ "بی بی جیونی! تیرا شوہر کہاں چلا گیا؟ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔"

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ "حضرت اب میں ان کے بارے میں کیا بتاؤں؟ وہ اپنے ساتویں حج پر تشریف لے گئے ہیں۔ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتے، اس گھر کی رہنمائی اور رہبری میرے ذمے ہے۔"

شاہ سلیمان نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "افسوس کہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا کہ اس گھر میں حاجی غازی موجود ہی نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، تم تو موجود ہو اور پھر میں جس مقصد سے آیا ہوں، اسے تم پر ظاہر کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ میں اس گاؤں میں خود نہیں آیا۔ بلایا گیا تو آ گیا ورنہ یہ چلنا پھرنا میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔"

بی بی جیونی نے عرض کیا۔ "خیر، اب یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، آپ قیام فرما رہیں گے تو دوسری باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

شاہ سلیمان اپنے مریدوں کے ساتھ حاجی غازی کے گھر میں ٹھہر گئے۔

☆☆☆

شاہ سلیمان نے اس رات کسی بڑی بی کے ذریعے یہ کہلوا دیا کہ چونکہ وہ بات ہی کچھ ایسی ہے جو بی بی جیونی سے نہیں کہی جا سکتی، اس لیے میں اس معمر عورت کے ذریعے بات کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

بی بی جیونی کا دل دھک دھک کرنے لگا، بولیں۔ "حضرت جو کچھ کہنا سننا ہے فوراً ہی کہہ سن ڈالیں۔ مجھے معلوم نہیں کیوں ہول سا اٹھ رہا ہے۔"

شاہ سلیمان نے کہلوایا۔ "میں اپنے گاؤں بھلوال میں بڑے چین سے رہ رہا تھا کہ مجھے حکم دیا گیا کہ سلیمان، موضع گھوگا نوالی پہنچو۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے سے دریافت کیا۔ "گھوگا نوالی کس کے پاس اور کیوں؟"

مجھے حکم دیا گیا۔ "حاجی غازی کے گھر۔ حاجی غازی حج پر گیا ہوا ہے، تو اس کی بیوی کے پاس جا اور اس نیک بخت سے کہہ دے کہ اس کے شکم میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے، اس کا بے حد خیال رکھنا ہے۔"

بی بی جیونی کی طبیعت قابو میں آئی اور ذرا اطمینان کی سانس لی، بولیں۔ "شاہ سلیمان سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سلسلے میں تشریف نہ بھی لاتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیونکہ میرے شوہر پہلے ہی یہ ہدایتیں دے چکے ہیں۔"

شاہ سلیمان نے کہلوایا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن میں بذات خود اس حکم کی تعمیل پر مجبور تھا جو مجھے دیا گیا تھا کہ بی بی جیونی کو بشارت دے دوں کہ عنقریب وہ جس بچے کی ماں بننے والی ہے، وہ ایک عظیم اور غیر معمولی انسان ہوگا۔ اس لیے بی بی جیونی کو اس کا خاص خیال رکھنا ہے۔"

بی بی جیونی نے جواب میں کہلوادیا۔ ''میں شاہ صاحب کی زحمت فرمائی سے خوش بھی ہوں اور شرمندہ بھی۔ خوش اس لیے کہ شاہ صاحب نے میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا اور شرمندہ اس لیے کہ شاہ صاحب کو میرے غریب خانے تک زحمت فرمانا پڑی۔''

بی بی جیونی کے اس جواب نے شاہ صاحب کو بہت لطف اندوز کیا۔ آہستہ سے فرمایا۔ ''کیا سلجھی ہوئی عقل ملی ہے، کیا رساذہن پایا ہے۔ واللہ!'' بی بی جیونی نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے دن شاہ صاحب نے خود ہی ارشاد فرمایا کہ اب میں واپس چلا جاؤں گا اور اس وقت دوبارہ آؤں گا ں جب میرا مخاطب بھی اس دنیا میں آچکا ہوگا۔

بی بی جیونی کی طرف سے بڑی بی نے دریافت کیا۔ ''حضرت! بی بی جیونی دریافت فرمارہی ہیں کہ آنے والے شخص کے بارے میں آپ مجھے اور کیا کچھ بتا سکتے ہیں؟ کیونکہ میں نے اس کے بارے میں ابھی تک جو کچھ سنا ہے اس سے میں اپنے اندر ایک قسم کا فخر اور بڑا پن محسوس کررہی ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قسم کی سرشاری میری اپنی ذات کے لیے ہو اور خدا کو میرے یہ احساسات اور جذبات برے لگے ہوں؟''

شاہ سلیمان نے جواب دیا۔ ''بی بی جیونی سے کہہ دو کہ وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کیونکہ یہ بچہ ان کے لیے انعام الٰہی ہوگا اور خدا کی نعمتوں کا شکر گزار ہونا اور اس پر فخر کرنا دینداری میں داخل ہے۔''

بی بی جیونی نے شاہ صاحب کے جواب پر خدا کا شکر ادا کیا۔

شاہ سلیمان چلے گئے اور بی بی جیونی عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئیں۔ ان دنوں بی بی جیونی کے منہ سے ہر پل خدا کی حمد و ثنا ہو رہی تھی اور وہ سرتاپا عجز و نیاز ہوگئی تھیں۔

دو ماہ اور گزر گئے اور جس کا انتظار تھا، وہ پیدا ہوگیا۔ بی بی جیونی نے اسے بھی گلے سے لگالیا اور خوب خوب پیار کیا۔ وہ نومولود کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتیں اور ان میں بزرگی اور عظمت کے آثار تلاش کیا کرتیں۔ بچہ اپنی ماں کو لاتعلق نظروں سے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا۔

کچھ دنوں بعد شاہ سلیمان دوبارہ تشریف لائے اور بی بی جیونی سے نومولود کو مانگا۔ ماں نے بچے کو ان کی گود میں ڈلوایا۔ شاہ صاحب نے بچے کو گود میں لے کر سینے سے لگالیا، بولے! ''میں اپنا خزینۂ بطن نومولود میں منتقل کررہا ہوں۔''

بی بی جیونی نے کہلوایا۔ ''حضرت! بچے کا نام بھی تو تجویز فرمایئے۔'' شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''میں اس کا نام محمد رکھنا چاہتا ہوں لیکن تنہا محمد، نام رکھنے سے اسم محمد ﷺ کی بے حرمتی ہوگی۔ اس لیے محمد سے پہلے، حاجی، لگائے دیتا ہوں۔ گویا اس بچے کا نام حاجی محمد ہوگا۔ خدا اس نام کو بابرکت کرے۔''

بی بی جیونی نے زیرلب نام دہرایا۔ ''حاجی محمد۔ خوب گویا میرا بیٹا پیدائشی حاجی ہے۔''

شاہ صاحب نے اپنے خرقے کا بقدر رومالی ایک ٹکڑا پھاڑ کر الگ کرلیا اور پھر اس کو درمیان سے گریبان کی طرح چاک کیا اور اسے نومولود کے گلے میں ڈال کر فرمایا۔ ''یہ میرا خرقہ ہے جو امانتاً میرے پاس محفوظ تھا اب میں اسے اس کے سپرد کرکے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوتا ہوں۔''

گھر والوں نے اظہار خوشی میں بچے کو باری باری گود میں لیا اور بوسے دینے لگے۔ سب سے آخر میں بی بی جیونی نے اپنی آغوش میں لے لیا اور جی بھر کے پیار کیا۔

باہر شاہ سلیمان واپسی کی اجازت مانگ رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا۔

''میں اپنا خرقہ نومولود کو دے چکا اس لیے یہاں مزید رکنا فضول ہے، اب مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔''

بی بی جیونی نے شاہ صاحب کے جواب پر خدا کا شکر ادا کیا۔

اب تک جو کچھ ہوا تھا یا ہو رہا تھا، اس سے پورا گاؤں واقف تھا اور گھوگا نوالی کا بچہ بچہ اس نومولود کا والہ و شیدا تھا۔ صبح سے شام تک گاؤں کے لوگ آتے جاتے رہتے اور اس بچے کا دیدار کرتے رہتے۔ ان میں اکثر بچے کو گود میں لینے کی بھی کوشش کرتے لیکن بی بی جیونی بچے کو کسی کی گود میں نہ جانے دیتیں۔

ایک دن بی بی جیونی گھر کے کام دھندوں میں اس بری طرح پھنسیں کہ بڑی دیر تک بچے کو گود میں نہ لے سکیں۔ اس دوران پڑوس کی ایک عورت گھر میں داخل ہوئی اور بی بی جیونی سے کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگی۔ پوچھا۔ ''بی بی جیونی! اب آپ کا بیٹا کتنے ماہ کا ہوگیا؟''

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ''بہن پورے نو ماہ کا اور یہ نو ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے کچھ پتا ہی نہ چلا۔''

پڑوسن نے کہا۔ ''اور بچے کا باپ اب تک واپس نہیں آیا۔ آخر یہ کون سا حج کرنے گیا ہے؟''

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ''بہن! بچے کے باپ کو کچھ نہ کہو، کیونکہ وہ میرا شوہر بھی ہے اور تم جانو حج پر جانا اور ساتھ خیریت سے واپس

آجانا اتنا آسان بھی نہیں جتنا ہم لوگ غلطی اور نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں۔''

پڑوسن نے عرض کیا۔ ''پھر بھی بہن جیونی بی بی انہیں حج پر گئے بارہ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا۔ اب تو انہیں ہر حال میں واپس آجانا چاہیے۔''

بی بی جیونی نے پھر اپنے شوہر کی وکالت کی، فرمایا۔ ''ہوسکتا ہے حج کے بعد وہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو نکل گئے ہوں۔ ان کی عدم موجودگی میں، میں ہمیشہ یہی دعا مانگتی ہوں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، خدا کے حفظ و امان میں ہوں۔ میں ان پر اتنا ہی اعتبار کرتی ہوں، جتنا کوئی بیوی اپنے اعلیٰ درجے کے دیندار اور متقی پرہیزگار شوہر پر کرسکتی ہے۔''

پڑوسن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بچہ سو رہا ہے؟''

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ''شاید اگر وہ جاگ بھی رہا ہوگا تو وہ رو رو کر مجھے پریشان نہیں کرتا، اس لیے اس کا سونا جاگنا میرے لیے یکساں ہے۔''

پڑوسن اس مقدس بچے کو گود میں لے کر کھلانا اور برکت حاصل کرنا چاہتی تھی، بولی۔ ''کیا میں اس بچے کو کچھ دیر کے لیے اپنے گھر لے جاؤں؟''

بی بی جیونی نے فوراً انکار کردیا، بولیں۔ ''بہن! میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ کیونکہ مجھے شاہ سلیمان نے منع کردیا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ بی بی جیونی، اس بچے کو ہرگس و ناکس کی گود میں ہرگز نہ جانے دینا، کیونکہ اس کا اس گود میں جانا بہتر ہوگا جو ہر طرح پاک صاف اور طہارت پر پوری اترتی ہو۔''

پڑوسن چپ ہوگئی اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

کافی دیر بعد، جب بی بی جیونی گھر کے کاموں میں اتنی منہمک ہوگئیں کہ انہیں کسی اور بات کا ہوش ہی نہ رہا تو عورت نے ان سے کہا۔ ''بی بی جیونی! اگر تم اجازت دو۔ تو میں بچے کو ایک نظر دیکھ لوں کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟''

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ''کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بہن اسے چھیڑنا مت۔''

پڑوسن نے کہا۔ ''بی بی تم خاطر جمع رکھو، میں اسے ایک نظر دیکھ کر ابھی واپس آتی ہوں۔''

بی بی جیونی پڑوسن کو اجازت دے کر کام میں مشغول ہوگئیں اور پڑوسن بچے کے پاس چلی گئی۔ حاجی محمد جھولے میں سوئے ہوئے تھے اور چونکہ بڑی دیر سے کسی نے جھولے کو حرکت نہیں دی تھی، اس لیے وہ ساکت تھا۔ پڑوسن نے جھولے کے پاس پہنچ کر کچھ وقت تو اس کش مکش میں گزار دیا کہ وہ بچے کے چہرے پر سے چادر ہٹائے یا نہ ہٹائے۔ پھر وفور شوق میں بے قابو ہوگئی اور بے اختیار چادر ہٹا کر بچے کو گود میں اٹھالینا چاہا۔ ابھی اس کے دونوں ہاتھ بچے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک کالا سانپ پھن اٹھا کر عورت پر حملہ آور ہوگیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری اور بے اختیار پیچھے ہٹی، وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور پھسل کر ڈھیر ہوگئی۔

بی بی جیونی پڑوسن کی چیخ اور گرنے کے دھماکے پر بھاگ کر جھولے کے پاس پہنچیں تو بچے کو چھت کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ بی بی جیونی نے پڑوسن کو اٹھایا اور پوچھا۔ ''بہن! یہ تم چیخی کیوں تھیں اور گر کس طرح گئیں؟ خیریت تو ہے؟''

پڑوسن کی سانپ کے ڈر سے گھگی بندھ گئی تھی، کپکپاتی آواز میں بہ مشکل بولی۔ ''سانپ کالا افعی، بالکل سیاہ رات جیسا کالا سانپ۔''

بی بی جیونی نے حیرت سے پوچھا۔ ''سانپ! کیسا سانپ! کہاں ہے وہ کالا سانپ؟''

پڑوسن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور دور ہی سے جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہاں، جھولے میں۔ بچے کے داہنی طرف بغل کے پاس۔'' بی بی جیونی نے چادر اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے چادر کو جھاڑا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ سانپ؟''

پڑوسن ابھی تک خوفزدہ تھی، جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہاں جھولے میں۔''

بی بی جیونی نے ہنس کر کہا۔ ''یہاں تو کہیں سانپ وانپ نہیں۔ تمہیں شبہ ہوا ہوگا۔ اگر ہوتا تو مجھے نظر تو آتا۔''

پڑوسن نے اپنے ہاتھ کی کلائی بی بی جیونی کی طرف بڑھادی، بولی۔ ''بی بی! اگر میں اپنا یہ ہاتھ فوراً نہ ہٹالیتی تو وہ سانپ مجھے ضرور ڈس لیتا۔ اس نے میرے ہاتھ پر پھن مارا تھا اور اس کے منہ سے زبان کے بجائے ایک شعلہ سا نکلا تھا۔ اگر یقین نہیں آتا تو میرے ہاتھ کی کلائی کے بالوں کو دیکھ لو۔ یہ سب اس شعلے سے جھلس کر رہ گئے ہیں۔''

بی بی جیون نے ذرا غور سے پڑوسن کی کلائی جو دیکھی تو واقعی سارے بال جھلسے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ایک بار پھر جھولے میں اس سانپ کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔

پڑوسن پر اتنی دہشت طاری ہوئی تھی کہ وہ مزید رک نہیں سکی، فوراً ہی چلی گئی۔ مارے خوف کے اس کو بخار آگیا۔ بخار کی شدت میں وہ ہذیان بکنے لگی۔ ہذیان بکتے بکتے وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس نے عالم بے ہوشی میں دیکھا کہ وہی کالا سانپ پھن اٹھائے اس کے

سامنے کھڑا تھا۔ اس نے شدت خوف سے چیخنا چاہا مگر اس کی آواز حلق سے باہر نہ نکل سکی۔ پھر اس نے سانپ کو آہستہ آہستہ انسانی شکل میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں یہ سانپ حاجی محمد کی شکل اختیار کر گیا۔ بی بی جیونی کے بچے کی شکل دیکھ کر عورت کا خوف کسی قدر کم ہوا۔ وہ حیرت سے بولی۔ ''حاجی محمد، یہ تم!''

حاجی محمد نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ میں ہوں، حاجی محمد علاؤالدین حسین غازی اور بی بی جیونی کا بیٹا۔ تجھے حیرت کیوں ہو رہی ہے؟''

عورت نے کہا۔ ''اور وہ سانپ کیا ہوا؟''

حاجی محمد نے جواب دیا۔ ''وہ میرے غصے اور عتاب کی شکل تھی۔'' عورت نے پھر سوال کیا۔

''غصے اور عتاب کی شکل کا مطلب؟'' بچے نے جواب دیا۔ ''عورت! تو سچ بتا، جس وقت تو مجھے اپنی گود میں لے رہی تھی، کیا تو پاک تھی؟''

عورت نے کہا۔ ''نہیں، میں پاک نہیں تھی، واقعی میں ناپاک تھی۔'' بچے نے خفگی سے کہا۔

''جب تو ناپاک تھی تو مجھے اپنی گود میں کیوں لے رہی تھی؟ بس اس بات پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تجھے خوفزدہ کر کے اپنے پاس سے دور کر دیا۔''

عورت رونے لگی، بولی۔ ''حضرت! واقعی میں نے بڑی غلطی کی تھی، مجھے معاف کر دیجیے۔ اب مجھ سے اس قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔''

حاجی محمد نے جواب دیا۔ ''اچھا، اب اٹھ کر کھڑی ہو جا میں نے تجھے معاف کر دیا۔''

عورت کی ہذیانی کیفیت دور ہو گئی اور بخار بھی جاتا رہا۔ اس کے آس پاس جو عزیز رشتے دراجمع ہو گئے تھے، انہوں نے عورت کی باتیں سن لی تھیں۔ لیکن حاجی محمد کی باتیں نہیں سن سکے تھے۔ عورت کی بڑبڑاہٹ کو ان سب نے اس کی ہذیانی کیفیت کا نتیجہ قرار دیا تھا لیکن جب عورت نے مسکراتے ہوئے بشاشت سے دونوں آنکھیں کھول دیں تو وہ خوفزدہ ہو گئے۔ انہیں شبہ گزرا کہ یقیناً اس عورت کا دماغ چل گیا ہے۔

کسی ایک نے دوسروں کو رائے دی۔ ''بہتر ہے کہ اس عورت کو باندھ دیا جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ یہ پاگل پن میں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''خبردار جو کسی نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا۔ کیونکہ میں صحیح الدماغ ہوں اور میں اس وقت جس عذاب میں مبتلا تھی وہ بی بی جیونی کے بزرگ بچے حاجی محمد کا مجھ پر ایک قسم کا غصہ تھا۔''

عورت کے شوہر نے پوچھا۔ ''کیا تو اپنے ہوش میں ہے اس وقت؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ تم لوگ جس طرح چاہو، میرے ہوش و حواس کا امتحان لے سکتے ہو۔''

شوہر نے کہا۔ ''اچھا تو پورا وہ واقعہ سنا دے جس کے عتاب میں خود تیرے بقول تیری یہ حالت ہو گئی تھی۔''

عورت نے سب کچھ صاف صاف بلا مبالغہ شوہر کو بتا دیا اور آخر میں بحالت بے ہوشی حاجی محمد سے جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی بتا دیں تو سب کو عورت کی سچائی پر یقین آ گیا۔ اس واقعہ نے بی بی جیونی کے بزرگ بچے کو اور زیادہ مشہور اور محترم بنا دیا۔

☆☆☆

یہ بچہ اسی طرح پرورش پاتا رہا اور کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوتا رہا جس سے بچے کی عظمت اور بزرگی کی شہادت ملتی رہی۔ حاجی غازی ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ یہاں تک کہ حاجی محمد پانچ سال کے ہو گئے۔ بی بی جیونی کی ذمے داریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ اپنے بیٹے کو حفظ و ناظرہ کی تعلیم دلانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ کام ان کے شوہر حاجی غازی کے ہاتھوں انجام پائے۔ وہ گڑگڑا کر خدا سے دعا کرتی رہتی تھیں کہ ان کا شوہر خیریت سے واپس آ جائے۔

آخر ان کی یہ دعائیں قبول ہوئیں اور حاجی غازی پانچ سال باہر رہ کر واپس آ گئے۔ وہ اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے مضطرب اور بے چین تھے۔ چنانچہ گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی سے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

بی بی جیونی کا خوشی سے برا حال تھا' بولیں۔ ''وہ کون؟ یہ کس کو پوچھ رہے ہو؟''

مارے خوشی کے بی بی جیونی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حاجی غازی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئے اور اندیشوں نے مضطرب کر دیا، بولے۔ ''بی بی! میں اپنے بچے کی بابت پوچھ رہا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''تم اس محبت اور مشقت کا اندازہ شاید نہیں لگا سکتے، جو مجھے اس بچے کی پرورش، تربیت اور حفاظت میں کرنی پڑی۔'' پھر بیٹے کو آواز دی۔ ''بیٹے حاجی محمد! ادھر آؤ، دیکھو یہ کون آ گیا۔''

حاجی غازی نے بیوی کو قدرے حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ''حاجی محمد، یعنی یہ کیسا نام؟''

بی بی جیونی نے جواب دیا۔ ''یہ نام حضرت شاہ سلیمان نے رکھا ہے۔ صرف ''محمد ﷺ'' نام رکھنے سے اس نام کی بے حرمتی ہوتی۔ اس

لیے اس میں لفظ حاجی کا اضافہ کر دیا۔''

اتنی دیر میں حاجی محمد بھی آ گئے۔ باپ کو ایک نظر دیکھا۔ باپ نے بیٹے پر شفقت کی نظر ڈالی اور پھر دونوں ہی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔ حاجی غازی کو اپنے پانچ سالہ بیٹے کو سینے سے لگانے کے لیے خاصا جھکنا پڑا تب کہیں بیٹے کا سر باپ کے سینے سے لگ سکا۔ باپ کی ڈاڑھی بیٹے کے سر اور پشت پر بکھر گئی۔

بی بی جیونی اس دلکش اور روح پرور نظارے سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

حاجی غازی نے بیوی سے پوچھا۔ ''صاحبزادے کچھ پڑھ لکھ بھی رہے ہیں؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''یہ کام میں نے تمہارے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ اب آ گئے ہو تو تم ہی یہ فرض بھی ادا کرو۔''

حاجی غازی نے چند دن آرام کیا۔ اس کے بعد بیٹے کو مولانا حافظ قائم الدین قاری حنفی جاگوئی کی خدمت میں لے گئے اور ان سے درخواست کی کہ بچے کو علوم ظاہری سے مالا مال کیا جائے۔ مولانا قائم الدین اپنے عہد کے مشہور اور لائق ترین عالم تھے۔ حاجی محمد کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ چند ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ مولانا قائم الدین ان کی اس غیر معمولی ذہانت اور حافظے سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کے حلقہ درس میں اس پائے کا ذہین اور فطین شاگرد تو پہلے کبھی آیا تھا اور نہ ان کے بعد آیا۔

علوم معقول اور منقول کی تحصیل کے بعد حاجی غازی نے سلوک قادریہ اور قطبیہ سے آشنا کیا۔

سترہ سال کی عمر میں آپ نے فیصلہ کر لیا کہ دنیا کو ترک کر دیں گے۔ چنانچہ ایک دن آپ نے جملہ اعزا سے کنارہ کشی اختیار کی اور گوندل بار کے جنگل کا رخ کیا۔ اس جنگل کے طول و عرض کا یہ حال ہے کہ تحصیل پھالیہ سے ضلع سرگودھا تک پھیلا ہوا ہے۔ نوجوان حاجی محمد اس وسیع عریض جنگل میں روپوش ہو کر یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ حاجی غازی اپنے نوجوان بیٹے کی گمشدگی سے بیحد پریشان ہو گئے اور انہیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ اضطراب کا یہ حال تھا کہ جس نے جہاں کی نشاندہی... کی، حاجی غازی بیٹے کی جستجو میں وہیں پہنچ گئے۔ آخر بڑی مشکل سے انہیں معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا حاجی محمد گوندل بار کے جنگل میں کہیں موجود ہے۔ حاجی غازی کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ یہ بیٹے کی تلاش میں اس جنگل میں گھس گئے اور بیٹے تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ باپ سامنے جا کھڑا ہوا مگر ذکر و فکر میں محو اور مشغول نوجوان عابد کو بڑی دیر تک اپنے باپ کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا۔ آخر اس انہماک کو حاجی غازی نے ختم کیا۔ بہ آواز بلند بیٹے کو مخاطب کیا۔ ''بیٹے حاجی محمد! کیا تو میری طرف نہیں دیکھے گا؟''

باپ کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ آنکھیں کھول کر باپ کی طرف دیکھا۔ باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیٹے کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ باپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بیٹے! میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ تو یہاں جنگل میں موجود ہے۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''پدر بزرگوار! مجھے ایک ہی رشتہ مضبوط اور دوامی محسوس ہوا۔ باقی سارے ہی رشتے عارضی اور وقتی نظر آئے۔ چنانچہ میرے خیال میں جو رشتہ مضبوط اور دوامی تھا میں نے اس کا انتخاب کر لیا اور اب میں اس کی تلاش میں سرگرم سفر ہوں، اچھے برے انجام کی پروا کیے بغیر۔''

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! میں تیری بات پر آمنا و صدقنا کہوں گا لیکن یہ بھی تو سوچ کہ تو جن رشتوں کو عارضی کہہ رہا ہے، ان میں کا ایک رشتہ والدین کا بھی تو ہے۔ کیا ماں باپ اتنے خود غرض ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے جذبۂ مادری اور پدری کا گلا گھونٹ کر کنارہ کشی اختیار کر لیں؟''

بیٹے نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''بزرگوار! میں نے اس گھنے جنگل میں اپنے رب کی تلاش اور جستجو میں خاصا وقت گزارا ہے اور ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ ماسوا کو بھلا دوں۔ اپنے رب کے سوا سبھی کو نظر انداز کر دوں اور اس وقت اگر آپ میرے پاس نہ آ گئے ہوتے تو میں یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب رہا۔''

حاجی غازی نے شفقت سے جواب دیا۔ ''بیٹے! ایک چیز ہے سنت رسول ﷺ۔ اگر تو اس سنت کو ادا نہ کر سکا تو بڑے خسارے میں رہے گا۔''

حاجی محمد نے دریافت کیا۔ ''کون سی سنت؟ اور میں خسارے میں کیوں رہوں گا؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! وہ سنت شادی ہے اور تجھے اس سنت کو بہر قیمت پورا کرنا ہے۔''

نوجوان بیٹے نے عرض کیا۔ ''باوا جان! میں شادی سے کب انکار کر رہا ہوں لیکن شادی کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔''

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! شادی کا یہی تو صحیح وقت ہے۔ میں تو تیری شادی کے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔''

حاجی محمد نے پریشان ہو کر عرض کیا۔ ''پدر بزرگوار! اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ آپ مجھے یہاں سے واپس لے جائیں گے۔''

حاجی غازی نے جواب دیا۔ ''بے شک میرا یہی مطلب ہے۔ اب تو گھر چلے گا۔''

بیٹے نے متامل ہو کر عرض کیا۔ ''مجھے گھر چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ میری ذات پر منحصر ہوگا کہ میں جب تک چاہوں رہوں اور جب چاہوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر روپوش ہو جاؤں۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''میں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا بلکہ میں بار بار یہی کہوں گا کہ تو جہاں بھی چاہے، جا سکتا ہے اور رہ بھی سکتا ہے لیکن اس سے پہلے تو حقوق العباد ضرور ادا کرے گا۔ تو جب تک اس دنیا میں رہے گا حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگر تو نے اپنا یہ فرض ادا کر دیا تو بعد میں کون ہے جو تیرے کسی معاملے میں بھی دخل دے۔ نہ انسان دخل دے سکتا ہے نہ خدا۔ دونوں خاموش ہو جائیں گے۔''

نوجوان حاجی محمد باپ کی دلیلوں سے چپ ہو گئے اور باپ کے ساتھ واپس چلے گئے۔

حاجی غازی نے وقت ضائع کیے بغیر آپ کا رشتہ طے کر دیا اور موضع نوشہرہ کے ایک بزرگ گھرانے کی لڑکی سے آپ کی شادی کر دی۔ آپ نے اسی گاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔

رشتۂ ازدواج سے منسلک ہونے کے بعد آپ نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر یادِ الٰہی شروع کر دی۔ سارا دن تو نوشہرہ کی مسجد میں تلاوت قرآن میں مشغول رہتے اور رات کو دریا کے کنارے چلے جاتے اور اللہ اللہ میں پوری رات گزار دیتے۔ آپ کا یہ معمول چند سال متواتر رہا۔

ایک دن آپ کی بیوی کے ایک رشتے دار نے جو آپ کو اس سخت شاقہ میں مبتلا دیکھا تو ازراہِ ہمدردی عرض کیا۔ ''جناب والا! میں نے آپ جیسا عبادت گزار اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اگر آپ میری بات مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو مشورہ ضرور دے کیونکہ بہترین مشورہ بھی کارِ خیر ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس پر عمل کر کے میں کوئی خیر حاصل کر لوں۔''

اس شخص نے کہا۔ ''حضرت! اپنے خاندان میں ایک بزرگ ملا کریم الدین ہیں۔ میں نے انہیں بھی شب و روز ذکر و فکر میں مستغرق دیکھا۔ اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کے ہم پلہ ہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھی اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ انہوں نے اپنی اصلاح اور تربیت کے لیے بھلوان کے شاہ سلیمان قادری سے رجوع کیا تھا اور آج اپنے انہی پیر و مرشد کے فیضان سے کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو انہی بزرگ کے پاس تشریف لے جائیں۔''

شاہ سلیمان قادری کی ذات ایسی نہیں تھی جس سے آپ ناآشنا ہوتے۔ انہیں یاد آ گیا کہ یہی بزرگ ہیں جو ان کے گھر دو بار تشریف لے گئے اور حاجی محمد نام بھی انہی کا رکھا ہوا تھا پھر بھی تکلف اور لحاظ کے زیر اثر حاجی محمد پہلے تو ملا کریم الدین کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ شاہ سلیمان قادری کی صحبت میں پہنچنے کا وسیلہ بنیں چنانچہ ملا کریم الدین کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ملا کریم الدین بھی حاجی محمد کی عظمت اور بزرگی سے کسی حد تک واقف تھے جواب دیا۔ ''بھائی میرے! تم کہتے ہو تو میں چلا چلتا ہوں ورنہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں میرے وسیلے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم تو خود ایک وسیلہ ہو اور اگر میں تمہیں وہاں لے بھی گیا تو اس سے میں عزت اور توقیر حاصل کر لوں گا۔ تم تو پہلے ہی سے معزز اور موقر ہو۔''

حاجی محمد نے ازراہِ عاجزی جواب دیا۔ ''ثمر دار شاخیں اسی طرح جھکتی ہیں جس طرح تم نے عاجزی اختیار کی ہے۔ میں تمہارے وسیلے سے شاہ سلیمان قادری کی خدمت میں جاؤں گا اور اس کا ثواب بھی تمہی کو ملے گا۔'' ملا کریم الدین انہیں لے کر شاہ سلیمان کی خدمت میں پہنچ گئے۔

شاہ سلیمان انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور فرطِ جوش میں فرمایا۔ ''اے نوجوان خوش آمدید! تو اب تک کہاں تھا، میں تو تیرا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔''

حاجی محمد نے فرمایا۔ ''حضرت میں تو آپ کی طلبی کا منتظر تھا۔ جیسے ہی آپ نے یاد فرمایا، حاضر ہو گیا۔''

شاہ سلیمان قادری بہت خوش تھے۔ بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔ ''نوجوان! تیری باتوں میں غیریت اور تکلف ہے حالانکہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جو بظاہر میرا گھر ہے درحقیقت تیرا ہی گھر ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہے تیرا ہے۔ میں جو کچھ بھی تجھے دوں گا تیری امانت سمجھ کر دوں گا۔''

حاجی محمد نے جوشِ عقیدت سے شاہ سلیمان قادری کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور نہایت ادب سے ان کے روبرو بیٹھ گئے۔ شاہ سلیمان نے آپ کو اسی وقت اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔

اب شاہ سلیمان قادری تھے اور حاجی محمد تھے۔ مرشد اپنے شاگرد پر اس طرح توجہ دے رہا تھا گویا وہ شاگرد نہیں مرشد کی متاعِ گم گشتہ تھی جو اچانک مل گئی تھی۔ شاہ سلیمان انہیں منازلِ سلوک طے کروانے لگے اور جب یہ منازل طے پا گئیں تو مرشد نے اپنے شاگرد اور مرید کو خرقۂ خلافت پہنا دیا اور انہیں نوشہ اور گنج بخش کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

شاہ سلیمان نے آپ پر اتنا اعتماد کیا کہ بعد میں اپنے دونوں فرزند تاج محمود اور رحیم بھی آپ کی نگرانی میں دے دیے۔

☆☆☆

آپ کی گنج بخشی کا شہرہ عام ہو گیا۔ خلقِ خدا کو آپ سے بے انتہا فائدے پہنچنے لگے۔ غرض مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ ان میں اہلِ ثروت بھی ہوتے اور مفلس و نادار بھی۔ آپ ہر ایک کے کام آتے، آپ کے خاص ارادت مند آپ کی دربانی میں فخر محسوس کرتے۔ وہ حاجت مندوں کو آپ سے ملاتے اور دردمندوں کی غم گساری کرتے۔

ایک دن حاجت مندوں کی بھیڑ میں ایک ساربان بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ ساربان نے آپ کے ایک ارادت مند کو پاس بلا کر دریافت کیا۔ ''جناب! میں بڑی دیر سے اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں محنت مزدوری کرنے والا انسان یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر آج میں حضرت نوشہ گنج بخش سے ملاقت نہ کر سکا تو میرے لیے اس در کی دوبارہ حاضری مشکل ہو جائے گی۔''

ارادت مند نے پوچھا۔ ''دوبارہ حاضری مشکل کیوں ہو جائے گی؟''

ساربان نے جواب دیا۔ ''میں نے عرض جو کر دیا ہے کہ میں ایک مزدور ہوں اور ہر روز یہ وقت نہیں نکال سکتا۔''

ارادت مند نے کہا۔ ''تیرا کام کیا ہے؟''

ساربان نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری بیوی ہے اور نابینا ہے، پیدائشی نابینا۔ میں حضرت نوشہ گنج بخش کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ وہ میری بیوی کو بینا کر دیں۔''

ارادت مند نے ساربان کا مذاق اڑایا کہا۔ ''تو کہتا ہے کہ تیری بیوی پیدائشی نابینا ہے، اس پیدائشی نابینا کو کس طرح بینائی ملے گی میں نہیں جانتا لیکن میں یہ ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہ حضرت نوشہ کسی کا مرض تو دور کر سکتے ہیں لیکن پیدائشی نقائص کی تلافی نہیں کر سکتے۔''

ساربان نے چڑ کر کہا۔ ''تو عجیب کج فہم مرید ہے۔ ارے جب حضرت نوشہ مرض دور کر سکتے ہیں تو پیدائشی نقص کیوں نہیں دور کر سکتے اور میں تو یہ فیصلہ کر کے آیا ہوں کہ کچھ بھی ہو میں اپنی بیوی کی بینائی لے کر ہی واپس جاؤں گا۔''

ارادت مند نے ذرا سختی سے کہا۔ ''بلاوجہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ جا اپنا کام کر اور فضول کام میں اپنا قیمتی وقت مت ضائع کر۔''

ساربان بھی اڑ گیا بولا۔ ''تو مجھے مایوس کرنے والا کون ہوتا ہے۔ میں حضرت نوشہ گنج بخش کے پاس آیا ہوں، تیرے پاس نہیں آیا۔ اس لیے تو اپنی زبان بند رکھ اور مجھے مایوس نہ کر۔''

ارادت مند ہتھے سے اکھڑ گیا اور غصے سے بولا۔ ''اگر تو اڑیل ہے تو میں بھی ایک ضدی ہوں دیکھتا ہوں تو کس طرح اندر جاتا ہے اور حضرت سے ملاقات کرتا ہے۔''

ساربان بات بگڑتی دیکھ کر خاموش ہو گیا اور کچھ دیر بعد ارادت مند کو کسی اور طرف متوجہ دیکھ کر بلا اجازت اندر چلا گیا اور حضرت نوشہ کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ آپ نے اسے اٹھا کر دریافت کیا۔ ''کیا بات ہے؟ تجھے کیا ہو گیا؟''

ساربان نے جواب دیا۔ ''حضرت! میری مدد کیجیے میں بڑا دکھی انسان ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''اپنا دکھ درد بیان کر۔ میں اللہ سے دعا کروں گا۔''

ساربان نے ساری تفصیل سنا کر عرض کیا۔ ''آپ کے ارادت مند نے مجھے مایوس کیا مگر میں پھر بھی اندر آ گیا۔ اب میری مدد کرنا نہ کرنا آپ پر منحصر ہے لیکن باہر میں نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے کہ میں اس در سے ناکام نہیں جاؤں گا۔''

آپ نے اسے تسلی دی فرمایا۔ ''بہر حال تو پریشان نہ ہو تیری نابینا بیوی کہاں ہے، اسے میرے پاس لے آ۔''

ساربان نے جواب دیا۔ ''اگر میں باہر جاؤں گا تو آپ کا ارادت مند مجھے دوبارہ نہیں گھسنے دے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو مت پریشان ہو، جا اپنی بیوی کو لے آ۔ تجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔''

ساربان نے حسرت سے آپ کی طرف دیکھا اور باہر چلا گیا۔ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور ارادت مند کو سنانے کے لیے کہا۔ ''چل، تجھے میاں جی یاد فرما رہے ہیں۔''

ارادت مند نے بڑی بے بسی سے ساربان کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے منہ پھیر لیا۔

ساربان بیوی کو لیے ہوئے حضرت نوشہ کے پاس چلا گیا۔ آپ نے بیوی کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ''تو یہ ہے تیری بیوی، یہ نابینا ہے؟''

ساربان نے جواب دیا۔ ''حضرت اب میں کیا عرض کروں، خود ہی ملاحظہ فرمالیجیے۔''

آپ نے نابینا عورت سے پوچھا۔ ''کیا تجھے کچھ نظر نہیں آتا؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''حضرت! بالکل نہیں۔''

آپ نے کہا۔ ''مگر میری طرف تو دیکھو۔ میں کہتا ہوں کہ میری طرف دیکھو۔''

عورت نے جواب۔ ''حضرت! میں نابینا ہوں۔ مجھے نظر نہیں آتا۔''

آپ نے سختی سے کہا۔ ”میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ میری طرف دیکھو۔“
عورت نے پھر وہی جواب دیا۔ ”حضرت میں کتنی بار یہ کہوں کہ میں نابینا ہوں مجھے دکھائی نہیں دیتا۔“
آپ نے غصے میں کہا۔ ”میں ایک بار پھر حکم دیتا ہوں کہ میری طرف دیکھو۔“
عورت نے بڑی مایوسی سے جواب دیا۔ ”حضرت! میں اندھی ہوں آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں دیکھوں تو کس طرف دیکھوں، مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“
آپ نے ایک بار پھر حکم دیا۔ ”مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تو نابینا ہے، جب میں تجھے یہ حکم دے رہا ہوں کہ تو میری طرف دیکھ تو تجھے میری طرف دیکھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔“
ساربان نے بھی بیوی کو سمجھایا۔ ”ارے نیک بخت! تو حضرت نوشہ کی بات کیوں نہیں سمجھتی یہ گنج بخش ہیں۔ اس در سے کوئی مایوس نہیں جاتا۔ تو میاں جی کی طرف دیکھنے کی کوشش تو کر۔“
عورت نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پلکیں جھپکانے لگی۔ آنکھیں چمچانے لگیں۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کی آنکھوں کے سامنے روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ آنکھوں نے کچھ کچھ دیکھنا شروع کر دیا اور اس نے زندگی میں پہلی بار انسانوں کی شکل وصورت دیکھی۔ اس کے سامنے میاں جی بھی تھے اور اس کا ساربان شوہر بھی۔ آدمیوں کے جسم اور چہرے کی بناوٹ، آنکھ، کان، ناک، سر اور اس کے بالوں کے رنگت، ہاتھ، پاؤں، ڈاڑھی مونچھ اور بہت کچھ۔ ساربان کی صورت دیکھتے ہی پوچھا۔ ”تو کون ہے؟ کیا میرا شوہر؟“
ساربان نے جوش مسرت سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں تیرا شوہر ہوں۔ کیا تو مجھے دیکھ رہی ہے؟“
عورت نے جواب دیا۔ ”ہاں میں تجھے دیکھ رہی ہوں، خوب اچھی طرح دیکھ رہی ہوں۔“
اس کے بعد عورت نے حضرت نوشہ کی طرف دیکھا اور فرط جذبات میں سسکنے اور رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس بزرگ میں یہ غیر معمولی صلاحیت اور معجزاتی یا کراماتی قوت کس نے عطا کر دی کہ اس جیسی پیدائشی نابینا کو بینا کر دیا۔
حضرت نوشہ نے فرمایا۔ ”جا اور اپنے رب کی عبادت کر۔ اس کے ذکر وفکر میں لگ جا۔“
ساربان نے کہا۔ ”حضرت! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”شکریہ میرا نہیں دونوں جہانوں کے رب کا ادا کرو کیونکہ میں نے جو کچھ کیا اپنے خالق اور مالک کی منظوری اور اجازت سے کیا ہے۔“
ساربان نے کچھ دیر بیٹھ کر جانے کی اجازت مانگی۔ ”حضرت اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے گھر جاؤں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اب تو جا سکتا ہے لیکن وہی ایک بات کہ اپنے رب کے ذکر وفکر سے ہرگز غافل نہ رہنا کیونکہ خدا جب خود ہم سب پر کرم فرماتا ہے تو ہمیں بھی اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“
ساربان اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ اس دن وہ دونوں اتنے زیادہ خوش تھے کہ اس سے زیادہ خوشی کا تصور محال ہوگا۔
آپ کے مریدوں میں حافظ معموری کو بڑا مقام حاصل تھا اور بعد میں حافظ معموری ہی کو خلیفہ بھی بنایا گیا۔ حافظ معموری کو کچھ دنوں سے یہ خیال بہت ستا رہا تھا کہ صوفیوں میں یہ جو مشہور ہے کہ روز محشر تمام قومیں اپنے اپنے فرقوں میں بٹ جائیں گی اور ہر گروہ کو الگ الگ علم دیے جائیں گے اور تمام فرقے اپنے اپنے علم کے زیر سایہ ہوں گے۔ حافظ معموری سوچتے کہ معلوم نہیں یہ مسئلہ سچ ہے یا جھوٹ؟
اس فکر اور تردد میں حافظ معموری نے ایک ہفتہ گزار دیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ایسی حالت فکر وتردد میں ایک دن انہیں نیند آ گئی اور وہ گہری نیند سو گئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ہر طرف قیامت برپا ہے۔ لوگوں کا بڑا ہجوم ہے اور ہر طرف علم ہی علم نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک علم کو سب سے اونچا دیکھا اور اس علم کا پھریرا اتنا وسیع وعریض تھا کہ چاروں طرف کے بڑے حصے پر محیط تھا۔ حافظ معموری نے اپنے دل میں سوچا۔ ”پتا نہیں یہ کس کا علم ہے؟ کس فرقے یا قوم کا ہے؟“
ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آواز آئی۔ ”حافظ معموری یہ علم غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر کا ہے۔“
حافظ معموری نے اس علم کے نیچے دوسرے کئی علم دیکھے، وہ ان علموں میں اپنے پیر ومرشد حضرت نوشہ گنج بخش کا علم تلاش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد یہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے اور ایک جگہ حضرت نوشہ کو پالیا۔ وہ ایک علم اٹھائے ہوئے تھے اور اس علم کے سائے میں اپنے یاروں اور مریدوں کو لیے بیٹھے تھے۔ حافظ معموری نے حضرت نوشہ کو دیکھا اور حضرت نوشہ نے حافظ معموری کو۔ انہوں نے دور ہی سے آواز دی۔ ”حافظ معموری! تو پریشان کیوں ہے؟ ادھر میرے پاس آ جا کیونکہ تیری جگہ میرے علم کے سایے میں ہے۔“
حافظ معموری دوڑ کر اس علم کے سایے میں چلے گئے۔ حضرت نوشہ نے انہیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔
یہ خواب دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے اور ایک بڑے تردد سے ان کی جان چھوٹی۔ ان کے اندر کی خوشی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

حضرت نوشہ نے مسکرا کر حافظ معموری کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”حافظ معموری! ادھر آؤ میرے پاس۔“ حافظ معموری اپنے مرشد کے قدموں میں جا بیٹھے۔
آپ نے حافظ معموری کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر فرمایا۔ ”تیرا وسوسہ دور ہوا؟ یوم الحشر اور علموں کے نصب ہونے کا مسئلہ تیری سمجھ میں آیا یا نہیں؟“
حافظ معموری نے جواب دیا۔ ”حضرت سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کیا سب کچھ اسی طرح پیش آئے گا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”بالکل، جس طرح تم نے دیکھا بالکل اسی طرح ظہور میں آئے گا۔“
حافظ معموری پہلے ہی بہت خوش تھے لیکن پیر مرشد کی زبان سے سن کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔

☆☆☆

موضع باہو کے حجام جیون آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اصرار کیا کہ ”حضرت میرے ساتھ میرے گاؤں باہو تشریف لے چلیے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”تو مجھے اپنے گاؤں کیوں لے جانا چاہتا ہے؟“
جیون نے جواب دیا۔ ”میری خوشی اس میں ہے کہ آپ میرے گاؤں تشریف لے چلیں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اگر تیری خوشی اسی میں ہے تو میں تیرے گاؤں ضرور جاؤں گا۔“
عصر کا وقت تھا آپ کے مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت یہاں سے باہو کے کا فاصلہ دو کوس (چار میل) ہے چنانچہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ختم ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ عصر کی نماز یہیں پڑھ لی جائے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اللہ نے چاہا تو باہو کے پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کریں گے۔ یہاں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
مریدوں کی مجال نہ تھی کہ دم مارتے، خاموشی اختیار کی۔ آپ جیون حجام اور مریدوں کو لے کر باہو کے روانہ ہو گئے۔
بیل گاڑی اپنی تمام رفتار سے سوئے منزل رواں تھی اور مریدوں کو یہ دھڑکا پریشان کیے ہوئے تھا کہ باہو کے پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ختم ہو جائے گا لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب یہ لوگ باہو کے میں داخل ہوئے تو سورج مغربی افق پر بہ دستور چمک رہا تھا۔ آپ نے جیون حجام سے فرمایا۔ ”میں کچھ دیر آرام کر کے عصر کی نماز ادا کروں گا۔ تو میرے لیٹنے کا انتظام کر دے۔“
جیون حجام نے چارپائی بچھا کر بستر کر دیا۔ آپ کچھ دیر کے لیے لیٹ گئے۔ مرید حیران تھے کہ یہ وقت کے سیل رواں کو کیا ہو گیا؟ آپ کچھ دیر آرام کر کے اٹھے اور مریدوں سے فرمایا۔ ”وضو کر لو تاکہ عصر کی نماز پڑھ لی جائے۔“
ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آج وقت کو کیا ہو گیا؟ ایسا لگتا ہے گویا ٹھہر گیا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے وضو کا حکم دیا ہے اس لیے باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔“
تمام مریدوں نے وضو کیا۔ ان کے ساتھ خود آپ نے بھی۔ اس کے بعد سب نے آپ کی امامت میں عصر کی نماز ادا کی اور جب اس سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا۔ ”دوستو! تم سب حیران ہو کہ یہ وقت ٹھہر کیوں گیا؟ وقت کہاں ٹھہرا؟ مشیت ایزدی اور حکم خداوندی سے باہر کوئی چیز نہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچیں یا وقت ٹھہرا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے میری آبرو رکھ لی اور میں نے نماز عصر باہو کے میں ادا کر لی۔“
اس کے بعد جیون حجام آپ کو اپنی زمین پر لے گیا اور آپ سے خیر وبرکت کی دعا چاہی۔ آپ نے جیون حجام کے حسب دل خواہ دعا کی اور ایک رات باہو کے میں گزار کر اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔

☆☆☆

حافظ معموری کے صاحبزادے شیخ تاج الدین آپ کے قریب ہی سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ سے ذرا دور فاصلے پر مٹی کا دیا روشن تھا۔ شیخ تاج الدین کی نظریں آپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد آپ نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور کسی کو منع کرنے کے انداز میں ارشاد فرمایا۔ ”نہ مار، نہ مار، میں تجھے منع کرتا ہوں کہ اسے مت مار۔“
تاج الدین اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ حضرت نوشہ کس کو منع فرما رہے ہیں؟ لیکن وہاں دوسرا کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ اس وقت یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے لیکن مارے رعب کے دریافت نہ کر سکے۔ صبح فجر کی نماز کے بعد تاج الدین نے اس واقعہ کا ذکر دوسرے مریدوں سے کر دیا اور درخواست کی کہ آپ لوگ اپنے طور پر معلوم کریں کہ حضرت نوشہ یہ کس کو منع کر رہے تھے۔ آخر ان میں سے کئی نے رات کے واقعے کا ذکر پوچھا۔ ”حضرت! یہ معاملہ کیا تھا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ٹھہر جاؤ۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

ابھی یہ فقرہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ پانڈووال کا چودھری شمشیر بھی آ گیا۔ آپ نے اسے دیکھتے ہی دریافت کیا۔ ''چودھری شمشیر! رات تو خیریت سے گزری؟ یہ معاملہ کیا تھا؟''

چودھری شمشیر بھرے ہوئے جام کی طرح چھلک پڑا، بولا۔ ''حضرت! میں رات کے واقعے اور اس میں آپ کی استعانت کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''یہ معاملہ کیا تھا؟''

چودھری شمشیر نے جواب دیا۔ ''بس کیا عرض کروں، حضور کی توجہ سے میرے جان بچ گئی، ورنہ آج میرا لاشہ کہیں پڑا ہوتا۔''

آپ نے کہا۔ ''میں واقعے کی تفصیل سننا چاہتا ہوں۔''

چودھری نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں سویا ہوا تھا اور میرے دشمنوں نے میرے قتل کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ پہلے چالیس پچاس آدمی میرے گاؤں پانڈووال پر حملہ آور ہوں۔ کچھ آدمی میرے دوست بن کر مجھے اور میرے دوستوں کو جگا کر اپنے ساتھ لیں اور ورغلا کر کسی ایسی جگہ لے جائیں جہاں میرے دشمن پہلے ہی سے چھپے میری گھات میں بیٹھے ہوں۔ جب میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان چھپے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچوں تو وہ مجھ پر ایک دم حملہ کر کے قتل کر دیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ اپنے منصوبے کے مطابق میرے گاؤں پانڈووال میں داخل ہو گئے تو اتفاق سے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیدار تھا۔ میرے گاؤں پر حملہ ہوا تو میں اپنے دوستوں کو لے کر ادھر ادھر ہو گیا۔ اس افراتفری میں ہم لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اندھیری رات، آسمان پر چاند بھی نہیں تھا۔ میں نے اس اندھیرے میں اپنے دوستوں کو آواز دی کہ تم لوگ کدھر چلے گئے؟

میرے دشمن جو میری گھات میں چھپے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے دور سے جواب دیا۔ ''ادھر آ جاؤ، ہم سب یہاں ہیں۔''

میں دھوکے میں آواز کی طرف چل پڑا اور جب ان کے پاس پہنچا تو مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نیزوں اور تلواروں سے لیس میری طرف بڑھے۔ اس وقت میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''حضرت نوشہ گنج مدد! خدا کے لیے مجھے ان موذیوں سے بچائیے۔''

پھر اچانک میں نے دیکھا کہ آپ بہ نفس نفیس وہاں پہنچ گئے ہیں اور انہیں منع فرما رہے ہیں کہ۔ ''مت مارو، یہ کیا کر رہے ہو؟'' آپ کو دیکھتے ہی میں بے ہوش ہو گیا اور جب ہوش میں آیا تو وہاں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میرے دشمن فرار ہو چکے تھے۔'' شیخ تاج الدین اور دوسرے مریدیہ روداد حیرت سے سنتے رہے اور آخر میں بے اختیار نعرہ لگایا۔ ''حضرت نوشہ کے رموز یہ خود ہی جانیں۔ ہماری ناقص عقلیں کیا جانیں۔''

آپ کا یہ طریقہ تھا کہ اگر آپ کی مسجد میں مسافروں اور مسکینوں کی آمد ہو جاتی تو ان کے لیے اپنے گھر سے طعام مہیا کرتے اور اگر گھر سے طعام مہیا نہ کر پاتے تو گاؤں والوں کے پاس جاتے اور ان سے سامان طلب کرتے۔ ایک بار ایک ایسے ہی موقع پر آپ مستی نام کے ایک شخص کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ آپ نے کھانا طلب کیا۔ گھر میں بیوی موجود تھی مگر یہ بڑی کنجوس تھی۔ اس وقت عورت کے ہاتھ میں آٹے کا برتن تھا۔ اس نے برتن کو ران کے نیچے چھپا لیا اور جواب دیا۔ ''حضرت آج گھر میں آٹا نہیں ہے ورنہ ضرور حاضر کر دیتی۔'' آپ نے سکوت اختیار کیا اور واپس چلے گئے۔

آپ کے جاتے ہی عورت نے آٹے کا برتن اس کی جگہ پر رکھ دینا چاہا لیکن وہ برتن اس کی ران سے چمٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ برتن کو ران سے چھڑا لے لیکن وہ نہ چھڑا سکی۔

جب خاوند آیا اور اس نے بیوی کو اس حال میں مبتلا دیکھا تو بہت پریشان ہوا اس نے اصل واقعہ پوچھا تو بیوی نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھاگا بھاگا حضرت نوشہ کی خدمت میں پہنچا اور بڑی عاجزی اور انکساری سے معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ ''تیری بیوی کو جھوٹ نہیں بولنا تھا۔ جا، گھر میں جا کر دیکھ، برتن چھوٹ گیا۔'' شوہر گھر واپس گیا تو واقعی برتن ران سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

یہ شاہجہان کا دور حکومت تھا۔ اسے قندھار کی مہم بہت پریشان کر رہی تھی اس نے آپ سے استدعا کی کہ قندھار کی فتح کے لیے دعا فرمائیں۔ آپ نے دعا فرمائی اور قندھار فتح ہو گیا۔ اس نے اس خوشی میں مصارف لنگر کے لیے موضع ٹھٹھہ عثمان اور بادشاہ پور نذرانے میں عطا فرمائے۔

آپ کا سن ولادت یکم رمضان 959ھ (21 اگست 1552ء) ہے اور سن وفات آٹھ ربیع الاول 1064ھ (17 جنوری 1654ء) بروز سہ شنبہ (منگل) ہے۔ یہ شاہجہان کا عہد تھا۔ آپ کا روضہ مبارک سلہنپال شریف گجرات (پنجاب) سے نصف میل دور جانب شمال مرجع خلائق ہے۔ ماوۂ تاریخ ''فیض قدس'' ہے۔

☆☆☆

ماخذات: اذکار نوشاہیہ، حضرت شرافت نوشاہی۔ انوار نوشاہیہ، انوار نوشاہیہ۔ تحفۃ الابرار، مرزا آفتاب بیگ۔ تذکرہ اولیائے ہند، مرزا احمد اختر کیرانوی۔ خزینتہ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری

محمد الیاس

بلا

ہمیں اکثر اپنے اردگرد بلا اور بھائی جان جیسے کردار نظر آجاتے ہیں مگر... اس ماحول میں آزادی اور جبر کا کوئی تناسب نظر نہیں آتا۔ اٹھارہ سال بعد بلا جیسے بیٹے کو پیدا کر کے باوا جان نے شاید بڑے بیٹے سے نافرمانی کا کوئی انتقام لیا تھا لیکن... کیا خبر تھی کہ بلا کو قدم قدم پر اس محبت کا تاوان یوں بھرنا پڑے گا... اس حبس زدہ موسم میں کسی خوشگوار جھونکے کا اسے شدت سے انتظار تھا اور ایک دن اس کی قوت برداشت اسے اذیت پسندی کی انتہا پر لے گئی۔

خواہشوں اور خوابوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے رشتوں کی آزمائش

جو شخص بھری جوانی میں صرف دس روپے کی خاطر سگے باپ کو حوالات بھجوا دے، وہ اگر کسی بدنصیب کا بڑا بھائی ہو تو ''سگ باش برادر خورد مباش'' جیسی ضرب المثل کی صداقت پر شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تقریباً تین دہائیاں گزر گئیں مگر رشتہ دار اور برادری والے آج بھی اس شرمناک قصے کو نہیں بھولے۔ بات کچھ یوں ہے کہ ابا جی نے سرکاری جنگل سے ایک درخت رات کے اندھیرے میں کاٹ لیا اور اپنی زمین میں لا کر دبا دیا۔ آبائی ڈھوک

کے گھر میں ایک کمرا زیر تعمیر تھا، جسے بعد میں صفہ کا نام دیا گیا۔ ڈیڑھ دو ماہ کا وقفہ دے کر والد صاحب نے صفہ کی چھت ڈال دی۔ ابھی ڈھوک والوں کی مبارکیں دھڑا دھڑا وصول کر رہے تھے کہ محکمۂ جنگلات کے اہلکار آئے اور ابا جی کو نہ صرف حراست میں لے لیا بلکہ صفہ کی تازہ پڑی ہوئی چھت اکھاڑ کر دونوں شہتریاں بھی ہمراہ لے گئے۔ سستا زمانہ تھا لہٰذا سابق فوجی کی سفید پوشی کا خیال کرتے ہوئے صرف دس روپے نقد جرمانہ ادا کرنے کا حکم ہوا۔ مسروقہ لکڑی چونکہ پہلے ہی قبضے میں لی جا چکی تھی، لہٰذا تادم ادائی رقم جرمانہ والد صاحب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

بھائی جان ان دنوں گورڈن کالج میں سال دوم کے طالب علم تھے۔ صرف ایک بھینس ہی ذریعہ معاش تھی، صبح ڈھوک سے کالج آتے ہوئے دودھ لے آتے اور راجا بازار کے ہوٹل میں دے دیا کرتے۔ بعض لوگ پیدائشی طور پر ہی اقتصادی معاملات میں بڑے طاق ہوتے ہیں۔ ماں کی ممتا اولاد کے ہاتھوں چکمہ کھانے پر ہر دم آمادہ رہتی ہی ہے اور پھر اتنے طویل راستے میں کئی مقام ایسے پڑتے ہیں، جہاں پانی بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ یوں ایک سیر دودھ کی قیمت آٹھ آنے روزانہ بڑی ہوشیاری سے پس انداز ہو رہی تھی۔ باپ پر بپتا پڑی تو اکلوتے بیٹے نے یوں منہ بنا لیا جیسے اس جیسا مسکین اور بے بس بندہ روئے زمین پر کوئی نہ ہو۔ ماں نے دہائی دی کہ بائیسکل بیچ کر باپ کو چھڑا لاؤ مگر زیرک بیٹے نے جواب دیا۔ ''اماں جلد بازی میں ایسے اہم فیصلے نہیں کیے جاتے۔ روزگار کا وسیلہ یہی سواری ہے، بیچ دی تو تینوں بھوکے مریں گے۔ خطۂ پوٹھوہار میں گو بھوک ننگ کا راج ہے مگر اس سرزمین کے سپوت بڑے بہادر اور سخت جان ہیں۔ اتحادیوں نے انہی کے بل بوتے پر دونوں عالمی جنگیں جیتی ہیں۔ کہاں کہاں کی قید کاٹ آئے۔ میرے والد صاحب کا صرف نام ہی بہادر نہیں وہ خود بھی بہادر ہیں۔''

پھر کالج کے پروفیسروں اور طالب علم ساتھیوں کی مدد سے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور ہفتہ دس دن میں بغیر ایک پیسا موری والا خرچ کیے، بھائی جان اپنے والد بزرگوار کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس افراتفری کے عرصے میں ایسا تہلکہ مچا کہ کسی بدبخت رشتہ دار نے بھائی جان سے متعلقہ ایک ایسا سربستہ راز طشت از بام کر دیا کہ پوری برادری اور علاقے کے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ بھائی نے شہر کے ڈاک خانہ میں جانے کب سے کھاتہ کھلوا رکھا ہے، جس میں چار روپیہ سات آنہ سود سمیت کل ایک صد تیرہ روپیہ پانچ آنہ کی خطیر رقم جمع ہے۔ والد صاحب سرپیٹ کر رہ گئے کہ ایسا شقی القلب بیٹا کہیں دیکھا نہ سنا، جس نے اچھی بھلی رقم ہوتے ہوئے بھی پورے نو دن باپ کا حوالات میں رہنا گوارہ کر لیا۔ اکلوتی اولاد کے لیے اس نے کیا کیا منصوبے بنا رکھے تھے کہ تن من بیچ کر بھی پڑھانا لکھانا ہے۔ اولین ترجیح ہوگی کہ بیٹا فوج میں کمیشن حاصل کرے۔ نہ ہو سکا تو ایل ایل بی کر کے وکالت کرنے لگے گا۔ چونکہ پوٹھوہار کی مٹی سے اتنا جھاڑ جھنکاڑ گھاس نہیں اگتی، جتنے مقدمے اگتے ہیں۔ کوئی مدعا علیہ ہاتھ نہ آئے تو بور ہو کر بھائی سگے بھائی کے خلاف ہی درخواست دائر کر دیتا ہے۔

راجا بہادر خان نے کس چاؤ سے بیٹے کا نام سخی بہادر رکھا تھا۔ وہ ایسا کمینہ ثابت ہوا کہ برادری اور علاقے بھر میں ناک کٹوا دی۔ ہر کوئی ٹھٹا اڑانے لگا۔ بیوی سے کئی بار کہا کہ ایسی اولاد سے کوئی امید رکھنا سراسر حماقت ہے۔ بعید نہیں کہ آخری عمر میں ذلیل و خوار کر کے رکھ دے۔ اکلوتے بیٹے کے لیے جائداد بچا رکھنے کے بجائے کیوں نہ اونے پونے بیچ کر دونوں میاں بیوی چار دن عیش کریں اور کچھ بڑھاپے کے لیے پس انداز کر لیں۔ مگر بیوی نے تائید نہ کی۔ تاہم ذہنی خلفشار کے اس عرصے میں میاں بیوی کے مابین ہم آہنگی زیادہ بڑھ گئی یا قدرت کو کرشمہ دکھانا مقصود تھا کہ اٹھارہ برس کی طویل خشک سالی کے بعد سُونے آنگن میں کونپل پھوٹ پڑی اور یہ خاکسار راجا سلطان بہادر خیر سے تولد ہوا۔

کہتے ہیں، ابا جی نے میرے پیدا ہونے کی بڑی خوشی منائی۔ بڑے بیٹے سے رویہ کچھ ایسا تھا جیسے اس کی بے وفائی کا بدلہ بڑے بھرپور انداز سے چکا لیا ہو۔ چار پانچ برس تک دونوں نے خوب میرے ساتھ لاڈ پیار کیا۔ اس عرصہ میں نئے دارالخلافہ کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ خوش حالی نے اس خطے میں ڈیرے ڈال لیے۔ ایسے لوگ جو کبھی سوتے جاگتے خواب دیکھا کرتے تھے کہ پانچ چھ سو روپے فی کینال کے حساب سے زمین بک جائے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ جن اِکا دُکا کے ہاں پہلے ہی گاڑیاں تھیں، وہ نئی مرسڈیز میں گھومنے لگے۔ مگر خوش حالی کی زندگی بسر کرنا ہر کسی کا مقدر نہیں ہوا کرتا۔ میں، راجا سلطان بہادر ابھی پورے پانچ برس کا نہیں ہوا تھا کہ چند ماہ کے وقفے سے ماں اور باپ دونوں راہی عدم ہوئے۔ جتنا عرصہ وہ زندہ رہے، مجھ سے جی بھر کے پیار کیا۔ جلد مرجانے والے والدین کے سینے میں اللہ جل شانہ اتنے محبت بھرے دل کیوں ڈال دیتا ہے۔

میں نے پٹیشن باز ایڈووکیٹ بھائی کے زیر سایہ بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا۔ وہ دولت سمیٹنے کے لیے ''اٹھ کمبھی'' جنگ لڑ رہے تھے۔ وکالت، پراپرٹی ڈیلنگ کے علاوہ ذخیرہ اندوزی اور امپورٹ ایکسپورٹ کے ساتھ، کاروں کا شوروم اور ریکروٹنگ ایجنسی بھی چلا رہے تھے۔ اس آپا دھاپی اور دولت کمانے کے جنون میں باقاعدہ شادی کر کے گھر بسانے کا ہوش ہی نہ رہا۔ کوئی نہ کوئی ڈھنگ کی موکلہ اس وقت تک قابو کیے رکھتے اور تاریخ پر تاریخ لیے جاتے، جب تک کہ وہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق وکالت نامہ منسوخ نہ کر دیتی۔ آخر کوئی کب تک بے وقوف بنا رہے۔ رفتہ رفتہ بھائی اس حد تک بدنام ہو گئے کہ کوئی موکلہ نزدیک بھی نہ پھٹکتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پولیس چھاپوں میں پکڑی جانے والیوں کو قانونی مدد فراہم کرنے کی ازخود پیشکش کرنے لگے..... لیکن وہ موصوف کے ذریعے ضمانت پر رہائی پانے سے کہیں بہتر سمجھتیں کہ متبادل انتظام ہونے تک مختصر وقفے کے لیے حوالات میں رہ لیا جائے۔ پیشہ وارانہ دیانت اور مہارت کے مکمل فقدان کا یہ نتیجہ نکلا کہ بھائی صاحب ایک وکیل کے بجائے بلیک میلر کے طور پر مشہور ہو گئے۔

مجھ پر یہ عقدہ کسی طور کھل نہیں پا رہا تھا کہ بھائی جان اتنی زیادہ دولت کس مقصد کے لیے جمع کیے جا رہے ہیں۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، پڑھنا لکھنا، کہیں آنا جانا، حتیٰ کہ سانس لینا بھی بڑے بھائی کی ترجیحات کے طابع تھا۔ میرا دکھ سمجھنے کے بجائے ہمارے ملازم اور جان پہچان کے لوگ بھائی کے پروپیگنڈا کا شکار ہو گئے اور کم و بیش سبھی نے باور کر لیا کہ راجا سخی بہادر نے چھوٹے بھائی کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ زندگی اس کے لیے وقف کر دی اور شادی بھی نہ کی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ جس دن آخری موکلہ ہاتھ سے نکلی تھی، انہوں نے اپنے آفس میں نئی سیکرٹری رکھ لی تھی سویٹی، جو کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گئی۔ غالباً اپنے تئیں باور کر لیا کہ بہت موٹا مرغا پھنس گیا ہے۔ گو عمر چوالیس سے تجاوز کر گئی ہے، مگر ایسا چھڑا چھانٹ کروڑ پتی مرد ملے گا بھی کہاں۔ ایک دیور بے چارے کی گھریلو ملازم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ باس شروع سے چھوٹے بھائی کو بلا کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔

رشتہ داروں سے میل جول رکھنا مجھے پسند تھا لیکن بھائی جان سختی سے منع کرتے۔ تاہم میں چوری چھپے مل لیا کرتا تھا۔ آبائی ڈھوک اور زمین میرے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے ہی محکمۂ مال کے لٹھے سے معدوم ہو کر سی ڈی اے کے ماسٹر پلان میں ضم ہو چکی تھی۔ موجودہ پراپرٹی میں میرا کچھ بھی نہ تھا۔ جو کرولا میرے زیر استعمال تھی، رجسٹریشن کے مطابق اس کے مالک بھی وہی تھے۔ میری زندگی کی واحد خوشی اور تاریک ترین شب و روز میں امید کی کرن، مفتی غلام مصطفیٰ کے گھرانے سے وابستہ ہو کر رہ گئی، جن کی بڑی بیٹی شفق اب میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہی لمحے جو ہم ایک دوسرے کے قریب گزار لیتے، میری زندگی کا حاصل تھا۔ وہ فتویٰ دینے والے مفتی نہیں تھے بلکہ کلین شیو اور دستیاب وسائل میں رہتے ہوئے ممکنہ حد تک ماڈرن بھی تھے۔ ایکسپورٹ پروموشن بیورو سے اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہو کر بھائی کے ایکسپورٹ آفس میں بہ طور منیجر بھرتی ہو گئے۔ مفتی صاحب کے ساتھ میرے ذاتی مراسم چار پانچ سال پرانے تھے۔ جن کاروباری امور میں رازداری رکھنا مقصود ہوتی، وہ کسی ملازم کے بجائے ہمیشہ میرے ذمے ڈال دیے جاتے۔ اسی لیے میری تعلیم بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ کاغذات لانے لے جانے کے لیے اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔

اپنی سوچوں میں پوری طرح واضح نہ ہونے کے باوجود، میرے ذہن کے کسی دھندلے گوشے میں ایک عجیب سا وسوسا پھن اٹھائے پھنکارتا ہوا محسوس ہوتا۔ بندہ خواہ بلا ہی کیوں نہ ہو، پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی تعلیم کے خصوصاً آخری سال تک کچھ نہ کچھ باتیں سمجھ آنے لگ ہی جاتی ہیں۔ حد سے بڑھے ہوئے اختیارات اور بے پناہ دولت کا ارتکاز، فساد برپا کر سکتا ہے۔ اسی طرح بے مثال حسن بھی

دائیں اور بائیں

ایک خاتون بہت موٹی تھی۔ موٹاپا دور کرنے کے لیے وہ ڈاکٹر کے پاس گئیں اور مشورہ مانگا۔ وہ بھی مفت۔

ڈاکٹر صاحب نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ پھر گویا ہوئے آپ نے سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلانا ہے۔

خاتون نے پوچھا۔ ''دن میں کتنی بار؟''

''صرف اس وقت جب کوئی آپ کو کھانے کے لیے کہے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

پیچیدہ مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مفتی فیملی خطرناک حد تک خوب صورت نہ ہوتی تو شاید میرا ذہنی سکون تباہ نہ ہوا ہوتا۔ میں اس زاویے سے سوچنے لگا کہ شفق کاش اتنی زیادہ حسین نہ ہوتی مگر قدرت کی طرف سے ملا ہوا ایسا انمول خزانہ کون واپس لوٹاتا ہے۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہ چھپائی۔ میں جان گیا تھا کہ مفتی صاحب دونوں بیٹیوں کے لیے اچھے رشتوں کی تلاش میں ہیں۔ ان کی ایک ہی خواہش تھی کہ بیٹیاں آسودہ گھروں میں جائیں۔ ماڈرن ہونے کے باوجود اندر سے کنزرویٹو تھے۔

جس روز میں نے آخری پرچہ دیا، بھائی نے مجھے اپنے دفتر میں بلالیا۔ ٹیبل کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر بٹھا کر سویٹی کو انٹرکام پر ہدایات دیں کہ جب تک وہ میٹنگ میں ہیں، کوئی مخل نہ ہو۔ میرے سامنے فل اسکیپ کاغذ پر فوٹو اسٹیٹ کیے ہوئے پاکستان کے چار نقشے رکھے اور چار عدد پوسٹ کارڈ سائز کے رنگین فوٹو گراف، جن میں بہت ہی صاف اور حقیقت کے قریب ترین چار مختلف اقسام کے سانپوں کی تصویریں تھیں۔ اتنی مہارت سے فوٹو گرافی کی گئی تھی کہ سانپوں کی آنکھوں میں دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں ان میں سے صرف کوبرا ہی پہچان پایا۔ باقی تینوں کے نام مجھے بھائی نے بار بار ذہن نشین کرائے، رسل وائپر، لیف نوز وائپر اور سا سکیل وائپر۔ پاکستانی نقشوں پر ان جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں جہاں یہ سانپ بہتات سے پائے جاتے ہیں۔ بھائی، ہمیشہ مجھے اتنی ہی بات بتایا کرتے، جتنی کام نکلوانے کے لیے ازحد ضروری ہوتی۔ تاہم اتنا پتا چل گیا کہ بھائی کو ان سانپوں کی ایکسپورٹ کا بڑا آرڈر ملا ہے اور سوئٹزرلینڈ والی پارٹی نے بھائی کی سہولت کے لیے تمام ضروری معلومات خود بھجوائی ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے ملک کے بارے میں غیر ہم سے زیادہ بہتر معلومات رکھتے ہیں۔

حکم ہوا کہ جلد سے جلد سندھ کے لیے روانہ ہوجاؤں۔ ابھی امتحانوں کی تھکن بھی نہ اتری تھی اور پھر شفق اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر کچھ ملاقاتیں کرنے کے بڑے خوب صورت منصوبے بنا رکھے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے، بڑے بیٹے کی طرف سے اپنے ساتھ ہونے والے بے رحمی کے سلوک کا انتقام جو میری پیدائش کی صورت میں لیا تھا، اس کا حساب رہ رہ کر مجھے چکانا پڑ رہا تھا۔ دولت سمیٹنے کی بے مہار ہوس نے ہم دونوں بھائیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ میں نے دبی دبی زبان میں اتنا ہی کہا کہ ایک پراپرٹی کے بزنس کا پیسا ہی نہیں سنبھالا جا رہا تو سانپوں جیسے موذی جانور کی ایکسپورٹ سے کیوں نہ بچا جائے۔ مختصر سی زندگی میں مجھے یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ ایک وکیل سے کوئی بھی میرے جیسا شریف انسان بحث میں پورا نہیں اتر سکتا۔ فوراً بولے۔ ”اوہ بللیا! میرا مقصد صرف پیسا کمانا نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ موذی کو نماز چھوڑ کر ماریے۔ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق اس ڈیل کا چیلنج، جذبۂ حب الوطنی اور پوری اسلامی اسپرٹ سے قبول کیا ہے۔ اول یہ کہ موذی کو اسلام دشمن گوری قوم کے ملک میں بھیج کر قیمتی زرمبادلہ کماؤ اور ملک وقوم کی خدمت کا حق ادا کرو، دوسرا بلکہ تیسرا فائدہ بھی کم اہم نہیں۔ انسان کے دشمن اس جانور کی ایکسپورٹ سے اپنے ملک کے بھائی محفوظ ہوجائیں گے...... جاؤ، تم تیاری کرو۔ کل نہیں تو پرسوں نکل جانا۔ عمرکوٹ کا اسسٹنٹ کمشنر راشد سومرو تمہارا منتظر ہے۔ آگے مٹھی اور نگرپارکر تک وہ اپنے اعتماد کے دو بندے تمہارے ساتھ بھیجے گا۔ وہ سب جانتا ہے۔ ایک دو سپیرے پابند کر رکھے ہیں۔ فی الحال صرف معاملات کا جائزہ لے کر واپس آجانا ہے۔“

بھائی جان ہر چند لمحوں کے بعد گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کے ہونٹ یوں خشک تھے جیسے دن بھر روزے سے رہے ہوں۔ چوالیس برس کی عمر میں وہ پچپن سے زیادہ کے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان پر نقاہت طاری ہو رہی ہے۔ کہنے لگے۔ ”میں خود چلا گیا ہوتا لیکن آج کل شوگر اور بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا۔ ملازم کوئی بھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتا اور پھر ممکن ہے مجھے خود سوئٹزرلینڈ جانا پڑے۔ یہاں کا کام تم سنبھالو گے۔“

پانی کا گھونٹ لے کر بھائی نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ سویٹی اندر آئی۔ اس کو کیا اشارہ دیا کہ فوراً سمجھ گئی اور ان کے بائیں پہلو سے لگ کر دراز کھولی۔ بی پی چیک کرنے کا آلہ نکال کر میز پر رکھا اور پروفیشنل ڈاکٹر کی طرح اسٹیتھسکوپ کانوں سے لگالیا۔ ظالم عورت جینز میں تباہی مچا رہی تھی۔ بھائی کی ریوالونگ چیئر کو ذرا سا اپنی طرف گھمایا۔ اپنا دایاں گھٹنا باس کے دونوں گھٹنوں سے مس کرتے ہوئے ان کی آستین کا بٹن کھولنے لگی۔ گو میں اس منظر کی تاب لانے کی پوری سکت رکھتا تھا لیکن پھر بھی اٹھ آیا تاکہ وہ پوری آزادی سے باس کا بلڈ پریشر چیک کرسکے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میرا بھائی بڑی تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چہرے کی جلد بے رس، بے جان اور قدرے ڈھلکی ہوئی سی۔ گندمی رنگت پر سیاہ چمکیلے چھدرے بال اور بھاری مونچھیں ذرا نہیں جچ رہی تھیں حالانکہ صبح منہ اندھیرے شبنم سے بھیگی گھاس پر ننگے پاؤں چلتے اور یوگا کی ورزشیں کرتے مگر دن کا آغاز ہی دوائیوں سے ہوا کرتا۔ کچھ عرصہ سے میں دیکھ رہا تھا کہ سوئٹی میں ان کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔

کاش انہوں نے اپنی گوناں گوں مصروفیات پر بھی نظرِ ثانی کی ہوتی۔ تمام تر جسمانی آزار کے باوجود کاروباری سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں۔ سپریم کورٹ میں ان کا داخلہ بند تھا، مگر وہ گاہے بہ گاہے لوئر کورٹس میں کسی نہ کسی مسئلے پر درخواست گزار دیا کرتے۔ روز کوئی نہ کوئی بیان داغ دیا کرتے اور اس کی مناسب اشاعت کے لیے اخبارات کے دفاتر میں جا کر تڑی لگایا کرتے۔ اکثر بے عزت ہوکر نکلتے۔ زیادہ تر کالے کوٹ اور کالی ٹائی میں دکھائی دیتے۔ لوگوں کو دبانے کی خاطر اپنی گاڑی پر ایڈووکیٹ کے بڑے نمایاں اسٹیکر لگا رکھے تھے۔ سرکاری ونجی دفاتر میں دندناتے ہوئے گھس جاتے مگر بعض مواقع پر رہی سہی عزت گنوا کر خلاصی ہوتی۔ اسلام آباد جی پی او والا ذلت آمیز سانحہ شاید میں قبر میں بھی نہ بھلا پاؤں۔ میں ان دنوں پانچویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ باہر کھڑکی پر کھڑے ہونے کے بجائے کاؤنٹر کے اندر چلے گئے اور رجسٹریشن کلرک کے سر پر کھڑے ہوکر تحکمانہ انداز میں ہدایات دینے لگے کہ مکتوب الیہ کا پتا رسید پر بہت خوش خط لکھے۔ نوجوان کلرک نے بے جا مداخلت کو برا محسوس کرنے کے باوجود حکم کی تعمیل شروع کردی مگر بھائی نے رسید پر معمولی سی کٹنگ ہونے پر بری طرح ڈانٹ دیا تو الٹی بلا گلے پڑگئی۔ اس نے رسید پھاڑ کر لفافہ باہر پھینک دیا اور غضب ناک ہوکر بولا۔

"Get out from my office, howyou dare to enter"

شور وغوغا بلند ہونے پر پورا عملہ متوجہ ہوگیا۔ کسی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”کیہی گل اوئے کیہی گل اے؟“ (کیا بات ہے او! کیا بات ہے؟)

کلرک نے چیختے ہوئے ساری بات بتائی تو وہ بول پڑا۔ ”پھڑ لو اوئے، پھڑ لو ایدھی......“ (پکڑ لو او، پکڑ لو، اس کی......)

پینڈو نے بھائی کو کالی ٹائی سے پکڑ کر کھینچنا شروع کردیا۔ میں کاؤنٹر کے باہر کھڑا زور زور سے رونے لگا اور دہائی دی کہ میرے بھائی جان کو چھوڑ دو۔ پینڈو نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا۔ فوراً نرم پڑ گیا اور بھائی کو چھوڑتے ہوئے بولا۔

”چھڈ دیو اوئے چھڈ دیو...... (چھوڑ دو او! چھوڑ دو) بچہ رو رہا ہے۔“ اور بھائی کے سینے پر زور کا دھکا مار کر کہا۔ ”جا اوئے دفع ہوجا۔ تجھے بچے کے طفیل چھوڑ دیا ہے۔“

بھائی نے آتے ہی مجھے تھپڑ مارا اور بازو سے کھینچتے ہوئے گاڑی میں لے گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر مزید تھپڑ مارے کہ میں نے رو کر راجوں کی بڑی بے عزتی کی ہے۔ شروع سے آج تک بھائی کا یہی وتیرہ رہا ہے۔ جب بھی کہیں سے بے عزت ہوتے، میری اور ملازموں کی کم بختی آجاتی۔

حیرت کی بات ہے کہ بھائی جیسی خسیس روح کہاں سے آگئی۔ پوٹھوہار کا مزاج گو عسکری ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ زیادہ تر لوگ زندہ دل، جی دار اور خوش مزاج بھی ہیں۔ مہمان نوازی اور یار باشی میں گھر اجاڑ دینے والے۔ میلوں ٹھیلوں کے شوقین، جب یہاں مفلسی کا راج تھا، تب بھی زندگی ہنستی مسکراتی تھی۔ ان کی ثقافت کے کئی رنگ ہیں۔ پوٹھوہار مانس کا مسکن، جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ دو کروڑ سال پہلے بھی اس خطے پر زندگی سانس لیتی تھی۔ بھائی جان وہ خود اپنی ذات کے لیے بھی باعثِ آزار تھے۔

مفتی صاحب جوں ہی دفتر پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے تو میں نے چند منٹ بعد ان کے گھر کا فون نمبر ملا کر صرف تین گھنٹیاں بجنے دیں اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد مسجد آگیا اور گاڑی میں بیٹھا رہا۔ دونوں بہنیں سامنے والی گلی میں داخل ہوتی نظر آئیں۔ تقریباً دس منٹ بعد شفق حجاب اور عبایا میں گلی سے نکلی اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ ہم روز اینڈ جیسمین گارڈن آگئے۔

شفق بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے تسلی دی اور کہا۔

”سندھ سے واپس آتے ہی بھائی سے دوٹوک بات کروں گا اور اگر وہ نہ مانے تو میں ان سے الگ ہوجاؤں گا۔ تم مجھ سے بے وفائی نہ کرنا۔ مجھے امید ہے، مفتی صاحب ہمارا ساتھ دیں گے۔ میں اب مزید تم سے دور نہیں رہ سکتا۔“

وہ کہنے لگی۔ ”میں تم سے بے وفائی کبھی نہیں کروں گی مگر مجھے ابا جی سے کوئی امید نہیں۔ جب سے وہ آپ لوگوں کے ملازم ہوئے ہیں، تمہارے بارے میں ان کی سوچ بدل گئی ہے۔ بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے، ذاتی مالی حیثیت کے حوالے سے سلطان بالکل ہی زیرو ہے۔“ لحظہ بھر کو خاموش رہی اور ایک نگاہ میرے چہرے پر

ڈال کر دوبارہ بولی۔ ''اباجی، تنگ دستی کی زندگی سے بڑے خوف زدہ ہیں۔ خود انہوں نے عمر کا بیشتر حصہ مشکل میں بسر کیا ہے۔ اولاد کے بارے میں وہ یہی چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل محفوظ ہو۔''

میرا دل بیٹھنے لگا لیکن میں بہ ظاہر مضبوط رہا۔ روش پر لوگ آجا رہے تھے۔ ہم دونوں ذرا سا ایک طرف ہٹ کر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔ ''شفو! مفتی صاحب کا خیال غلط ہے۔ بھائی جان نے جس سرمائے سے کاروبار شروع کیا، وہ ہمارا مشترکہ ہے۔ سی ڈی اے کی طرف سے ملنے والے معاوضے سے، جو آبائی زمین اور جائداد کے عوض ملا۔ ہر قانونی اور اخلاقی ضابطے سے میں برابر کا حصہ دار ہوں، تم فکر نہ کرو۔ سندھ سے واپس آتے ہی سب سے پہلے یہی مطالبہ کروں گا کہ میرا حصہ الگ کر دیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انکار کی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔ برادری اور رشتہ داروں نے اکثر میری توجہ اس معاملے کی طرف دلائی ہے لیکن اس سے پہلے میں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ بس یہ ہے کہ تم میرا ساتھ دو۔ اپنے والد صاحب سے کہو کہ وہ مجھ پر اعتماد رکھیں۔ تمہارے مستقبل کے بارے میں انہوں نے جو خواب دیکھے ہیں، میں تمہارے لیے آسائشیں مہیا کروں گا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے...... ایک بات اور...... تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں آخری حد سے بھی آگے نکل جاؤں گا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، مر جاؤں گا لیکن پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''
شفق کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ وہ خوشی کے تھے، حسرت و یاس یا کامل اطمینان کے، میں سمجھ نہیں پایا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے رخ روشن سے نقاب ہٹایا اور فوراً ڈھانپ لیا۔

میں زندگی میں پہلی بار سندھ آیا تھا، وہ بھی عمرکوٹ میں جہاں کے بارے میں اتنا پڑھ رکھا تھا کہ یہاں دربدری کے زمانے میں مغل بادشاہ ہمایوں رہا تھا اور اسی عرصے میں اکبر پیدا ہوا، جو بعد ازاں اکبر اعظم کے طور پر مشہور ہوا۔

اسسٹنٹ کمشنر اپنے حلقۂ اختیار میں بادشاہ ہی ہوتا ہے اور سومرو خاندان نے سندھ پر تقریباً ایک سو چالیس برس تک حکومت کی۔ لیکن راشد سومرو نے جس خلوص اور محبت سے میری میزبانی کی، میں اس کا گرویدہ ہوگیا۔ اس کا ہندو دوست ڈاکٹر پرکاش بھی اتنی ہی دلآویز شخصیت کا مالک ثابت ہوا۔ میرے میزبانوں کے عمومی رویے سے یوں گمان گزرتا، گویا ان کے نزدیک پوٹھوہار سے آئے ہوئے مہمان کو اہمیت دینے سے بڑھ کر کوئی معاملہ اعتنا کے لائق ہی نہ ہو۔ پرکاش، شکل صورت کے حوالے سے اپنے دوست راشد سومرو سے بھی زیادہ پرکشش تھا۔ لبوں پر ہر لحہ دھیمی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تاہم مجھے اس کی خوش مزاجی کے پس پردہ ایک مبہم سی اداسی تیرتی محسوس ہوا کرتی۔ میرا دل چاہتا کہ میں اس کے ساتھ بہت زیادہ باتیں کروں۔

میرے اصل میزبان، راشد سومرو کی شخصی خوبیاں بھی قابل قدر تھیں۔ وہ ہر بات کا جواب یوں بے تکلفی سے دیا کرتا جیسے مہمان سے کچھ بھی چھپانا ضابطۂ میزبانی کے خلاف ہو۔ پرکاش کے بارے میں میری جستجو کے جواب میں اس کے روبرو ہی بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا۔ ''دیکھیں! یہ میرا دوست سوختۂ جان عاشق ہے۔ کچھ نہ پوچھو۔ جن دنوں یہ کراچی ضیاالدین میں میڈیکل پڑھ رہا تھا، اس کے بڑے بھائی نے بے چارے کی محبوبہ کے ساتھ جلدی جلدی پھیرے ڈال لیے۔ لوگ کہتے ہیں، سچے عشق نے اس میں خاص شکتی بھر دی اور اڑنے والا سانپ بن کر لمحوں میں گھر پہنچ گیا۔ بھائی کو سہاگ رات بھی نہیں منانے دی اور اس کے ہونٹوں پر ڈس لیا۔ دلہن چھپر کٹ کے ایک کونے میں سمٹی بیٹھی رہی اور دلہا دیکھتے ہی دیکھتے نیلا ہوگیا۔ اب وہ بڑے چین سے ودھوا کی زندگی بسر کر رہی ہے اور میرے دوست نے عمر بھر کنوارا رہنے کی سوگند کھا رکھی ہے۔ ویسے دوسرا مفروضہ بھی غور طلب ہے۔ محترمہ کہتی ہیں۔ ایشور نے مجھے بنایا ہی پرکاش کے لیے ہے۔ کوئی اور کیسے چھو لیتا۔ پچھلے کئی جنموں میں ہم دونوں ایک تھے۔ اس جنم میں نہیں مل سکے تو کیا ہوا، اگلے میں سہی۔''

مجھے ان جانے میں گویا کوبرا نے ڈس لیا تھا اور زہر خون کی گردش کے ساتھ پورے بدن میں پھیل رہا تھا۔ میرے نیم والبوں سے کوئی ایک لفظ بھی ادا نہ ہو پایا اور یک ٹک انہیں دیکھے گیا۔ پرکاش کے روشن چہرے پر گو بدلی سی چھا گئی مگر ہونٹوں پر وہی دل فریب مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ سوگوار مردانہ وجاہت کا خوب صورت روپ میرے روبرو تھا لیکن دل جوئی کے وصف سے عاری میں پوٹھوہار کا باسی گنگ ہوا بیٹھا رہا۔ راشد سومرو نے ہاتھ بڑھا کر مجھے چھوا تو میں چونک گیا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ''کیا بات ہے سئیں! ادھر ہی ہو عمرکوٹ میں یا اسلام آباد پہنچ گئے ہو؟''

میں نے جھرجھری لی اور ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''حد ہوگئی......'' کوئی بات نہ سوجھی تو سر جھٹک کر رہ گیا۔ اپنی ذات میں گم ہوا سوچتا رہا۔ شفق کو امرتا پریتم سے عشق

اس کی پنجابی شاعری کا انتخاب ازبر کر رکھا ہے۔ شاید ان کے مابین آبائی مٹی کی سانجھ بھی ایک قدر مشترک ہو۔ لارنس جیسمین گارڈن میں ہونے والی آخری ملاقات کے اختتام پر جو مصرع سنایا تھا، یاد آگیا۔ دل ہی دل میں کہا۔ پہلا دوسرا ورق یاد بھی کر لوں تو کیا گارنٹی ہے۔ یہاں عشق پی ایچ ڈی کیے ہوئے صبر سے بیٹھ رہے ہیں۔ ایک بات رہ رہ کر نوک زبان پر آرہی تھی، بالآخر کہہ دی۔ ''ڈاکٹر صاحب سوگند توڑ کیوں نہیں دیتے۔ وہ ان کی محبت ہے، بھائی کی موت کے بعد کون سی رکاوٹ باقی رہ گئی۔'' ڈاکٹر نے لحظہ بھر کو میری آنکھوں میں دیکھا۔ غم کی پرچھائیں سی لہرا گئی، تاہم مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی بجائے سومرو نے جواب دیا۔

''یہ اس کے دھرم اور برادری کا معاملہ ہے۔ ہم جن دوستوں سے محبت کرتے ہیں، ان کے ذاتی معاملات اور خصوصاً عقائد کے حوالے سے سوال نہیں کرتے۔''

''اوہ!'' بڑی بے ساختگی سے یہ لفظ میرے لبوں سے پھسل گیا۔ واقعی، جن سے محبت اور دوستی کا رشتہ ہو، ان کے عقیدے پر بات نہیں کرنی چاہیے۔

پرکاش اس موقع پر پہلی مرتبہ بولا۔

''راجا صاحب! آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

میری پوٹھوہاری سرشت کو گویا تازیانہ لگا، پھٹ سے بول دیا۔ ''اپنی محبت کو پانے کے لیے گھربار اور برادری کو چھوڑنا پڑتا تو چھوڑ دیتا...... اور شاید انتہا سے گزر جاتا...... میرا مطلب......''

میں جو کچھ ذہن میں سوچ رہا تھا، مزید زبان پر نہ آسکا۔ سومرو کو پہلے مرحلے پر گویا حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر اس پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ پرکاش نے گردن جھکا دی اور اپنے حقیقی تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ چند لحظے خاموشی طاری رہی اور پھر سومرو بول پڑا۔ ''میں اللہ سے تمہاری خیریت کی دعا کرتا رہوں گا۔'' سومرو نے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور محبت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہم گھر آئے مہمان سے اختلافی معاملات پر بحث نہیں کیا کرتے بلکہ دکھ دینے والی باتوں کا ذکر چھیڑنا بھی گناہ تصور کرتے ہیں۔''

''ہاں! میں جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دامن میں میری محبت کے سوا زندگی کی کوئی اور خوشی سرے سے ہے ہی نہیں۔ میری عمر پانچ برس کے لگ بھگ تھی جب والدین وفات پا گئے۔ میں نے چوبیس پچیس برس کے عرصے میں اپنی محبوبہ کے سوا کسی انسان کے منہ سے اپنے لیے محبت کے بول نہیں سنے۔ تقریباً اکیس سال اس انمول جذبے کے لیے ترستے ہوئے گزارے ہیں۔ میں اپنی محبت کے لیے کوئی سی بھی قربانی دینے پر تیار ہوں۔''

ڈاکٹر پرکاش کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی اور وہ بول پڑا۔ ''میں نے Holy prophet کی پوری زندگی کے بارے میں بڑی تفصیل اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ پوری تاریخ میں مجھے ایک مثال نہیں ملی کہ انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ہر موقع پر حسن سلوک سے پیش آئے۔ لیکن اس ملک کا ماحول سراسر جذباتی ہے۔ میں مذہب بدل کر اکثریت کی آنکھوں کا تارا بن سکتا ہوں لیکن میرے اپنے لوگوں کا اعتماد کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارے سچے پریم کو بھی لاج لگے گی۔ میں نے اپنی محبوبہ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کر لیا ہے کہ ہم اگلے جنم میں ضرور ملیں گے......''

سندھی زبان بڑی میٹھی اور رسیلی ہے۔ اس کے کئی خوب صورت الفاظ کے مطالب و معانی سے وہاں آشنائی ہوئی۔ ملیر کا مطلب ہے، سرسبز و شاداب۔ عمرکوٹ کے قیام کا عرصہ طویل ہونے لگا تھا۔ محبت بھری محفلوں اور رت جگوں کے دورانیے میں وقفے وقفے سے دور نزدیک کے ایسے تمام اہم مقامات کے دورے مکمل کر لیے جہاں سے مطلوبہ چار اقسام کے سانپ وافر تعداد میں دستیاب تھے۔ اللہ ڈینو سپیرا سفر میں ہمراہ ہوا کرتا۔ موسم ہی ایسا تھا کہ صحرا کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ جابجا بچھے سبزے پر جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسراروں بھری اس دھرتی پر ٹولیوں کی صورت میں رنگ برنگے روایتی گھاگھرے پہنے، لمبے گھونگھٹ کاڑھے، عورتیں، صدیوں پرانی داستانوں کا کردار دکھائی دیتیں۔

عمرکوٹ سے منسوب مومل رانو اور عمر ماروی کی رومانی داستانیں بڑی مشہور ہیں۔ میری سوچیں عجیب رخ اختیار کر گئیں۔ اکثر خیال آتا کہ حسن و عشق کی اس سرزمین میں یقیناً کوئی خاص تاثیر ہوگی جو یہاں کے لوگ وفائیں نبھاتے ہیں۔ نہ جانے کس ظالم نے کب ہمارے علاقے کے بارے میں یہ بات کہہ دی جو ضرب المثل کی طرح مشہور ہوگئی کہ ''زمین ہموار نہیں، درخت پھل دار نہیں، موسم کا اعتبار نہیں اور لوگ وفادار نہیں۔'' ہم دوستوں سے اس

معاملے پر الجھ جایا کرتے اور کبھی چڑ بھی جاتے تھے۔

جانے کیوں یہ خواہش مجھے بے چین کرنے لگی کہ میں شفو کو یہاں عمر کوٹ لے آؤں۔ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ادھر ہی کہیں آس پاس رہ جائیں، ملیر نامی بستی میں، جہاں کبھی ماروی ہوا کرتی تھی۔ دو ماہ ہونے کو آئے تھے، تھر کی زمین نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ مجھے اب واپس لوٹنا تھا۔ تمام مطلوبہ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ان ہی دنوں خبر آئی کہ حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر کینوس کا تھیلا کھل جانے پر بہت سے زہریلے سانپ آزاد ہو کر پلیٹ فارم پر ادھر ادھر رینگنے لگے اور وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ مزید تفصیلات سے پتا چلا کہ راولپنڈی کا کوئی سپلائر باقاعدگی سے زہریلے سانپ اس علاقے سے حاصل کر کے نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد کے لیے بک کروایا کرتا ہے جہاں علاج کی خاطر ویکسین تیار ہوتی ہے۔ تقریباً دو مہینوں تک سپیروں کے ساتھ معاملات طے کرنے اور کئی طرح کے سانپ بار بار دیکھنے کے باوجود اس خطرناک جانور کا خوف میرے دل سے نکل نہ پایا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کوئلوں کی دلالی میں اگر ہاتھ منہ اور کپڑے کالے ہو سکتے ہیں تو سانپوں کے بیوپار میں موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ اتنی تعداد میں سانپ بھلا کہاں سے مل سکیں گے کہ بڑے پیمانے پر ان کی برآمد ہو سکے۔ بس یہ کہ بڑے بھائی کی ضد ہے، لہٰذا سندھ کا ایک چکر ہی لگانا ہوگا۔ لاحاصل سفر کر کے واپس لوٹ آؤں گا اور رپورٹ دوں گا کہ منصوبہ ناقابل عمل ہے۔ بدقسمتی سے میرے تمام مفروضے باطل ثابت ہوئے۔ سانپ بوروں کے حساب سے دستیاب تھے اور وہ بھی برائے نام قیمت پر پہلے سے ہی دھڑا دھڑ نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد کو سپلائی کیے جا رہے تھے۔

اللہ ڈینو سے میری خوب بے تکلفی ہو چکی تھی۔ میری مایوسی اور بے زاری کی وجہ پوچھنے لگا تو میں نے صاف صاف بتا دیا کہ دراصل مجھے سانپوں کی نقل و حمل سے خوف آتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے تھوڑی دیر بعد بول پڑا۔

''سئیں! ایک طریقہ اور بھی ہے..... مجھے اتنا تو پتا ہے کہ یہاں سے جو سانپ اسلام آباد اور باہر کے ملکوں کو جاتے ہیں، ڈاکٹر لوگ ان کا زہر نکال کر دوائی بناتے ہیں۔ تم خریدار سے، وہ ادھر کا ہے یا باہر ملک کا، صلاح کر لو کہ سانپ کی مصیبت میں خود کو مت ڈالو، جن چار نسلوں کے سانپ کا فوٹو تم نے دکھایا ہے، ان کا زہر الگ الگ بوتل میں، جتنا مانگو، ہم بالکل خالص دے گا۔ اس طرح ہماری روزی کھل جائے گی اور تم کو ذرا بھی مشکل نہیں پڑے گی۔''

بات بڑی معقول معلوم دیتی تھی۔ ہم دیر تک منصوبے کے اس پہلو پر غور کرتے رہے۔ اللہ ڈینو اپنے پیشے کے اعتبار سے خاصا ماہر اور پراعتماد ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کر دی۔ ''سئیں! میں جس بوتل میں کسی سانپ کا زہر محفوظ کروں گا، اس پر اسی کی نشانی لگی ہوگی۔ مغالطہ پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس تم اللہ پر یقین رکھو اور اس کام سے ڈر کر پیچھے نہ ہٹو۔''

شام کو اللہ ڈینو واپس آیا تو تھرموس کپڑے میں لپیٹ کر بغل میں دبا رکھا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی سی شیشی تھی، جس طرح کی انجیکٹ کرنے والی انگریزی دوا محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ بوتل تھرموس میں ڈال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''راجا سئیں! اس میں کوبرا کا زہر ہے۔ اتنے زہر سے دو اونٹ منٹوں میں مر سکتے ہیں۔ بالکل خالص ہے جدھر سے مرضی ہے، اس کو ٹیسٹ کراؤ۔ سانپ جتنے چاہو، مل جائیں گے اور زہر بھی بہت۔''

اگلے روز دس بجے کے قریب پتا چلا کہ راولپنڈی کا کوئی شخص ملنے آیا ہے۔ مجھے یہاں کون ملنے آ سکتا ہے، یہ سوچ کر حیرانی ہوئی۔ عجلت میں اپنے کمرے سے نکلا۔ وہ لگ بھگ چھ فٹ اونچا، خوب تنومند، درمیانی عمر کا قبول صورت شخص تھا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔

''میرا نام شاہد ہے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کا رہائشی ہوں۔ شروع سے ہی ہر سال نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز اسلام آباد کا ٹینڈر میرے نام کھلتا ہے..... اس لیے نہیں کہ ہیرا پھیری کرتا ہوں۔'' وہ ہنس پڑا اور دوبارہ بات شروع کی۔ ''میں کھلی کھلی بات کرنے کا عادی ہوں۔ سانپوں کے کاروبار میں ہماری پوری روٹین اور سیٹ اپ بنا ہوا ہے۔ اگر آپ نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز کے لیے تیاری کر رہے ہیں تو اگلے سال نیا ٹینڈر کھلنے تک انتظار کریں۔ وہاں ہمارا اور آپ کا کھلا مقابلہ ہوگا۔ گڈ لک۔ ہاں! کوئی اور آرڈر ہے تو ہماری خدمات اور تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ جتنی تعداد میں جہاں آپ چاہیں، مال آپ کو پہنچایا جا سکتا ہے۔''

سانپوں کی نقل و حمل کے حوالے سے میری سوچوں میں کئی اڑچنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کاروبار سے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی لیکن یوں ہی تبصرہ کر دیا۔

''یہ کام بڑا خطرناک ہے۔ اس میں کئی طرح کے

خطرات ہو سکتے ہیں۔ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ کل دو روز پہلے کی خبر ہے کہ آپ کی کنسائنمنٹ میں سے کوئی سانپ کھل گیا اور زہریلے سانپ پلیٹ فارم پر نکل گئے۔ زہریلا جانور ہے، ایک دوسرے کو کاٹ کر ختم کر سکتے ہیں۔''

شاہد کے لبوں پر بڑی واضح مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کو ہنسی آ رہی ہے۔ حیرت بھی ہوئی کہ پہلے وہ بڑی بے تکلفی سے ہنستا رہا ہے، اب کیا امر مانع ہے، کہنے لگا۔ ''یہ بڑا شریف جانور ہے، انسانوں کی طرح لڑائی جھگڑا بالکل نہیں کرتا اور کھاتے بھی خوب ہیں۔''

اس نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی لیکن ہنسی چھوٹ گئی۔ قدرے توقف سے بولا۔

''آئی ایم سوری۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ آپ کو فی الحال سانپوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ یہ جاندار کئی مہینے بغیر کھائے زندہ رہ سکتا ہے..... میں نے اسی لیے پیشکش کی تھی کہ مال پہنچا کر دیں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ مال جانا کہاں ہے؟''

بھائی کے ساتھ رہ رہ کر میں اتنا اچھی طرح جان گیا تھا کہ کاروباری راز کو کسی پر افشا نہیں کیا جاتا اور پھر وہ اس حوالے سے مجھ پر جا بے جا سختی بھی کیا کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ ڈینو یا میرے میزبانوں کو بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ تاہم شاہد کو اتنا ہی کہا۔ ''میں یہاں صرف معلومات اکٹھی کرنے آیا تھا۔ تفصیلات کے بارے میں معلوم نہیں۔ اسلام آباد جا کر بھائی جان کو آپ سے رابطہ کرنے کا کہوں گا۔ آپ اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیں۔''

وہ ذرا سا چونک گیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ لحظہ بھر بعد بولا۔ ''اسلام آباد!..... کیا نام ہے آپ کے بھائی جان کا؟''

میں نے بھائی جان کا نام بتایا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ کہنے لگا۔ ''کمال ہے..... تین ماہ پہلے راجا سخی بہادر ڈیزوکیٹ سے میرا باقاعدہ معاہدہ ہوا ہے۔ ریٹ طے ہیں، صرف اتنا معلوم کرنا باقی ہے کہ کنسائنمنٹ کراچی دینی ہے یا اسلام آباد..... پھر آپ کو یہاں کس لیے بھیج دیا؟''

ذرا سا توقف کر کے اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ بائی روڈ آئے ہیں؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا تو اسے مزید حیرانی ہوئی، کہنے لگا۔

''کمال کر دیا، آج کل ہائی وے پر اتنے ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ حالات بہت خراب ہیں۔ کتنے ہی لوگ قتل ہوئے اور تاوان کے لیے اغوا کر لیے گئے۔''

بہ ظاہر میں آرام سے بیٹھا ہوا تھا مگر اس انکشاف پر اندر سے ہل کر رہ گیا کہ جب معاہدہ ہو چکا ہے تو مجھے کس جرم کی سزا کے طور پر گھر سے نکالا اور وہ بھی سڑک کے ذریعے تن تنہا قیمتی کار پر طویل سفر کرنے پر مجبور کیا۔

ہمارے پاس زیر بحث موضوع پر مزید بات کرنے میں دلچسپی رہی نہ معقول جواز۔ مہمان نے خود ہی رخصت چاہی اور الوداع ہوتے ہوئے مسکرا کر روایتی جملہ ادا کیا۔ ''انشاء اللہ ملاقات ہوگی، اپنے شہر میں۔''

ڈاکٹر پرکاش کے ہاں میری آخری دعوت ہوئی۔ کیا کمال کے لوگ تھے سب۔ شاید میری روح محبت کی پیاسی تھی اس لیے محبت آمیز سلوک اور تپاک فراواں دل میں اتر جایا کرتا۔ تمام تر مدارات کے بعد پرکاش نے مجھے ایک پیکٹ دیا اور کہا۔ ''اس میں ہماری ہونے والی بھابی کے لیے ایک پوشاک ہے.....'' اس کے لبوں پر پھیلی افسردہ مسکراہٹ مزید نمایاں ہوئی اور بولا۔ ''سندھی کڑھائی کا نمونہ ہے۔ میری ودھوا بھابی نے تب اپنے لیے بڑے شوق سے بنایا تھا، جب میں میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ کہتے ہیں، سال بھر کی نظر اور دماغ سوزی کا حاصل ہے یہ عروسی جوڑا۔ مگر جوں کا توں پڑا رہ گیا۔''

مزید کچھ کہنے کا یارا رہا نہ رہا، مجھ میں سننے کی تاب نہ تھی۔ میں شکریہ کا لفظ بھی نہ بول سکا۔ یہ لفظ اس انمول تحفے کے مقابلے میں بہت بے وقعت ہو کر رہ گیا..... میں نے پرکاش کو سینے سے لگا لیا۔ جانے کیوں میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ حالانکہ ہم پوٹھوہاری، سخت جان ہی نہیں اکثر سخت دل بھی ہوتے ہیں۔ اللہ جانے، محبت کے جذبے میں کیا تاثیر ہے کہ پتھر کی کیمسٹری تبدیل ہونے لگتی ہے اور موم کے مانند نرم ہو جاتا ہے۔ سومرو نے مجھے اجرک اور سندھی ٹوپی کا تحفہ دیا۔

میں جلد از جلد واپس اسلام آباد پہنچنا چاہتا تھا لیکن کوئی معجز نما اسم اعظم یاد نہیں تھا جس کے طفیل گاڑی کے پر نکل آتے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مارگلہ کے دامن میں بسے کنکریٹ اور لوہے کے عظیم الشان شہر کی کسی ویران سڑک پر لینڈ کر جاتی۔ تمام سفر کے دوران میں ایک ہی سوچ غالب رہی کہ میرا اکل کھرا بھائی کیا سلوک کرے گا۔ مجھے میرا اجائز حصہ دے گا یا وہی تخریبی ذہن رکھنے والا وکیل پوری ڈھٹائی سے خم ٹھونک کر سامنے آ جائے گا۔ یہ عقدہ مجھ پر کسی طور پر کھل نہیں پا رہا تھا کہ بھائی نے مجھے کس مقصد کے لیے اتنے

ڈور دراز سفر پر بھیجا جبکہ متعلقہ معاملات اس نے شاہد کے ساتھ پہلے سے طے کر رکھے تھے، تاہم میرے لیے یہ سفر اس حوالے سے وسیلۂ ظفر ثابت ہوا کہ مجھے بہت اچھے دوست مل گئے اور پھر ماروی کا دل نواز تصور ہمہ وقت میرے ساتھ ساتھ رہا جس نے اپنے محبوب کی خاطر دنیاوی شان وشوکت ہی نہیں ٹھکرائی، بلکہ قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

نسبتاً مختصر روٹ اختیار کرتے ہوئے میں فتح جنگ پہنچ گیا۔ بھائی کی سرشت کے منفی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی جانب سے متوقع بدترین سلوک کی صورت میں اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگا۔ کل کاروبار میں سے صرف گاڑیوں کا شوروم ہی شروع سے میری نگرانی میں چلا آرہا تھا۔ راجا موٹرز کی سیل ایک دو روز تک میں اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا جو بعض اوقات چار پانچ لاکھ تک بھی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ خاصی معقول رقم تھی جس سے کہیں بھی عملی زندگی کی شروعات کی جاسکتی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ بھائی راہ راست پر نہ آیا تو عقل مندی کا تقاضا ہے کہ میں اس کو مشتعل کرنے کے بجائے سرِ تسلیم خم کردوں اور اتنی رقم ہاتھ آنے پر چپکے سے کسی روز شفو کو ہمراہ لے کر سندھ کی طرف نکل جاؤں جہاں ماروی کے دیس میں امن اور محبت کی چھاؤں میں باقی کی زندگی بسر کردوں۔

ترنول کی جانب سے دن کے تقریباً ساڑھے دس بجے اسلام آباد کے بے وفا شہر میں داخل ہوا جو مفلوک الحال عوام کے جسدِ ناتواں سے بوند بوند خون نچوڑ کر پروان چڑھا۔ یہاں سے صرف حکمرانوں اور افسر شاہی کو مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ شاہراہ کشمیر پر گولڑہ چوک میں پھوپی زاد بھائی راجا افراسیاب کو کھڑے دیکھ کر گاڑی روک لی اور انہیں بٹھا کر دوبارہ چل پڑا۔ ان سے پتا چلا کہ پھوپو ڈیڑھ مہینا سے بہت بیمار ہیں۔ علاج میں کسر نہیں چھوڑی اور دعائیں بھی خوب کیں۔ پھوپو کی تیمارداری مجھ پر واجب ہوگئی تھی۔ ویسے بھی افراسیاب بھائی کو گھر ڈراپ کرنے جانا ہی تھا۔ راستے میں انہوں نے میرے بڑے بھائی کے بارے میں گفتگو شروع کردی۔ وہ شروع سے ہی انہیں پھیپر کہا کرتے تھے۔ یعنی پھن والا۔ کہنے لگے۔ ”پھیپر گزشتہ دو اڑھائی ماہ سے اپنی مکمل اوور ہالنگ کروا رہا ہے۔ اسلام آباد کے سب سے مشہور امریکا پلٹ ڈاکٹر سے جو بے اولاد جوڑوں کا گارنٹی کے ساتھ علاج کرتا ہے۔“ چہرے کا رخ میری طرف موڑتے ہوئے مسکرائے اور دوبارہ بولے۔ ”مفت بری کرتے کرتے سب انجر پنجر ڈھیلے کروا لیے۔ اسی لیے اتنا ہائی پیمانے پر علاج کروانا پڑا ہے۔ مجھ نہیں آرہی، اتنا مال کیوں خرچ کر رہا ہے۔ بیوی بچوں کا روگ پالنے والا وہ بندہ ہی نہیں۔“

لمبے سفر کی تھکن سے میری آنکھیں، ذہن اور جسم بوجھل ہوا پڑا تھا لیکن اس نئے انکشاف پر میں چوکس ہوگیا۔ اسی دوران ہم پھوپو کے گھر پہنچے تو پھوپو نے گلے لگایا، منہ چوما اور آنسو بہاتے ہوئے اتنی دعائیں دیں کہ میری تھکن دور ہوگئی۔ کہنے لگیں۔ ”مھاڑا پتر (میرا بیٹا) سلطان دنیا پر بادشاہی کرے گا۔ لمبی حیاتی ہوگی۔ زندگی میں ہر خوشی دیکھے گا اور اس کے دشمن برباد ہوں گے۔“ رخصت ہوتے ہوئے میں نے پھوپو کے گھٹنے چھوئے تو انہوں نے میرے ہاتھ چوم لیے۔ گاڑی میں بیٹھا تو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے جسم میں نئی توانائی عود کر آئی ہے۔

راستے میں یہی سوچتا آیا تھا کہ اسلام آباد پہنچ کر سب سے پہلے شفو کو ملنے کی تدبیر کروں گا لیکن میرا ذہن کوئی واضح اشارہ نہیں دے رہا تھا کہ کیا صحیح ہوگا اور کیا غلط...... یہی مناسب خیال کیا کہ پہلے سیدھا گھر جاؤں، تھوڑا سا کھانا کھاؤں اور لمبی نیند لوں، جب تک دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہوکر بھائی جان واپس گھر نہیں لوٹ آتے۔ کل ہفتہ وار چھٹی ہے۔ رات کو اگر وہ پوچھیں تو صرف عمرکوٹ کی رپورٹ پیش کردوں۔ ان کے مزاج کا جائزہ لوں اور جہاں تک ممکن ہو، اپنے لائحہ عمل پر ٹھنڈے دل سے مزید غور کروں۔ البتہ شاہد سے ہونے والی ملاقات کا ذکر یوں سرسری انداز میں کردوں، گویا میں واقعی بلبلا ہوں اور بڑے بھائی کے بارے میں مجھے کوئی بدگمانی نہیں۔

گھر پہنچتے ہی غسل کیا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ جھلملاتے، مسکراتے اور مہکتے لمحات نے مجھے پیار سے تھپکتے ہوئے بہت جلد گہری نیند سلا دیا۔ کوئی خوب صورت خیال تھا، دل ودماغ سے لپٹا ہوا یا سندر سپنا، یوں گمان ہونے لگا جیسے شفو اور میں ازدواجی رشتے میں جانے کب سے منسلک ہیں اور لمحۂ موجود میں اس کے دم سے میرا پہلو آباد ہے۔ سوتے جاگتے کی سی کیفیت طاری تھی کہ لاؤنج کی طرف سے آواز سنائی دی۔ ”اوئے شعبان! بلبلا کب سویا تھا؟“

”راجا جی! بارہ بجنے والے تھے، جب وہ کھانا کھا کر کمرے میں گئے۔“ خانساماں نے جواب دیا۔

”شمروز سے کہو، اس کو جگا کر برتن لگائے اور تم چھٹی کرو۔“ بھائی کی تحکمانہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں نے

پہلو میں بازو پھیلایا اور بستر پر جہاں تک رسائی ممکن ہوسکی، ہاتھ پھیرتا رہا۔ خود کو تنہا پایا۔ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا اور سائڈ لیمپ روشن کردیا۔ اس اثنا میں شمروز نے دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکا اور واپس ہولیا لیکن کواڑ نہیں بھیڑے۔ لاؤنج میں پڑے ٹی وی پر نو بجے کا خبرنامہ جاری تھا۔ تازہ دم ہونے کے لیے میں واش روم چلا گیا۔

کھانے کی میز پر میں نے تھرپارکر کے دورے کی چیدہ چیدہ باتیں بتادیں اور شاہد سے ہونے والی ملاقات کا ذکر بھی کردیا۔ بھائی نے مجھے لمحہ بھر کو غور سے دیکھا مگر اپنے حقیقی ذہنی تغیر کو حسب معمول چھپا گئے۔ کہنے لگے۔ ”معاہدہ میں نے سوچ سمجھ کر اپنی شرائط پر کیا ہوا ہے۔ اب دیکھ لیں گے کہ اس نے ہماری لاعلمی سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا۔“ بھائی کے پاس ہر سوال کا گھڑا گھڑایا جواب تھا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے شمروز نے چائے کے برتن لاؤنج میں لا رکھے اور ایک استفہامیہ سی نگاہ اپنے آقا پر ڈالی تو انہوں نے ہاتھ جھلا کر گویا چھٹی کرنے کا عندیہ دے دیا۔ ہم دونوں بھائی اکیلے رہ گئے۔ میں نے اس دوران میں کئی بار نظریں چرا کر بھائی کے چہرے اور جسم کا جائزہ لیا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر نظر آرہے تھے۔ طے کرلیا کہ صبح ناشتے کے بعد بات کروں گا۔ خدانخواستہ معاملہ ہتھے سے اکھڑتا نظر آیا تو اشتعال میں آنے کے بجائے متبادل راستہ تلاش کروں گا۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ بھائی بول پڑے۔ ”تمہاری غیر موجودگی میں اپنے اور تمہارے بارے میں بڑے اہم فیصلے کیے ہیں۔ آج دوپہر کو تمہارے گھر پہنچنے کی اطلاع مجھے دفتر میں دی گئی تو میں نے اسی وقت مفتی صاحب کو بلا کر کل گیارہ بجے کا وقت مقرر کرلیا۔ تمہیں سرپرائز دینے کے لیے میں نے پہلے نہیں بتایا کہ ان کے گھر تمہارا رشتہ کرچکا ہوں۔ کل بڑی سادگی نکاح سے ہوگا۔“

لبوں تک آیا ہوا پیالہ سنبھالنا محال ہوگیا۔ لگا جیسے چھلک ہی گیا ہے۔ پورا جسم خصوصاً دایاں بازو لرزنے لگا۔ پیالہ واپس طشتری میں رکھا تو قدرے زور سے، یوں جھنکار سنائی دی، گویا لمحہ بھر کو الارم بج کر بند ہوگیا ہو۔ دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا کہ مجھے اس کے فیل ہونے کا خدشہ لاحق ہوگیا۔ فوری طور پر یقین نہیں آیا۔ شک گزرا کہ سننے میں مغالطہ ہوا ہے۔ مگر الفاظ بڑے واضح تھے۔ وہ اب بھی کچھ بولے جارہے تھے۔ رشتہ داروں اور برادری کے بارے میں کہ لوگ اچھے نہیں۔ کسی کو دعوت نہیں دی۔ ولیمہ کی دعوت ایک ہفتے کا وقفہ ڈال کر فائیو اسٹار ہوٹل میں دیں گے۔ صرف ہائی جینٹری بلائی جائے گی۔ مفتی صاحب سفید پوش ہیں۔ میں نے جہیز کے لیے سختی سے منع کردیا ہے۔ ظاہر ہے، جو چیز بھی وہ دیں گے، سب اسٹینڈرڈ کی ہوگی، کہاں رکھیں گے۔ بیوی کو باندی بنا کے رکھنے کا یہ بہترین نسخہ ہے کہ اس کو میکے سے ایک پیسے کی چیز بھی لانے کی اجازت نہ دی جائے۔

مجھ پر طاری اضطرار میں قدرے تخفیف ہوتی محسوس ہوئی تو دل میں بے اختیار خواہش بیدار ہونے لگی کہ اٹھ کر بھائی سے لپٹ جاؤں۔ بوسے لوں اور ہاتھ چوموں، روؤں گڑگڑاؤں اور پاؤں پکڑ کر معافیاں مانگوں۔ میں ان کے بارے میں کیا سوچتا رہا اور وہ واقعی حقیقی باپ کی طرح شفیق اور دم ساز ثابت ہوئے۔ فرطِ جذبات سے میرا دل بھر آیا وہ کہہ رہے تھے۔ ”میں نے اپنی آرگنائزیشن سے فی میل اسٹاف کو فارغ کردیا ہے۔ سوئٹی بڑے اونچے خواب دیکھنے لگی تھی۔ داناؤں نے بہت صحیح کہا ہے کہ عورت ذات پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے دل کو بھیڑیے کے بھٹ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ دل بستگی کے سامان سے زیادہ اہمیت کبھی نہ دو۔ عورت اور گھوڑا، ران تلے دبا کے رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ مرد کی چالاکیاں جہاں ختم ہوجاتی ہیں، عورت کا مکروفریب وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے آنسوؤں سے کبھی دھوکا نہ کھا جانا۔“

عورت کے بارے میں بھائی کے فرمودات میرے دل پر گراں گزر رہے تھے۔ میں بھلا شفو کے ساتھ اس طرح کا ناروا سلوک کیسے کرسکتا ہوں۔ وہ میری محبت ہے۔ ناز نخرے دکھائے تو سہی۔ میں خندہ پیشانی سے کیوں نہ اٹھاؤں۔ دل کی ملکہ کو باندی بنا کر کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ یہ تصور ہی میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ بحث مباحثے اور حجت بازی میں میرے جیسا کوئی بھی شریف انسان، وکیل سے نہیں جیت سکتا۔ بھائی نے غافل پا کر مخاطب کیا اور بولنے لگے۔

”میں نے تمہیں رشتہ داروں کے ساتھ میل جول رکھنے سے کئی بار منع کیا ہے لیکن تم چوری چھپے انہیں ملتے ہو۔ برادری کے کچھ بزرگ فارغ ہیں اور اب بیٹھے بٹھائے کھانے کو ملنے لگا ہے، اس لیے ان کو شرارتیں سوجھنے لگی ہیں۔ میں اردگرد سے غافل کبھی نہیں رہا اور اپنے سے متعلقہ ہر معاملے پر نگاہ رکھتا ہوں۔ وہ سب باہم صلاح مشورہ کر رہے ہیں کہ جرگہ کی صورت میں مجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تمہارا حصہ الگ کردوں۔ ماما بنارس تجھے گمراہ کرسکتا ہے۔ ہماری ماں نہ رہی تو اس کے بھائی سے کیا رشتہ رہ گیا۔ وہ بوڑھے شیطان کا رول ادا کر رہا ہے۔ اگر تم نے ان کو حمایتی بنایا ہے تو سن لو۔ جو رقم ابا جی نے

دی تھی، وہ پائی پائی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا سرکاری ریکارڈ بھی موجود ہے۔ اتنی رقم میں نے تم پر پانچ سال میں خرچ کر دی تھی۔ تعلیم، رہائش، خوراک لباس اور دیگر ضروریات پر۔ باقی کے سولہ سترہ سال جو تمہاری کفالت کی ہے، وہ صرف صلۂ رحمی کے جذبے سے کرتا رہا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت کوئی شیطان تمہیں بہکا سکتا ہے، اس لیے پورا حساب رکھا ہوا ہے۔ چاہو تو اکاؤنٹنٹ مجید کے پاس ایک نظر دیکھ لینا۔ لاکھوں روپے بنتے ہیں۔ دنیا کا کوئی قانون بڑے بھائی کو پابند نہیں کرتا کہ وہ زیرِ کفالت بھائی کو اپنی ذاتی جائداد میں سے حصہ بھی دے.....''

میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہی بھائی جو چند ہی لمحے پہلے شفقت و محبت کا پیکر بنا، مہربان فرشتہ دکھائی دے رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر پر سینگ نکلے اور جبڑے سے نوکیلے دانت جھانکنے لگے۔ وہ ہیبت ناک ابلیس کا روپ اختیار کر گیا۔ دل سے التجا بلند ہوئی۔ اے اللہ! میں اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مالی معاملات اور جھگڑوں میں آج تک اس سے کوئی بھی نہیں جیت سکا۔ میں یہ تسلیم کر لوں کہ بچپن میں چونکہ یتیم ہو گیا اس لیے تہی دست ہوں۔ سردست زندگی کی سب سے بڑی خوشی اتنی آسانی سے مل رہی ہے تو دامن دل میں سمیٹ لوں۔ وقت کا انتظار کروں اور جب بھی مناسب موقع ملے، بیوی کو ہمراہ لے کر اس خوفناک عفریت کے چنگل سے نکل بھاگوں۔

شیطانی آواز ایک بار پھر میرے دماغ میں چھید کرنے لگی۔ ''تم میرے لاکھوں کے مقروض ہو مگر میں بڑا بھائی ہونے کے ناتے تقاضا نہیں کروں گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہم دونوں بھائی ہمیشہ اکٹھے رہیں۔ اس طرح تم ہر دستیاب نعمت سے برابر لطف اندوز ہوتے رہو گے۔ تمہیں میں نے سگی اولاد کی طرح پالا ہے۔ اسی لیے گھر نہیں بسایا۔ دل سے وعدہ کر رکھا تھا کہ دونوں بھائی اکٹھے شادی کریں گے۔ زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ میرے مخلص ہونے کا اتنا ہی ثبوت کافی ہے کہ جس گھر سے میں نے شادی کی اسی سے کل تمہاری بیوی لا رہا ہوں۔ تمہارے عمرکوٹ روانہ ہونے کے ایک ہفتہ بعد میں نے مفتی صاحب کی بڑی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا لیکن رخصتی موخر کر دی۔ طے یہ ہوا کہ تمہارے واپس آنے پر دونوں بہنیں ایک ساتھ دلہن بن کر ہمارے گھر میں آئیں۔ کل ہم دونوں بھائیوں کی سہاگ رات ہے۔ میں اپنے ہر امتحان میں پورا اترا ہوں۔ مفتی صاحب کے کچھ تحفظات تھے جو میں نے پورے کر دیے۔

دونوں بہنوں کے نام ایف سیون والی کوٹھیاں لکھ دی ہیں۔ واضح شرط کے ساتھ کہ وہ جب تک ہماری بیویاں رہیں گی، اس جائداد کی حق دار ہیں۔ کہاں جائیں گی کوٹھیاں!..... اور ہاں! ولیمے کے بعد میں بیوی کے ہمراہ ہنی مون منانے یورپ چلا جاؤں گا، دو چار ماہ کے لیے۔''

ہیروشیما اور ناگاساکی پر الگ الگ وقفے سے ایٹم بم گرائے گئے تھے۔ مجھ پر ایک ساتھ دونوں بم گرے اور میری ہستی خاکستر ہو گئی۔ بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں سونے جا رہا ہوں، تم بھی جاؤ اور خوب میٹھی نیند لو۔ کل بڑے کام ہیں۔''

کلاک پر گیارہ بجے تھے۔ بھائی کے بیڈروم کی روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ مجھ سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جیسے ٹانگیں مفلوج ہو گئی ہوں۔ میرا ذہن اندھا، گونگا اور بہرا ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر پرکاش کا چہرہ نظروں کے سامنے سے ہٹ نہیں رہا تھا جس کی محبوبہ اس کی غیر موجودگی میں بھابی بنی اور دو دھوا ہوئی۔ دونوں اگلے جنم میں ملن کی آس میں یہ جنم گنوا رہے ہیں۔ میری زندگی کی واحد خوشی مجھ سے چھن گئی تو کیسے کٹے گی۔ کاش! یہ رات پورے جنم پر محیط ہو جائے۔ مگر قانون قدرت کے خلاف کچھ بھی ہونا ممکن نہیں۔

بھائی کی ساری گفتگو میں نے حسب عادت بغیر ایک لفظ منہ سے بولے، خاموشی سے سنی تھی۔ یہی طرزِ عمل ہمیشہ میرے حق میں بہتر رہا ہے۔ جب بھی کوئی عذر پیش کیا، خواہ کتنا ہی جائز کیوں نہ ہوا، بڑی سخت ڈانٹ پڑی۔ میں یہی سوچتا آیا تھا کہ اشتعال میں نہیں آؤں گا تاکہ بدترین حالات میں بھی کوئی متبادل حل سوچ سکوں لیکن ایسا تو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا تھا کہ میرا بھائی میری محبت ہی لوٹ کر لے جائے گا۔ جس طرح وہ کئی جھوٹے مقدمے بھی جیت گیا۔ کچھ کرنا ہوگا، مجھے سوچنا چاہیے۔ ہمت ٹوٹ گئی تو مارا جاؤں گا۔ ہر حال میں خود کو سنبھالنا ہے تاکہ سب ہوئے پڑے جسم کی توانائی کسی طرح بحال ہو۔ نصف رات ابھی باقی ہے اور بھائی کی سہاگ رات آنے میں کم و بیش بیس گھنٹوں کا وقفہ حائل ہے۔ زندگی کی بقا کے لیے کبھی کبھی چند لمحے ہی کافی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس وقت گھر میں ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ صرف ایک چوکیدار ہے جو صبح تک گیٹ کے باہر پہرا دیتا ہے۔ لگے بندھے معمول کے مطابق وہ فجر پڑھ کر گارڈ روم میں سو جائے گا۔ صبح تقریباً ساڑھے سات بجے شعبان آ جائے گا۔ وکٹ گیٹ کی چابی اس کے پاس ہوتی ہے۔ شمروز اس کے ہمراہ ہوگا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے

وقفے سے مالی اور ڈرائیور آ جائیں گے۔

دو تین گھنٹے میں چپ چاپ باہر لان میں ٹہلتا رہا۔ پھر واپس آ کر ٹیلی فون سیٹ اپنے کمرے میں لے آیا۔ مفتی صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا ہی تھا کہ دوسری جانب گھنٹی بجنے کی گویا نوبت ہی نہ آئی اور ہینڈ سیٹ اٹھا لیا گیا۔ دبی دبی آواز سنائی دی۔ ''سلطان! میں مر جاؤں گی۔'' سسکیاں سنائی دیں اور اس نے امرتا پریتم کا شعر پڑھا۔ ''دے میں تڑکے گھڑے دا پانی، کل تک نہیں رہنا۔''

میں نے اتنا ہی کہا۔ ''شفو! اگر میں صبح تک زندہ رہا تو تم نہیں مرو گی..... میں مر گیا تو جو جی میں آئے کرنا۔ میں تڑختا ہوا گھڑا دل کے نہاں خانے میں محفوظ کر لوں گا۔ ایک بوند بھی نہیں گرے گی۔ مقدر نے میرے دامن میں سوائے تمہاری محبت کے کچھ بھی نہیں ڈالا۔ شاید میں نے اب بھی صبر کر لیا ہوتا، اگر بھائی کے دل میں انسانیت کی ذرا سی رمق بھی ہوتی، تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ وہ عورت کے بارے میں کیسے تصورات رکھتا ہے۔ تمہارے باپ نے تمہیں دہکتے ہوئے دوزخ میں دھکیلا ہے۔''

شفق نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''باپ کی محبت سے میرا اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ بہ ظاہر پرکشش شخصیت کا مالک اندر سے اتنا کمزور اور مفلسی کی زندگی سے خوفزدہ..... دونوں کوٹھیوں کے کاغذات ہمارے سامنے رکھ دیے اور خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اپنی بیٹیوں سے شدید محبت کرنے والا باپ ایسے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ کروڑوں اربوں کی جائداد کے وارث چھڑے چھانٹ سگے بھائی، جن کے ساتھ رشتوں کا کوئی جھمیلا ہی نہیں۔ تقدیر نے تم دونوں بہنوں کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا ہے۔ میں نے نکاح نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تو ابا نے چھری سے اپنی کلائی زخمی کر لی.....''

لائن یک لخت بے جان ہو گئی۔ میں نے صرف دو مرتبہ ''ہیلو'' کہا اور ہینڈ سیٹ رکھ دیا۔ ٹیلی فون سیٹ لا کر لاؤنج میں اسٹینڈ پر رکھا اور بھائی کے بیڈروم کا دروازہ ذرا سا دھکیلا۔ وہ حسب معمول اندر سے بند تھا۔ بھائی دروازہ ہمیشہ اندر سے بند کر کے سوتا ہے۔ لیکن مجھے سختی سے حکم دے رکھا ہے کہ دروازہ کھلا رکھا کروں۔ ایک بار پھر لان میں نکل آیا۔ رات کے پچھلے پہر کی خوشگوار خنک ہوا بدن میں سرایت کرنے لگی۔ مخملیں گھاس پر لیٹ کر لمبے سانس لیے اور ذہن کو یکسو کرنے لگا۔ میرے اردگرد ملیر آباد ہونے لگی، ماروی کی بستی، جسے تھرپارکر نے محیط کر لیا، وہ ڈاکٹر پرکاش کا دیس ہے جہاں کی ودھوا اسلام آباد کی شفو کے لیے اپنی قیمتی متاع بہ طور

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
سرگزشت
ماہنامہ
جنوری 2013ء کی جھلکیاں
سمندر کے مکیں
ایک حیرت انگیز اطوار کے حامل قبیلے کا تذکرہ
زور آور
عشق میں ڈوبے پہلوان کی دلچسپ سرگزشت
سینڈی
امریکا میں آئے طوفان کی حقیقت کا پرلطف جائزہ
میں زخم زخم ہوں
عبرت بھری سچ بیانی کہ اسے اپنوں نے ہی زخم دیا
اور کئی علاوہ
فلمی الف لیلہ، سراب اور دنیا بھر سے سچے واقعات دلچسپ روداد یں
ہر شمارہ خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں
خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

تحفہ بھجوا دیتی ہے۔ لوہے کنکریٹ اور تارکول سے بسایا گیا بے حس اور بے وفا شہر جس کے سخی بہادر ایڈووکیٹ، نکاح کی آڑ میں عورتوں کو باندیاں بنا لیتے ہیں۔

فجر کی اذان خاموش فضا میں بلند ہوئی اور گارڈ روم کے دروازے کا کھٹکا سنائی دیا۔ میں نے لیٹے لیٹے نگاہوں کا رخ بدلا اور چوکیدار کرنیل خان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ پوٹھوہار میں کئی والدین بیٹوں کے نام اسی طرح کے رکھتے ہیں۔ کرنیل خان نماز پڑھ کر رات کا رکھا ہوا کھانا کھا کے سو جائے گا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بھی آج وضو کر کے نماز پڑھوں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں۔ وہ دلوں کے حال جانتا ہے، اس کو اپنی سابقہ اور مجوزہ لغزشوں کا جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ عاجزی سے گڑگڑانا اور اظہار ندامت کرنا ہی کافی ہے۔

ایک نماز چاہے کتنے ہی خشوع خضوع سے ادا کی جائے، قضا نمازوں کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔ تاہم انسانی زندگی میں بعض ایسے کٹھن مراحل بھی آتے ہیں کہ ان میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے سے ہی سکون قلب نصیب ہوتا ہے۔ جائے نماز سے اٹھا تو طبیعت میں خاصا ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ کچن میں رات کا سالن گرم کیا اور ساری بوٹیاں نکال کر کھا لیں۔ ڈبل روٹی کے چند سلائس اور شامی کباب بھی کھائے۔ چائے بنا کر پی اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پانچ بج کر سترہ منٹ پر میں نے پورچ میں کھڑے ہو کر لان کی طرف نگاہ ڈالی۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ لان کے بائیں پہلو پر گارڈینیا کی اونچی باڑھ کے ساتھ گھاس پر لیٹ کر بھائی ایکسر سائز کر رہا تھا۔ سر میری طرف اور پاؤں گیٹ کی جانب کیے، پیٹھ پوری طرح گھاس کے فرش سے ٹکائے، ٹانگیں آہستہ آہستہ اٹھا کر تقریباً نوے درجے کے زاویے پر کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح آہستگی سے واپس لے جا کر نیچے ڈال دیتا۔ لیکن آسمان کی طرف ٹانگیں ایستادہ ہونے پر اس کے حلق سے دبی دبی ”ہائے“ کی آواز برآمد ہو جاتی۔ مجھے سویٹی کے مادرزاد حالت میں پٹنے پر چیخنے چلانے اور آہ و بکا کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے چشم تصور سے میں نے دیکھا کہ وہ سویٹی نہیں، میری شفو ہے۔ بے اختیار میرے قدم بھائی کی طرف اٹھتے گئے۔ سر کے قریب پہنچا تو اس کی ٹانگیں آہستہ آہستہ اٹھتی ہوئی نوے درجے کے زاویے سے بھی قدرے آگے جھک آئیں۔ اس کی آنکھیں گو بند تھیں لیکن اس مرتبہ لبوں سے برآمد ہونے والی آواز ”ہائے“ اور ”آہ“ کا ملغوبہ تھی اور نسبتاً بلند۔ آن واحد میں اپنا بایاں بازو بڑھایا اور بھائی کی دونوں پنڈلیاں لپیٹ میں لے کر سینے کے ساتھ بھینچ لیں۔ اس کی بائیں ٹانگ دائیں کے اوپر تھی۔ اسی لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا جس میں سرنج پکڑ رکھی تھی۔ کوئی غیبی قوت شامل حال رہی اور سرنج کی سوئی دو تین سیکنڈ کے اندر اندر بھائی کے بائیں ٹخنے سے چند انچ اوپر پنڈلی میں اتر گئی۔ ہیجانی کیفیت غالب آنے پر انگوٹھا ذرا زیادہ دب گیا۔ میں نے دیکھا کہ سرنج تقریباً خالی ہو گئی ہے۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی عجلت میں سوئی باہر کھینچ لی اور پہلے سوراخ کے قریب ہی دوبارہ گھسیڑ دی۔ سوئی دونوں مرتبہ کم و بیش عمودی رخ پر پنڈلی میں کھبی تھی۔

رات بھر کی سوچ بچار کے بعد ذہن میں طے شدہ پروگرام کے مطابق کام مکمل ہو گیا تو ایک نگاہ بھائی پر ڈالنے کا خیال آیا۔ سارے جسم کا خون سمٹ کر اس کے چہرے اور آنکھوں سے گویا پھوٹنے کو تھا۔ حلق سے غراہٹ نما خرخر کی آوازیں یوں سنائی دیں، جیسے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو۔ میں نے اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں تو وہ دھم سے نیچے آ رہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بھائی ہاتھ ہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھ سے وہاں مزید کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ بھاگ کر سرونٹ کوارٹرز سے ملحقہ اسٹور میں آیا اور مالی کے اوزاروں میں سے وہ پلاس نما امپورٹڈ کٹر اٹھا لیا، جس سے مجھے خود بھی پودوں کی شاخیں تراشنے کا مزہ آیا کرتا تھا۔ مین ہول کا ڈھکنا پہلے ہی ہٹا رکھا تھا، جس میں شیشی کی کچھ کرچیاں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ سرنج والا بایاں ہاتھ نیچے مین ہول میں بڑھایا اور کٹر سے اس کے ٹکڑے کر دیے۔ ڈھکنا جما کر چھت پر چلا گیا اور پانی کی ٹینکی خالی کرنے کی غرض سے رکھے گئے دو انچ قطر کے پائپ کا والو پوری طرح کھول دیا جس سے پانی بہت زیادہ مقدار میں غیر معمولی رفتار سے نیچے سیوریج لائن میں بہنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد والو بند کیا اور نیچے آ گیا۔

بھائی کے کمرے سے خواب آور گولیوں کی ڈبل ڈوز لی اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھے گیا۔ اضطراب، اطمینان اور غم کی باہم متضاد لہریں ایک ساتھ میرے جسم میں گردش کرنے لگیں۔ مجھے مستقبل کے حوالے سے کوئی غم تھا نہ فکر و اندیشہ، گو بھائی مجھے بللا سمجھتا ہی نہیں، بلکہ اسی نام سے پکارا بھی کرتا تھا۔ حالانکہ کاروبار چلانے کی صلاحیت بھائی کے مقابلے میں مجھ میں زیادہ تھی اور اسٹاف سے میرا رویہ بھی شروع سے دوستانہ رہا ہے۔ میری راہ میں حائل ڈاکٹر پرکاش والی پیچیدگی بھی نہیں تھی۔ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کا نمائندہ فرد ہوں۔ وہ مسلمان جو مذہب پر

عمل بالکل نہیں کرتے مگر اس کی دی ہوئی رعایتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میرے مذہب میں بیوہ کے مستقبل کی بابت جو حکم الٰہی ہے، اس کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے اگر زندگی موت کا مسئلہ تھا تو اللہ کے نزدیک یہ مستحسن۔ سب رشتہ داروں اور پوری برادری کے لیے میرے گھر کے دروازے اسی روز کھل جانے تھے۔ مناسب وقت آنے پر میرے بزرگ از خود ہی بیوہ بھابی کے مستقبل کی فکر کرتے ہوئے خاندان کی آزمودہ روایت پر عمل درآمد کروائیں گے۔ انہی لمحات کے دوران ہی میں نیند کی گہری پرسکون آغوش میں اترتا چلا گیا۔

میں بھائی کی موت پر بہت رویا تھا۔ اللہ گواہ ہے، میرے آنسو سو فیصد اصلی تھے۔ اس سے ہر طرح کی ذلت اٹھا کر اور سختی برداشت کر کے بھی کبھی یہ تمنا نہ کی کہ وہ مر جائے۔ ساری برادری اور دور نزدیک کے تمام رشتہ دار میرے غم میں شریک ہوئے۔ بہت سوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صرف میری دل جوئی کے لیے آئے ہیں۔ مرنے والے نے اپنی زندگی میں انہیں بہت ستایا۔ قبر میں اتارنے کے موقعے پر مفتی صاحب اور دو تین اور لوگوں نے آخری دیدار کرنے کو کہا تو ماموں جی راجا بنارس نے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا اور کہا۔ ”کیوں تنگ کرتے ہو لڑکے کو۔ خبردار! اب کسی نے منہ دیکھنے کو کہا تو۔“ ماموں نے دور سے ہی اپنے بڑے بیٹے صادق کو بہ آواز بلند حکم دیا۔ ”اتارو اس کو اور پڑیاں رکھو، اللہ سوہنے کے حوالے۔“ پڑیاں رکھی گئیں تو میں مٹی ڈالنے کے لیے قبر پر چلا گیا۔

بھائی کا رشتہ چھن گیا مگر درجنوں رشتے مل گئے۔ میں نے سب مذہبی رسمیں پوری کیں، جن رشتے داروں سے میں چوری چوری ملنے جایا کرتا تھا، وہ سب میرے گھر میں میرے آس پاس تھے۔ حالانکہ قبر کو مٹی دینے کے بعد فوراً ہی مجھے صبر آ گیا تھا اور حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ میرے گھر میں اسی طرح رونق لگی رہے۔ مفتی صاحب تمام ملازموں کو اپنی نگرانی میں لے کر بھائی کی تدفین کے بعد کوٹھی کا کونا کونا چھانتے رہے۔ کئی طرح کی جڑی بوٹیاں منگوا کر گھر کے اندر باہر ہر کونے کھدرے میں دھونی دلوائی۔ مگر کہیں بھی خطرناک سانپ نظر نہ آیا۔ ماموں نے حسب عادت خوب کھڑک کر کہا۔ ”مفتی صاحب! سنا ہے سانپ اڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔“ انہوں نے کھڑے کھڑے باقاعدہ ایکشن دکھایا۔ بائیں ہتھیلی پھیلا کر سر سے ذرا بلند کی اور دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کی پوریں باہم جوڑ کر پھن کی شکل دے لی۔ میں نے یہ سن لیا اور خیال عمر کوٹ کی طرف چلا گیا۔ میرے دل نے گواہی دی۔ ”سچی محبت میں واقعی بڑی شکتی ہوتی ہے۔ کوئی ہتھیار بیچ میں حائل ہو جائے تو وہ پنڈلی یا ہونٹوں پر ڈس لیا جاتا ہے۔“ ماموں جی راجا بنارس بڑے دبنگ بزرگ تھے۔

بھائی کی وفات کے ایک ہفتے بعد ہمارے کاروباری ادارے کے سارے شعبے کھل گئے اور میری ہدایت پر مفتی صاحب نگرانی کرنے لگے تاہم شام کو چھٹی کر کے دن بھر کی رپورٹ دینے آ جاتے۔ ماموں نے بہ مشکل دسویں تک صبر کیا اور اگلے روز مہمانوں سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم میں مفتی صاحب کو اپنے ساتھ بٹھا کر خوب کھڑک کر بولے۔ ”بھائی صاحب! میں ذرا رف سا بندہ ہوں، میری بات کا برا نہیں منانا۔ ہم منگیتر نہیں چھوڑا کرتے، یہاں تو نکاح ہو چکا ہے۔ آپ کے گھر میں ہماری عزت ہے، وہ اب آپ کی نہیں ہماری بیٹی ہے۔ ہمارے خاندان میں رواج ہے کہ بہو بیوہ ہو جائے تو دیور پندرہ بیس سال چھوٹا ہو یا جیٹھ اتنا ہی بڑا، گھر کی عزت گھر میں رکھتے ہیں اور یہاں تو اللہ کے فضل سے معاملہ ہی فٹ فاٹ ہے۔“

ماموں کی کھری کھری دوٹوک بات پر میں ششدر رہ گیا لیکن مفتی صاحب نے ان کو دائیں بازو کے گھیرے میں لے کر کہا۔ ”راجا صاحب! آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ جب مناسب سمجھیں، حکم کر دیں، فوراً تعمیل ہو گی۔“

ماموں مجھے بازو سے پکڑ کر قریب قریب کھینچتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ بڑی بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہولے سے بولے۔ ”ٹھیک کیا ہے ناں!!!“ میں ہونقوں کی طرح دیکھے گیا۔ منہ ذرا سا کھل گیا، کچھ بول نہ پایا لیکن سر از خود ہی اثبات میں ہلنے لگا۔ ہنس کر کہنے لگے۔ ”مرد کی مردانگی یہی ہے کہ بات نبھائے، چاہے سامنے سگا بھائی کیوں نہ آ جائے۔ میں نے خود تم دونوں کو شکر پڑیاں پارک میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ ذرا سی جاسوسی کرانے سے معلوم ہو گیا کہ یونیورسٹی سے چکر چل رہا ہے اور یہ بھی کہ لڑکی کہاں رہتی ہے، کس کی بیٹی ہے۔“ یہ سن کر میرے جسم میں جان نہ رہی، یوں جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ انہوں نے پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے مجھے پہلو سے لگایا اور باہر لے جاتے ہوئے بولے۔ ”ہمت کر، مرد بن، تیرا ماماں تیرے ساتھ ہے۔“

آشوبِ وفا

محی الدین نواب

دنیائے ادب کا نامور قلم کار شیکسپیئر' اس کا شہرہ آفاق ڈراما "مرچنٹ آف وینس"، ڈرامے کا یہودی سود خود شائیلاک اور اس کا اپنے قرض داں انطونیو کے جسم سے زندہ گوشت کا ایک پاؤنڈ کاٹ لینے کا وحشیانہ مطالبہ کون نہیں جانتا۔ شیکسپیئر جو کچھ لکھتا تھا، بہت سوچ سمجھ کر لکھتا تھا۔ اس نے یہ رمز پالیا تھا کہ یہودی قوم چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے کہ گندے اصول کی پیروکار ہے۔ اپنے اسی ادراک کے تحت اس نے شائیلاک کا کردار تخلیق کرکے صیہونیوں کو آئینہ دکھادیا۔ عام آدمی سے پیشوائوں تک ان میں سب ہی زرپرست ہیں... عصائے موسیٰ اور زروجواہر سے اٹاٹ بھرے ہوئے تابوت یہودا کی بازیابی کا جذباتی نعرہ دے کر انہوں نے کروڑوں کا ایک عالمی فنڈ قائم کیا اور اپنی قوم کو سمجھایا کہ پیکل سلیمانی کے بارہ سورما جب ظاہر ہوکر وہ تابوت منظرِ عام پر لائیں گے تو اس کی برکت سے کرہ ارض پر یہودیوں کو بے مثال عروج حاصل ہوجائے گا اور وہ سب قوموں پر حکمرانی کریں گے... سادہ لوح یہودی دل کھول کر اس سازشی فنڈ میں عطیات دیتے ہیں... ایک طرف صیہونی تقدس کے پیرہن میں چھپے شیطانی وجود پوری آل موسیٰ کو ورغلا رہے تھے تو دوسری طرف حریت کے لیے برسرپیکار آزادی کے متوالے تھے... زرگزیدہ ربیّوں کے نزدیک وہ حریت پسند باغی تھے جنہیں سفاکی سے کچل دینا ان کا حق تھا... موہوم روایتوں اور حرص وہوس کے غبار میں سازشوں کی جنگ نے ان کو دشمن کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کردیا... سورمائوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے وہ اتنے گرگئے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو چارہ بناکر سورمائوں کو خریدنا شروع کردیا... حریت پسندوں نے اپنی منصوبہ بندی سے ان سب کی ہوس زر کو خوب ہوا دی، وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح خون کی ہولی کھیلنے لگے، طاقت اور بربریت ان طاغوتی پیشوائوں اور رہنمائوں کا سہارا تھی۔

تحیر، تجسس، سنسنی اور چشم کشا حقیقتوں کے جال میں بنی ایک انوکھی داستان

کبھی کوئی بھی دن فائرنگ اور دھماکوں کے بغیر بھی گزر جاتا اور کوئی رات سکون سے بیت جاتی تھی۔ پھر بھی فلسطینی کچی نیند سونے کے عادی ہوگئے تھے۔ خوابِ غفلت بھول چکے تھے۔ سونے کے دوران ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نقش رہتی تھی کہ اچانک دھماکے ہوں گے اور وہ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں گے۔ اکثر اسی طرح نیندیں غارت ہوجایا کرتی تھیں۔

غزہ کے جنوب میں مصر ہے۔ مشرق اور شمال میں اسرائیلی فوجی مورچے ہیں اور مغرب میں سمندر ہے۔ پچیس میل کی لمبائی تک سمندری ساحل پر فلسطینی ہیں۔ باقی شمالی ساحل اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ رات ہوتے ہی بڑی بڑی سرچ لائٹس روشن ہوجاتی ہیں۔ دور سمندر میں مخالف حملہ آوروں اور اسمگلروں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ حماس اور دیگر اسلامی تنظیموں کے مجاہدین سمندری راستے سے اسرائیلی آبادی میں گھس آئیں گے۔ لہٰذا وہ رات کو زیادہ چوکنے رہنے لگے تھے۔

وقفے وقفے سے ٹریسر گولیاں داغتے تھے۔ وہ سیدھی آسمان کی طرف جاکر پھٹتی تھیں۔ پھر ان میں سے روشنی کی اتنی تیز شعاعیں نکلتیں کہ سمندر میں دور تک جیسے دن کا اجالا پھیل گیا ہو۔ ایان کو جب تک نیند نہ آتی' تب تک وہ کھڑکی سے لگا رات کو دن ہوتے دیکھتا رہتا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ جیسے آتش بازی کا مظاہرہ ہورہا ہو۔ پھر وہ تیز روشنی دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگتی تھی۔ اس کے بعد آسمان پہلے کی طرح تاریک ہوجاتا اور سمندر پر سرچ لائٹس کی محدود روشنیاں رہ جاتی تھیں۔

اس نے سر گھما کر دیکھا' ساتھ والے بیڈروم میں اس کے ماں باپ تھے۔ اس نے پھر ایک بار ماں کی ہلکی سی کراہیں سنیں۔ وہ دونوں کچھ اس طرح باتیں کررہے تھے' جیسے کسی بات پر جھگڑ رہے ہوں۔

بیٹے نے چشم تصور سے دیکھا۔ باپ اس کی ماں کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کی پٹائی کررہا تھا۔ وہ بے چین ہوکر درمیانی دیوار کے پاس آگیا۔ کان لگا کر سننے لگا۔ دھیمی دھیمی سی آوازیں آرہی تھیں لیکن الفاظ واضح نہیں تھے۔

جب اس نے پہلی بار ماں کی آہیں اور کراہیں سنی تھیں تو دوڑتا ہوا اس کمرے میں گیا تھا۔ اس وقت باپ اس کی ماما کو دونوں بازوؤں میں دبوچ کر اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ بیٹا تڑپ گیا۔ اس نے ایک لکڑی اٹھا کر پیچھے سے حملہ کیا۔ ''چھوڑو میری ماما کو.... چھوڑو نہیں تو مار ڈالوں گا۔'' باپ نے ماں کو چھوڑ کر بیٹے کو پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے لکڑی چھین کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے تم کہاں سے آگئے؟ میں ابھی دیکھ کر آیا تھا' تم سو رہے تھے۔''

''میں جاگ رہا تھا۔ تم میری ماما کو مارتے ہو۔ تم اچھے نہیں ہو۔ گندے ہو۔ ہمارے گھر سے چلے جاؤ۔''

پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبا کر ہنس رہی تھی۔ باپ نے اس کا سر سہلایا پھر ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے کہا۔ ''بارہ برس کے ہوگئے ہو۔ اونٹ کی طرح قد نکال رہے ہو اور بات سمجھتے نہیں ہو۔''

وہ اس کے کمرے میں آکر بولا۔ ''تم نے دیکھا' تمہاری ماں ہنس رہی تھی؟''

وہ حیران تھا۔ باپ نے کہا۔ ''اگر میں اس پر ظلم کرتا تو وہ روتی... بولو روتی ناں؟''

وہ پلکیں جھپکائے بغیر باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں پلے نہیں پڑ رہی تھیں اور ماں کی ہنسی بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ باپ نے تھپک کر کہا۔ ''اپنے بیڈ پر آرام سے سوجاؤ۔ اب ہمارے کمرے میں نہ آنا۔ میں دروازہ اندر سے بند کررہا ہوں۔'' وہ اس کی پیشانی چوم کر چلا گیا۔ دوسرے دن ماں نے بھی سمجھایا۔ ''تمہارے پاپا بہت اچھے ہیں۔ جتنا تم پیار کرتے ہو' اتنا وہ بھی مجھے پیار کرتے ہیں۔''

اس رات کے بعد ماں محتاط ہوگئی تھی۔ منہ بند رکھتی تھی۔ بیٹے نے پھر اس کی آہیں اور کراہیں نہیں سنیں اور اب کئی دنوں کے بعد پھر ماں کی آہوں اور کراہوں نے اسے چونکا دیا۔ اس بار لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا' وہ ایک دوسرے سے کیا بول رہے ہیں؟

وہ سر جھکا کر بیڈ کے پاس آیا۔ سرہانے والی میز پر ایک ریوالور اور ایک کلاشنکوف رکھی ہوئی تھی۔ باپ نے اسے دیتے ہوئے کہا تھا' اسے زیتون سے صاف کرو پھر لوڈ کرو۔ میں صبح جاتے وقت لے جاؤں گا۔ وہاں بچوں اور بچیوں کو اسلحہ پکڑنے اور نشانہ لگانے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ وہ بھی اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عسکری ٹریننگ بھی حاصل کرتا رہا تھا۔

وہ یکبارگی اچھل پڑا۔ ماں کی چیخ سنائی دی تھی۔ جس کی لوریاں سن کر بڑا ہوا تھا، اس کی چیخ نے لرزا دیا۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے سے باہر آیا پھر دوسرے کمرے کے دروازے کو دھکا مار کر کھولنا چاہا' وہ اندر سے بند تھا۔ ماں کی گھٹی گھٹی سی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دروازے پر ہاتھ مار کر چیخنے لگا۔ ''دروازہ کھولو... بابا! میری ماما کو چھوڑ دو۔''

اندر ماں نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ ''ایان! پڑوسیوں کو بلاؤ۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔''

اُس نے دروازے تک جانے نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں دشمن نہیں ہوں۔ مگر منہ بند نہیں رکھوگی تو ہمیشہ کے لیے تمہاری زبان بند کردوں گا۔''

ایان نے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کلثوم کا گلا دبا رہا تھا اور وہ خود کو چھڑانے کے لیے جدوجہد کررہی تھی۔ ایان دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے بیڈ کے سرہانے رکھے ہوئے ریوالور کو اٹھایا۔ پھر اتنی ہی تیز رفتاری سے کھڑکی کے پاس آگیا۔ پڑوسیوں کے پاس جانے کا وقت نہیں تھا۔ ماں کی جان جانے والی تھی۔ اس نے کھڑکی کی جالی سے ریوالور کو اندر کرتے ہوئے للکارا۔ ''چھوڑ دو میری ماں کو... نہیں تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ فوراً ہی گولی نہ چلا سکا۔ اس وقت کلثوم نے خود کو چھڑا لیا تھا لیکن پھر گرفت میں آگئی تھی۔ ویسے پوری طرح اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔ وہ دونوں کھینچ تان میں ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ ایان باپ کو للکار رہا تھا اور نشانہ لے رہا تھا۔ ایسے وقت وہ ٹارگٹ سے باہر ہوجاتا تھا۔ اس نے ٹریننگ حاصل کی تھی۔ مگر عمر کے لحاظ سے ابھی کچا تھا۔ ایسے وقت ماں نے چیخ کر کہا۔ ''ایان! مجھے بچاؤ۔ یہ دشمن...''

وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کے منہ پر ایک زور کا ہاتھ پڑا۔ ایسے ہی وقت ایان نے گولی چلا دی۔ نشانہ درست تھا لیکن وہ مار کھا کر لڑکھڑائی تو بیٹے کے نشانے پر آگئی۔ اس کے حلق سے آخری چیخ نکلی۔ اس نے گرتے گرتے بڑی ممتا سے' بڑی بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔ ''آہ... میرے بچے! اس غلطی پر افسوس نہ کرنا۔ میں نے دودھ بخش دیا ہے۔''

وہ فرش پر گر کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگئی۔ ایان کے چہرے پر بدن کا تمام لہو کھنچ آیا تھا۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس نے پیدا کرنے والی ماں کو مار ڈالا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''بابا! تم کہاں ہو؟ ماما کو فوراً اسپتال لے چلو۔''

وہ اپنے بچاؤ کے لیے کھڑکی کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔ پہلے تم ریوالور پھینکو۔''

اس نے ریوالور کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ باپ نے فوراً ہی اسے اٹھا کر دروازے کو کھولا۔ بیٹا روتا ہوا' دوڑتا ہوا ماں کے پاس گیا اور اس نے دوڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں آکر کلاشنکوف پر قبضہ جما لیا۔ بیٹے پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ وہ ماں کو مردہ پاکر پھر اس کی جان کا دشمن بن سکتا تھا اور یہی ہوا۔ وہ واردات والے کمرے میں واپس آیا تو ایان اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ بولتی نہیں ہیں۔ آنکھیں نہیں کھول رہی ہیں۔ یہ مرچکی ہیں۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔''

وہ دوڑتا ہوا آکر باپ کو دونوں ہاتھوں سے مارنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک مار کھاتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ بیٹا آخر اپنا ہی لہو تھا۔ اس کی دشمنی کے جواب میں دشمن نہیں بن سکتا تھا۔ ابھی اسے ماں کا صدمہ تھا۔ جوش وجنون میں باپ کو دشمن سمجھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی معصومیت کو اپنے سانچے میں ڈھالا جاسکتا تھا۔

ایسے وقت باہر سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔ پڑوسی پوچھ رہا تھا۔ ''جلالت بھائی! کیا تم نے گولی چلائی ہے؟ خیریت تو ہے ناں؟''

وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اسے کھینچتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف جانے لگا۔ وہ ماں کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اور باپ اسے اسلحہ کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی گھسیٹ کر وہاں سے لے آیا۔ پھر دروازہ کھولا۔ باہر دو پڑوسی اور رضا کار کھڑے تھے۔ انہوں نے ایان کو باپ سے ہاتھ چھڑانے کی کوششیں کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

جلالت اسرار نے کہا۔ ''اندر آؤ اور آنکھوں سے دیکھو۔ اس نے اپنی ماں پر گولی چلائی ہے۔ وہ مرچکی ہے۔''

رضا کار نے ایان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''آؤ یہاں بیٹھو۔ ہمیں بتاؤ' تم نے گولی کیوں چلائی تھی؟''

پڑوسی نے انفارمیشن سینٹر میں اطلاع دی کہ جلالت اسرار کے گھر میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں تنظیم کے لیڈر اور کئی اکابرین آگئے۔ جلالت نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنی ماں کا ایسا دیوانہ ہے کہ اس کے قریب باپ کو بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔ اب سے پہلے بھی اس نے ایک لکڑی اٹھا کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔''

ایان سے پوچھا گیا۔ ''کیا یہ درست ہے' تم نے باپ پر حملہ کیا تھا؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''یہ دشمن ہیں۔ میری ماما کو تکلیف پہنچاتے تھے۔''

جلالت نے کہا۔ ''یہ بتاؤ' میں تکلیف پہنچاتا تھا تو وہ ہنستی کیوں تھی؟''

اس بات کو وہ سمجھتا نہیں تھا یا ماں کی محبت میں سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس ماں کی ہنسی کا جواز نہیں تھا۔ وہ چپ رہا۔

جلالت اسرار نے کہا۔ ''اس عمر کے لڑکے عورتوں کے متعلق خاصی معلومات رکھتے ہیں لیکن یہ عقل سے پیدل ہے۔''

تمام مردوں نے سر ہلا کر تائید کی۔ آنے والوں کے لیڈر غالی ارنضلی نے کہا۔ ''یہ اپنا رمل ہے۔ یہ صدمہ اسے ذہنی مریض بنا دے گا کہ اس نے ماں کو قتل کیا ہے۔ اسے مینٹل اسپتال میں لے جاؤ۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین اس کا علاج کریں گے۔''

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ کلثوم کی تدفین ہونے تک رضا کاروں نے ایان کو سخت نگرانی میں رکھا۔ اسے قبرستان لے گئے۔ پھر مینٹل اسپتال لے آئے۔

کلثوم کی موت سے پھر آپس کے اختلافات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ جلالت اسرار اپنی پارٹی کا ایک شیر دل کارکن تھا۔ اسے چاہنے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ پارٹی کے ووٹ بینک میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اب حکمران پارٹی کے ووٹ بینک کو توڑنے اور جلالت اسرار کو قانونی گرفت میں لینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اپوزیشن نے اپیل کی کہ جلالت اسرار اپنی بیوی کلثوم کا قاتل ہے۔ وہ اپنے معصوم بچے پر قتل کا الزام لگا رہا ہے۔ اس معاملے کی تحقیقات کی جائیں اور فیصلہ ہونے تک جلالت کو حراست میں رکھا جائے۔

اس اپیل کے نتیجے میں جلالت کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے ساتھی کارکن طیش میں آ گئے۔ وہ اقتدار میں رہنے والی پارٹی تھی۔ ان کی ضمانت پر جلالت کو عارضی طور پر رہا کر دیا گیا۔ اس کی رہائی پر اپوزیشن میں رہنے والے طیش میں آ گئے۔ ان مخالفین کے درمیان پہلے ''تو تو میں میں'' ہوئی پھر گالم گلوچ ہوئی۔ اس کے بعد گولیاں چل پڑیں۔ وہ آپس کی دشمنی میں مارے جا رہے تھے۔ دشمن مطمئن تھے کہ پانچ پانچ' دس دس کی تعداد میں مرنے والوں کے حساب سے فلسطینی اسی طرح کم ہوتے جائیں گے۔

ایان مینٹل اسپتال کے ایک کمرے میں تھا۔ باہر دروازے پر دو مسلح گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ کسی بھی پارٹی کے کارکن یا لیڈر کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ڈاکٹر اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر در پردہ اپوزیشن کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ ایان کے دماغ میں یہ بات نقش کرتا رہتا تھا کہ ماں کی روح کو سکون پہنچانا چاہتے ہو تو اس دشمن کو باپ نہ سمجھو۔ اس سے انتقام لو۔ پھر ماں خوش ہو کر تمہارے خوابوں میں آئے گی۔ اس نے بڑے جذبے سے پوچھا۔ ''کیا سچ کہتے ہو؟ ماما میرے خوابوں میں آئیں گی؟''

''وہ تب آئیں گی' جب تمہارے دشمن باپ کو سزا ملے گی۔''

''بابا کو سزا کیسے ملے گی؟''

''جب تم یہ کہو گے کہ ماں پر تم نے نہیں' تمہارے باپ نے گولی چلائی تھی۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''مت سوچو۔ جو کہتا ہوں' وہی بولو۔''

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''ماما جھوٹ بولنے سے منع کرتی تھیں۔''

''تب تمہاری ماما کو یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہارا باپ دشمن ہے۔ اب ایک چھوٹا سا جھوٹ بول کر اس کی روح کو سکون پہنچاؤ۔'' وہ ایان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم خود کو قاتل کہو گے تو تمہیں سزا ملے گی۔ اس اسپتال سے جیل بھیج دیا جائے گا۔ پھر تم ماں کی قبر پر بھی نہیں جا سکو گے۔''

وہ مچل کر بولا۔ ''جاؤں گا۔ میں ماما کی قبر پر ضرور جاؤں گا۔ ان کے لیے دعائیں مانگوں گا۔''

''تم سلاخوں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ پھر ماں کی قبر پر کیسے جاؤ گے؟''

''میں جاؤں گا۔ جو تم بولو گے' وہی بولوں گا۔ میرے بابا نے گولی چلائی تھی۔''

وہ ڈاکٹر جب بھی آتا تھا۔ اسے یہی سبق پڑھاتا تھا اور تاکید کرتا تھا کہ دوسرے ڈاکٹر کو اور وہاں آنے والوں کو یہ نہ بتائے کہ وہ عدالت میں کیا بیان دینے والا ہے۔

جب ایک ہفتے بعد اقوام متحدہ کے آفس میں پیشی ہوئی تو اس نے باپ کے خلاف رٹا ہوا سبق سنا دیا۔ جلالت اسرار اور پارٹی کے لیڈر پریشان ہو گئے۔ اس سے بار بار کہا گیا کہ وہ سچ بولے۔ مگر وہ رٹے ہوئے سبق پر اڑا رہا۔ اسرائیلی اور اقوام متحدہ کے نگراں یہی چاہتے تھے کہ جلالت سزا کے مرحلے پر پہنچے تو اسے اسرائیل کے جیل خانے میں پہنچا دیا جائے۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق جلالت اسرار کو سزا سنا دی گئی۔ اسے اسرائیل کے اس جیل خانے میں پہنچا دیا گیا' جہاں تقریباً ڈیڑھ سو فلسطینی قید بامشقت جھیل رہے تھے۔

☆☆☆

جلالت اسرار دیکھنے میں کچھ پراسرار سا لگتا تھا۔ وہ فطرتاً خاموش رہنے کا عادی تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کچھ عجیب طرح کی کشش تھی۔ وہ زبان سے نہیں بولتا تھا۔ کسی کو بھی آنکھوں کی کشش سے اپنا بنا لیتا تھا۔

اسے قد آور پہاڑ کہا جاتا تھا۔ اس کے پورے جسم کی طرح چہرہ بھی ایسا سخت تھا' جیسے چٹان کو تراش کر اس میں روح پھونک دی گئی ہو۔ اس نے بچپن سے عسکری تربیت حاصل کی تھی۔ جدید ہتھیاروں سے کھیلنے کا ماہر تھا۔

اس کا نام اسرائیلی آرمی کی بلیک لسٹ میں تھا۔ دو برس پہلے آرمی کے ایک افسر اور چھ سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ تنہا تھا' مقابل فوجیوں کے پاس اسلحہ زیادہ تھا۔ لیکن وہ چھپتا چھپاتا ایسی حکمت عملی سے لڑ رہا تھا کہ جو سپاہی مارا جاتا' اس کا تمام اسلحہ حاصل کر کے کاؤنٹر فائرنگ جاری رکھتا تھا۔ اس تنہا شخص سے گھنٹوں جنگ جاری رہی۔ ان کے چھ میں سے تین سپاہی مارے گئے۔ گولیاں ختم ہو گئیں۔ جلالت اسرار کی طرح وہ دشمن بھی نہتے ہو گئے۔ ان حالات میں خالی ہاتھوں سے لڑائی ہوئی تو مقابلہ کرنے والوں کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے حیرانی سے خوفزدہ ہو کر دیکھا۔ اس نے ایک سپاہی کو کرائے کا ہاتھ مارا تھا۔ وہ چکرا کر ایسا گرا کہ پھر زمین سے اٹھ نہ سکا۔ پھر اس نے دوسرے سپاہی کے سر کو گرفت میں لے کر اس کی گردن توڑ دی۔

یہی سمجھ میں آیا کہ وہ آدمی نہیں' فولادی روبوٹ ہے۔ فوجی افسر نے باقی دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہو کر اپنی جان بچائی۔ انہوں نے بعد میں معلوم کیا کہ اس کا نام جلالت اسرار ہے اور وہ حماس کا ایک مجاہد ہے۔ شکست خوردہ افسر نے حکم دیا کہ اس کی فائل بنائی جائے اور اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ اسے کسی بھی طرح زندہ گرفتار کر کے اسرائیلی جیل خانے میں لایا جائے۔

دو برس بعد فلسطین میں عدالت نے اسے اپنی بیوی کلثوم کا قاتل ثابت کر کے مطلوبہ جیل میں پہنچا دیا۔ جیلر کے کمرے میں وہ مات کھانے والا افسر اپنے دو سینئر افسران کے ساتھ موجود تھا۔ جلالت کو صرف ہتھکڑی ہی نہیں پہنائی گئی بلکہ پیروں میں بیڑیاں بھی ڈالی گئی تھیں۔ یہ خوف تھا کہ وہ غیر معمولی جسمانی قوت کا حامل ہے۔ ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہی اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ جب وہ افسران کے سامنے آیا تو ایک سپاہی نے حکم دیا۔ ''جھک جاؤ۔ گھٹنے ٹیک دو۔''

حقیقت نگاری

حنیف راجا بتا رہے تھے کہ المیہ اداکاری میں بھی ان کا جواب نہیں، ایک اسٹیج ڈرامے میں مرنے کا سین کیا، لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عمر شریف بولے۔ ''یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے ایک اسٹیج ڈرامے میں مرنے کا سین کیا تو میرا انشورنس ایجنٹ فوراً اٹھا اور گھر جا کے میری بیوی کو میرے بیمے کی رقم دے آیا۔''

مرسلہ: محمد مقبول عاشق، خوشاب

اس نے بڑی سنجیدگی سے سپاہی کو دیکھا اور اپنی عادت کے مطابق تن کر کھڑا رہا۔ شکست خوردہ افسر نے اس کے پاس آ کر ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا۔ زور کا ہاتھ پڑا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے برعکس وہ اپنا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر سپاہیوں سے کہا۔ ''اسے جھکاؤ۔ ڈنڈے مارو۔ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرو۔''

سپاہیوں نے ڈنڈے اٹھا لیے اور اس کے پیروں پر ضربیں لگانے لگے۔ وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا' لیکن چیخنا کراہنا اور کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب وہ کھڑے رہنے کے قابل نہ رہا' تب بھی ان کے آگے نہیں گرا' پیچھے کی طرف گر کر چاروں شانے چت ہو گیا۔

یہ بات غصہ دلانے والی تھی کہ اس نے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔ وہ سینئر افسران بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ فوجی بوٹوں سے ٹھوکریں مارنے لگے۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا رہا۔ فرش پر ادھر سے ادھر لوٹتا رہا۔ ایسا ڈھیٹ تھا کہ رحم کی بھیک نہیں مانگ رہا تھا۔ ٹھوکریں مارنے والے بُری طرح ہانپ رہے تھے۔

وہ تینوں افسران کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ اپنی سانسیں درست کرنے لگے۔ جلالت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اور غصہ دلانے والی بات تھی۔

ایک سینئر افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اسے مارو۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دو۔''

پہلے دو سپاہی تھے' پھر چار ہو گئے۔ اسے مارنے اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچانے لگے۔ وہ افسران سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ ''اسے مارتے رہو۔ اس نے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اسے چیخنے پر مجبور کرو۔ رونے اور گڑگڑانے پر

مجبور کرو۔''

وہ تمام سپاہی ٹارچر سیل کے اور تھرڈ ڈگری کے تمام حربے استعمال کرنے لگے۔ آخر وہ انسان تھا' تشدد حد سے بڑھا تو بیہوش ہوگیا۔ افسران جھنجلا کر رہ گئے۔ کیونکہ اس پتھر کے حلق سے ایک چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔

☆☆☆

جلالت اسرار آہنی سلاخوں کے پیچھے ٹھنڈے اور گیلے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ کسی دوا یا تدبیر کے بغیر ہی ہوش میں آگیا تھا۔ دونوں پیروں پر خصوصاً گھٹنوں پر بڑی ظالمانہ ضربیں لگائی گئی تھیں۔ ہڈیوں کا چورمر بن جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عارضی طور پر تکلیف میں مبتلا ہوکر گر پڑا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑا ہوگیا۔ وہ کوئی سپر مین یا ماورائی قوتوں کا حامل نہیں تھا۔ صرف غیر معمولی قوت برداشت کا حامل تھا۔ البتہ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ بے انتہا تشدد کے باوجود نہ اس کی ہڈیاں ٹوٹی تھیں' نہ ہی ورم آیا تھا۔ دیوار کے ساتھ سیمنٹ سے بنی ہوئی سیٹ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں آکر بیٹھ گیا۔ سر جھکائے سوچنے لگا۔ ماں نے بتایا تھا کہ اس کا باپ بہت شہزور تھا۔ دشمن اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ آخر اس کے ماں باپ نے تنگ آکر ارضِ مصر کو خیرباد کہہ دیا۔ سرحد پار کر کے فلسطین آگئے۔

اُن دنوں فلسطین پر مسلمانوں کا قبضہ تھا لیکن دوسرے ہی دن اقوام متحدہ کے فیصلے کے مطابق اسرائیلی ریاست قائم ہونے والی تھی۔ اس کے ماں باپ سرحد سے سفر کرتے ہوئے ہیکل کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا' دشمن بھی سرحد سے پیچھا کرتے چلے آرہے ہیں۔ وہ دونوں ہیکل میں آکر چھپ گئے۔ وہ ایسا وقت تھا کہ جلالت اسرار جنم لینے والا تھا۔ زچگی کا وقت قریب آچکا تھا۔ اس کا باپ باہر دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ ان کے درمیان وقفے وقفے سے فائرنگ ہورہی تھی اور ماں ہیکل کے ایک اُجاڑ حصے میں تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ اس کی آواز سن کر دشمن ادھر چلے آئیں گے۔

بڑی مجبوری تھی۔ دردِ زہ کی تکلیف یقیناً ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اس نے بڑی قوتِ ارادی سے منہ بند رکھا تھا۔ ہیکل کی دیوار کے ساتھ ایک گہرا گڑھا تھا۔ وہ اس گڑھے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس حد تک چھپنے کے باوجود اندیشہ تھا کہ بچہ دنیا میں آتے ہی روئے گا۔ منہ سے آواز نکالے گا تو دشمن دوڑے چلے آئیں گے۔ باہر فائرنگ کی آواز بند ہوگئی تھی۔ وہ اللہ اللہ کرتی رہی اور دانت پر دانت جمائے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے تکلیف برداشت کرتی رہی۔

آخر مشکل آسان ہوگئی۔ بچہ دنیا میں آگیا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر سوچا' بچہ کہاں ہے؟ اس کی آواز کیوں نہیں آرہی ہے؟ آدھی رات ہوچکی تھی۔ ہیکل میں کہیں روشنی ہوگی۔ گڑھے میں گہری تاریکی تھی۔ دیوار کے ساتھ گڑھے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہیکل کی بنیاد میں پیدا ہوا تھا مگر کہاں تھا؟

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آگے کی طرف جھک کر اندھیرے میں ٹٹولنے لگی۔ ایسے ہی وقت ٹارچ کی روشنی بھٹکتی ہوئی اُدھر آئی۔ ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ ''اوخدایا! یہ یہاں پڑی ہے۔''

ٹارچ کی روشنی میں بیٹا مل گیا۔ ماں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ دنیا کے تمام بچے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں یا منہ سے تھوڑی بہت آواز نکالتے ہیں۔ جلالت اسرار اپنی پیدائش کے پہلے لمحے سے رونا اور کراہنا نہیں جانتا تھا۔ ان عورتوں نے اس کی ماں کو سہارا دے کر اس گڑھے سے باہر نکالا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں کے پیش امام نے اسے دیکھا تھا اور اپنے گھر کی عورتوں سے کہا تھا' اسے ڈھونڈو۔ وہ مصیبت زدہ ہیکل میں کہیں ہے۔

یوں ماں بیٹے کو مسلمانوں کے ہاں پناہ مل گئی تھی۔ ماں نے پناہ دینے والوں سے کہا۔ ''میرا شوہر ہیکل کے باہر دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ خدا کے لیے اس کی مدد کرو۔''

پیش امام نے کہا۔ ''یہاں بڑی بھگدڑ اور افراتفری ہے۔ اسرائیلی ریاست قائم ہورہی ہے۔ ان کے فوجی محاصرہ کررہے ہیں۔ ہماری خواتین اور بچے غزہ جارہے ہیں۔ آپ بھی چلی جائیں۔ آپ کے شوہر زندہ سلامت ہوں گے تو ہمارے پاس آئیں گے۔ ہم انہیں آپ کے پاس پہنچادیں گے۔''

وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ خلا میں تکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ''اسرائیلی ریاست 14 مئی 1948ء میں قائم ہوئی تھی۔ میں تیرہ اور چودہ مئی کی درمیانی شب پیدا ہوا تھا۔ ماں نے کہا تھا' میں اپنے باپ دادا کی طرح عجیب وغریب ہوں۔ جسمانی طور پر ناقابل شکست ہوں اور دماغی طور پر ارادوں کا پکا ہوں۔ جو بات دل میں ٹھان لیتا ہوں' وہ کر کے ہی رہتا ہوں۔ میری پیدائش عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ میں ہیکل کی بنیاد میں پیدا ہوا تھا۔ ماں مجھے بڑے پیار سے ہیکل کا سورما کہتی تھی۔ جبکہ ہیکل کے سورماؤں کو یہودی مانتے ہیں۔''

جلالت اسرار زیرلب بڑبڑایا۔ ''ہیکل کے سورما...'' یہ الفاظ میں نے پہلی بار اپنی ماما کی زبان سے سنے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھے ہیکل کا سورما کہا تھا۔ اس لیے کہا تھا کہ مجھ میں کچھ غیر معمولی باتیں ہیں۔''

وہ ہنسنے لگا۔ پھر خلا میں تکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اے ماما! تمہاری روح مجھے دیکھ رہی ہے۔ میری باتیں سن رہی ہے۔ آؤ ماما! ایک بار میرے کان میں پھر سے بولو! کیا میں واقعی ہیکل کا سورما ہوں؟''

☆☆☆

آرمی انٹیلی جنس والے ریکارڈ چیک کررہے تھے۔ کمپیوٹر بتارہا تھا کہ جلالت اسرار کے باپ کا نام اسرار احمد تھا۔ وہ تیرہ اور چودہ مئی 1948ء کی درمیانی شب پیدا ہوا تھا اور ٹھیک اسی دن اسرائیلی ریاست وجود میں آئی تھی۔ انکوائری کے نتیجے میں معلوم ہوا' اسی دن تیرہ مئی کو اسرار احمد نامی ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ مصر کی سرحد پار کر کے فلسطین آیا تھا۔ اسکندریہ کی ایک یہودی جماعت نے یہ دستاویزی رپورٹ خاص طور پر اس لیے محفوظ رکھی تھی کہ اسرار احمد نومسلم تھا۔ اس نے یہودی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔

یہ تجسس پیدا ہوا کہ وہ یہودی مذہب سے پھرنے والا اسرار احمد کون تھا؟ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اسکندریہ کی یہودی جماعت سے جو رپورٹ ملی' اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسرار احمد جس کا پہلا یہودی نام رابرٹ رابن تھا، وہ ایک انتہائی پراسرار شخص تھا۔ قدیم عبرانی زبان جانتا تھا۔ جسمانی طور پر غیر معمولی قوتوں کا حامل تھا۔ تنہا دشمنوں کو زیر کردیتا تھا اور مقابلے پر آنے والوں کی گردنیں توڑ دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا' اسے یہ طاقت اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملی ہے۔ میرا جو بیٹا ہوگا' وہ بھی ایسا ہی جواں مرد اور ناقابل شکست ہوگا اور... ہیکل کا محافظ بن کر رہے گا۔

ان آخری الفاظ نے آرمی افسران کو چونکا دیا۔ قدیم زمانے کے ربیوں نے اپنی کتابوں میں لکھا تھا کہ نائٹ ٹیمپلرز یعنی ہیکل کے سورما کن خصوصیات کے حامل ہوں گے اور وہ بارہ ہی ہوں گے۔ اپنی تمام غیر معمولی خصوصیات نسل در نسل اپنی اولادوں میں منتقل کرتے رہیں گے۔ جلالت اسرار کے باپ کا نام اسرار احمد تھا۔ نومسلم اسرار احمد سے جلالت اسرار کی کڑیاں مل رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی حاملہ بیوی نے اسی رات ایک بیٹے کو جنم دیا ہوگا اور جلالت اسی نومسلم کا بیٹا ہوگا۔

جوڑوں کے درد سے نجات پایئے!

ہزاروں لوگوں کی طرح اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے کے مسائل سے نجات حاصل کیجئے

JOINTA

HERBAL ANALGESIC CREAM

جوڑوں پر روزانہ جوائنٹا لگایئے

درد سے جان چھڑایئے

- بے حد موثر ہربل فارمولا Rs.300/=
- PCSIR سے تصدیق شدہ
- ہربل ہونے کی بدولت کوئی سائڈ ایفکٹ نہیں
- ماہرین کی نگرانی میں تیار کردہ

جوائنٹا کریم

جوڑوں کے درد سے نجات کا پیغام آپ کے نام!

جوائنٹا کریم بذریعہ کوریئر/وی پی پی اپنے گھر منگوانے کیلئے فون کیجئے

0315-3830001, 0315-3830002

کراچی میں جوائنٹا کریم حاصل کرنے کیلئے

مراد میڈیکو اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال 0213-4943664

786 میڈیکل اسٹور بلاک 17 گلستان جوہر نزد جوہر چورنگی 0213-4010647

یاد رکھیئے، جوائنٹا کریم کسی اور دوسرے میڈیکل اسٹور یا رابطہ نمبر کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتی

اسکندریہ کی یہودی جماعت نے اسرار احمد کی جسمانی قوت کا جس طرح ذکر کیا تھا' وہ قوت جلالت اسرار میں موجود تھی۔ پھر وہ تھرڈ ڈگری کی تمام درندگی اس پر آزما چکے تھے۔ اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کے ربی ہیکل کے سورماؤں کی جو خصوصیات بیان کرتے آئے تھے' وہ تمام خصوصیات جلالت اسرار میں موجود تھیں۔ وہ قیدی جسے وہ ٹارچر سیل میں ہی مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اب ان کے ایک اہم دینی معاملے میں اہمیت اختیار کر رہا تھا۔

آرمی افسران نے اپنے دو معزز ربیوں کو بلایا۔ انہیں جلالت اسرار اور اس کے باپ اسرار احمد کے بارے میں تفصیلات بتائیں پھر پوچھا۔ ''کیا ہم یقین کر لیں کہ یہ جلالت ہیکل کے بارہ سورماؤں میں سے ایک ہے؟''

ایک ربی نے کہا۔ ''وہ کہاں ہے؟ اسے سامنے لاؤ۔''

جلالت کو پچھلے روز ایک اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ جب اسے سپاہیوں کے نرغے میں لایا گیا تو افسران اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سینہ تان کر اپنے پیروں پر چلتا ہوا آیا تھا۔

ایک افسر نے کہا۔ ''محترم ربی! کل اسے ٹارچر سیل میں پہنچایا گیا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں' یہ اپنے پیروں سے چلنے کے قابل نہیں رہا تھا مگر اب دیکھیں! پہاڑ کی طرح تن کر آیا ہے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''اس کی ایک آدھ ہڈی یا پسلی ٹوٹنی چاہیے تھی لیکن ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔''

دونوں ربی اسے توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''تمہیں کسی بھی مذہبی پیشوا کا احترام کرنا چاہیے۔''

جلالت نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں' میں نے آپ کے آگے احتراماً دونوں ہاتھ باندھ لیے ہیں۔''

''سر بھی جھکانا چاہیے۔''

''یہ سر صرف خدا کے آگے جھکتا ہے۔''

دونوں ربی نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ ''شاباش! یہ نشانیاں ہم دیکھ رہے ہیں۔''

دوسرے نے پوچھا۔ ''کیا یہ چیختا' چلاتا اور رحم کی بھیک مانگتا ہے؟''

ایک افسر نے کہا۔ ''آپ سوچ بھی نہیں سکتے' یہ کتنا ڈھیٹ ہے، کل اذیتیں برداشت کرتے کرتے بیہوش ہو گیا تھا لیکن منہ سے کراہنے کی بھی آواز نہیں نکالی۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''یہ مضبوط قوت ارادی اور مستقل مزاجی ہے۔ ہم نشانیاں دیکھ رہے ہیں۔''

ایک افسر نے کہا۔ ''ہماری دینی کتاب ہیکل کے سورما کے مطابق یہ یہودی نہیں ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''جیسا کہ تم لوگوں نے ابھی بتایا ہے' اس کا باپ یہودی تھا۔ اس یہودی نے زبان سے اسلام قبول کیا ہے۔ جسمانی طور پر نمازیں پڑھی ہوں گی لیکن رگوں میں دوڑنے والا لہو تو ہزاروں برسوں سے یہودی ہے۔ اس قیدی کی رگوں میں یہودیت گرم رفتار ہے۔ یہ اسلام سے سحر زدہ ہے۔ ابھی خوابیدہ ہے۔ ہم اسے بیدار کریں گے تو یہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کی طرف لوٹ آئے گا۔''

جلالت اسرار خاموش کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسرائیلی فوجی افسران اسے یہودی کیوں بنانا چاہتے ہیں؟

ایک ربی نے کہا۔ ''ابھی ایک اہم نشانی باقی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''جلالت اسرار! جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے' تمہاری ماں نے سفر کے دوران تمہیں جنم دیا اور تمہارا باپ کہیں دشمنوں سے مقابلے میں مارا گیا۔ کیا تمہیں معلوم ہے' تمہاری ماں نے سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے تمہیں کہاں جنم دیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہیکل میں....''

وہ مختصر سا جواب ایسا تھا' جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ دونوں ربی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے احترام میں تمام افسران بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ربی نے پوچھا۔ ''کیا زچگی کے وقت تمہاری والدہ ہیکل میں تھیں؟ پلیز ہمیں ایک ایک بات بتاؤ۔ تمہاری پیدائش کی رات کیا ہوا تھا؟''

جلالت اسرار اپنی ماں سے جو کچھ سن چکا تھا' اُسے من و عن بیان کرنے لگا۔ وہ دونوں ربی سن رہے تھے' بڑی عقیدت سے اسے دیکھ رہے تھے اور ایک ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''ہاں۔ اُن دنوں ہیکل کی دیوار سے لگا ہوا ایک گڑھا تھا۔''

دوسرے ربی نے کہا۔ ''گویا تم ہیکل کی بنیاد میں پیدا ہوئے تھے۔''

پہلے ربی نے افسران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج سے دو ہزار سال پہلے ہمارے ایک ربی نے کتاب ''ہیکل کے سورما'' لکھی تھی۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے کہ وہ بارہ سورما تابوت سکینہ لے کر آئیں گے اور ان میں سے جو پہلا سورما ہوگا' وہ ہیکل سے نمودار ہوگا۔''

چند لمحوں کے لیے سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ان لمحات میں سب ہی پورے یقین سے اور عقیدت سے جلالت اسرار کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ان ربیوں نے اچانک ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا پھر اسے چوم کر کہا۔ ''ہے خداوند یہوداً! تیرا وعدہ پورا ہونے والا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''قیامت قریب ہے۔ ہمارا نجات دھندا دجال اکبر آئے گا اور ہیکل کے بارہ سورما تابوت سکینہ میں مقدس امانتیں لے کر آئیں گے۔''

پہلے ربی نے کہا۔ ''اس کی زنجیریں کھولو۔ یہ معزز ہے محترم ہے۔ مقدس امانتوں کا پہلا امین ہے۔''

آرمی افسران اگرچہ جلالت سے متاثر ہو گئے تھے' کھلی نشانیوں کے مطابق وہ ہیکل کا پہلا سورما ثابت ہو رہا تھا لیکن فوجی قوانین کے مطابق اسے رہا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ زنجیریں کھلتے ہی وہ ان پر چڑھ دوڑے گا۔ ٹارچر سیل کا تمام حساب بے باق کر دے گا۔ ایک افسر نے کہا۔ ''محترم ربی! یہ بہت خطرناک قیدی ہے۔ زنجیریں کھلتے ہی ہماری جان کو آ جائے گا۔ حقیقتاً دیکھا جائے تو یہ فلسطین کا باغی شہری ہے اور ہم اسرائیلیوں کا جانی دشمن ہے۔ حماس کے لیڈر اس کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

ربی نے کہا۔ ''تم اس کی ظاہری دنیاوی حیثیت بیان کر رہے ہو۔ ہم روحانی معاملات کو سمجھتے ہیں۔ آج کا دن ہمارے لیے بہت بڑا ہے۔ بہت اہم ہے۔ بارہ میں سے ایک سورما آج ہمارے درمیان ظاہر ہوا ہے۔ اسے عزت اور احترام دو۔ اس کے متعلق بہت سی باتیں کہنے کو رہ گئی ہیں۔ وہ باتیں ہم تنہائی میں کریں گے۔''

دوسرے ربی نے کہا۔ ''تم اپنے فوجی قوانین پر عمل کرو لیکن اسے ایک آرام دہ چار دیواری میں نظر بند رکھو۔ زنجیریں کھول دو۔ جتنی عزت اور احترام دے سکتے ہو' دیتے رہو۔ ہم وہاں جا کر اس سے ملاقات کرتے رہیں گے۔''

یہ مشورہ قابل قبول تھا۔ جلالت اسرار کو ایک آرام دہ بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس بنگلے کے چاروں طرف مسلح گارڈز کا سخت پہرا لگا دیا گیا۔ اندر وہ پوری طرح آزاد تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ یہودیوں کی نظروں میں مجرم نہیں ہے۔ بلکہ معزز ہو گیا ہے۔ ماں نے ایک بار کہا تھا کہ وہ ہیکل کا سورما ہے.... اب وہ بات درست ثابت ہو رہی تھی۔

اس معاملے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے یہودی حکمرانوں' فوجی افسروں اور موساد تنظیم سمیت دیگر انٹیلی جنس والوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں چھ بزرگ اور معزز ربی بھی شریک تھے۔

اجلاس کے آغاز میں تمام ربیوں نے یہ کہہ دیا کہ دو ہزار سال پرانی کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے' وہ ہیکل سے نمودار ہونے والا پہلا سورما ہے اور اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک حاکم نے کہا۔ ''قدیم کتابوں کے مطابق وہ بارہ سورما یہودی ہیں۔ جبکہ یہ نمودار ہونے والا پہلا سورما مسلمان ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''اگر اس کے باپ نے مسلمان ہونے کی غلطی کی ہے تو اس غلطی کو مٹایا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس سفلی جادوگر اور ہپناٹزم کے ماہرین ہیں۔ وہ اس کا برین واش کریں گے تو موجودہ اسلامیت مٹ جائے گی۔ وہ کٹر یہودی بن جائے گا۔''

اجلاس میں سب ہی اس مشورے پر بحث کرنے لگے۔ آخر کار راضی ہو گئے۔ ربی نے کہا۔ ''صرف تنویمی عمل ہی نہیں کیا جائے گا۔ پہلے کالے جادو کے ذریعے اس کے دماغ کو کمزور بنایا جائے گا۔ ہم اسے کئی آزمائشی مراحل سے گزاریں گے۔ جب وہ کسی شک و شبے کے بغیر یہودی بن جائے گا' تب ہم اس پر بھروسا کریں گے۔''

موساد اور آرمی انٹیلی جنس کے افسران نے کہا۔ ''ہم بھروسا کرنے کے باوجود اسے کڑی نگرانی میں رکھیں گے۔ اس کا برین واش ہو جائے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

جلالت اسرار ایک چھوٹے سے محل میں رہنے لگا۔ وہاں آرام و آسائش کا اور ضروریات کا تمام سامان موجود تھا۔ اس کی خدمت کے لیے انتہائی خوبصورت کنیزیں تھیں۔ وہ بات بات پر ہنستی کھلکھلاتی تھیں۔ دل کو لبھانے والی ادائیں دکھا کر گزر جاتی تھیں۔ ان طرحدار حسیناؤں کی ادائیں گناہ کی ترغیب دیتی تھیں۔ اس نے ان سب کو جھڑک دیا تھا۔ غصہ سے حکم دیا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ۔ ورنہ ایک ایک کو اُٹھا کر چھت پر لے جاؤں گا اور نیچے پھینک دوں گا۔''

وہ سب کی سب سہم کر چلی گئیں۔ اس نے رنگ محل کے منتظم اور نگراں افسر سے کہا۔ ''میری خدمت کے لیے مرد ملازم رکھے جائیں۔ مجھے عورتوں کی موجودگی پسند نہیں ہے۔''

وہ کھانے پینے کے معاملے میں بھی محتاط رہتا تھا۔ بند کمرے میں تنہا بیٹھ کر کھاتا تھا۔ پہلے ہر کھانے اور مشروب کو چکھتا تھا۔ جس میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا' اس کا تھوڑا حصہ کموڈ میں ڈال دیتا تھا۔ یہ تاثر دیتا تھا کہ انہیں حلق سے اتار

چکا ہے۔ اس نے چکھنے کے دوران ہی مضر رساں دواؤں کے اثرات کو محسوس کیا تھا اور یہ شکایت کرنے لگا تھا کہ اعصابی کمزوری محسوس کرنے لگا ہے۔ ڈاکٹر آکر اسے چیک کرتے تھے۔ تسلیاں دیتے تھے اور دوائیں دے کر چلے جاتے تھے۔

وہ تدبیریں سوچ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ آرمی کے شکنجے سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان کے دینی پیشوا اور تمام یہودی ہاتھ آئے ہوئے ایک سورما کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے برعکس ان کا سورما بن کر سب ہی دشمنوں کا اعتماد حاصل کرسکتا تھا۔ یہ بات اس کے دماغ میں پک رہی تھی کہ یہودیوں کی ہاں میں ہاں ملائے' ان کا حامی بن کر رہے اور گھر کا بھیدی بن کر لنکا ڈھاتا رہے۔

اس نے دوسرے ہی دن ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ دماغی اور جسمانی طور پر کمزور بن گیا۔ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ رہا۔ دو ڈاکٹروں نے آکر معائنہ کیا۔ دو ربی اور افسران بھی آکر اس کی حالت دیکھنے لگے۔

انہیں پورا یقین ہوگیا کہ ان کی دی ہوئی دوائیں اپنا اثر دکھا چکی ہیں۔ انہوں نے افسران سے اور ربیوں سے کہا۔ ''اس کا دماغ کمزور ہو چکا ہے۔ اب اس پر آسانی سے تنویمی عمل کیا جاسکے گا۔''

اسی دن ہپناٹزم میں مہارت رکھنے والے ایک ربی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ تنویمی عمل کے لیے ایک خالی کمرا تھا۔ کمرے کے در و دیوار اور پردے بالکل سیاہ تھے۔ اس کے اندر جا کر یوں لگتا تھا' جیسے تاریک قبر میں اتر آئے ہوں۔ جلالت کو وہاں لا کر ایک اسٹریچر نما بیڈ پر لٹا دیا گیا۔

وہاں کیمرے اور مائیکروفون نصب کیے گئے تھے۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ربی اور اعلیٰ افسران بڑی سی اسکرین پر دیکھ سکتے تھے کہ اسے کس طرح ہپناٹائز کیا جارہا ہے؟ عامل کیسے سوالات کررہا ہے اور معمول بن جانے والا جلالت اپنے عامل کو کیا جواب دے رہا ہے؟

جب ہپناٹائز کرنے والے ربی نے اس پر عمل شروع کیا تو وہ دماغی طور پر کمزور نہیں رہا تھا۔ عامل کی باتوں اور حرکتوں سے سحر زدہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنی پلاننگ کے مطابق ٹرانس میں آگیا۔ یہ تاثر دینے لگا کہ ان کا معمول بنتا جارہا ہے۔

عامل نے پہلے اپنے عمل کے ذریعے اسے دنیا کے تصور اور اس دنیا سے آنے والی آوازوں سے محروم کردیا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا سن رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''گہری تاریکی ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔''

عامل نے حکم دیا۔ ''دو ہزار سال پیچھے جاؤ۔ وہاں خود کو تلاش کرو۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر جلالت نے کہا۔ ''کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔''

اس نے حکم دیا۔ ''اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی کو دیکھو۔''

پھر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ جلالت نے سوچ رکھا تھا کہ اسے سوالوں کے جوابات کس طرح دینے ہیں؟ اس نے کہا۔ ''میں ایک اجنبی ہیکل کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے باپ کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ یہ دعویٰ کررہا ہے کہ میرا باپ ہے۔''

عامل نے کہا۔ ''اس سے کہو' اگر وہ گیارہ سورماؤں کا پتا ٹھکانا بتائے گا تو تم اسے اپنا باپ تسلیم کرلو گے۔''

وہ ذرا خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''یہ کہتا ہے' گیارہ سورما اسی دنیا میں موجود ہیں۔ وہ بھی میری طرح باسٹھ برس کے بوڑھے ہوں گے۔ مگر صحت مند نظر آئیں گے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا۔''

''معلوم کرو' ان سورماؤں کو کیسے تلاش کیا جائے گا؟''

''انہیں تلاش نہ کیا جائے۔ جس طرح میں خود ہی نمودار ہوا' اسی طرح میرے وہ گیارہ ساتھی ایک کے بعد ایک از خود سامنے آئیں گے اور اس کے لیے لازم ہے کہ میں سورماؤں کا طرزِ حیات اختیار کروں۔''

''پوچھو کہ سورماؤں کا طرزِ حیات کیا ہے؟''

جلالت نے ذرا خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''سورما کسی مظلوم اور بے گناہ پر نہ ظلم کرتے ہیں' نہ ان پر ظلم ہوتے دیکھتے ہیں۔ سورما صرف اپنے مذہبی پیشوا کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔''

وہ عامل اپنے معمول کو دیکھنے لگا پھر وہ یہودیت کا سبق پڑھانے لگا۔ جلالت اسرار اسے خوش فہمی میں مبتلا کررہا تھا۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے یہودی اکابرین اسے ہپناٹائز ہوتے دیکھ رہے تھے۔ یہ اطمینان ہو رہا تھا کہ وہ پہلا سورما ان کے تاریخی سیکل کے سورماؤں کی طرح یہودی بن چکا ہے۔

تنویمی عمل کی پختگی یقین دلا رہی تھی کہ ایسا ہو چکا ہے اور آئندہ جلالت اسرار کی گفتار اور رفتار سے یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ ان کا وفادار یہودی بن چکا ہے یا نہیں؟

☆☆☆

ایان مینشل اسپتال سے گھر آگیا تھا۔ اب گھر میں ماں تھی' نہ باپ تھا۔ ماں کو اس نے گولی ماردی تھی اور باپ کو یہودیوں کے شکنجے میں پہنچا دیا تھا۔ خالی گھر میں ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک بار اندر جا کر پھر باہر آگیا۔ ایک چبوترے پر ماتمی انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

باپ سزا بھگتنے چلا گیا تھا لیکن ماں اب تک خواب میں نہیں آئی تھی۔ اسے مظلوم اور مقتول ماں کا پیار نہیں مل رہا تھا۔ آئے دن کی گولہ باری کے باعث کتنے ہی گھر اجڑتے رہتے تھے۔ حماس والوں نے ایک اجڑی ہوئی فیملی کو ایان کے ساتھ رہنے کے لیے اس کے گھر بھیج دیا تھا۔ اس طرح اسے بزرگوں اور نئے منہ بولے رشتوں کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی۔

اس وقت وہ نئی فیملی کے بزرگ ذابر العمرو کے ساتھ بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ اچانک ہی غزہ کی پوری پٹی میں خطرے کا سائرن گونجنے لگا۔ وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ ذابر نے کلاشنکوف اٹھائی اور ایک رائفل کو ایان کی طرف اچھالا۔ ایان نے اسے کیچ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چھت پر جاتا ہوں۔ تم یہاں رہو۔''

وہ جواب سنے بغیر دوڑتا ہوا سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا دھماکا ہوا۔ ایسے وقت فوراً ہی انفارمشن سینٹر کو اطلاع دی جاتی تھی کہ اسرائیلی فوجی کہاں حملے کررہے ہیں؟ پھر تمام فلسطینی باشندے اپنے اپنے موبائل فون کے ذریعے انفارمشن سینٹر سے صحیح معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔

معلوم ہوا' شمالی غزہ کے علاقے بیت الجبیہ میں اسرائیلی طیاروں نے ایک گاڑی کو میزائل سے نشانہ بنایا ہے۔ گاڑی تباہ ہوگئی تھی۔ دو فلسطینی شہید ہو چکے تھے۔ باقی دو زخمیوں کو اسپتال پہنچایا گیا تھا۔

فلسطینیوں کے معاملات اور امورِ خارجہ سے نمٹنے والے سیکریٹری نے اسرائیلی حکام سے فون پر احتجاج کیا اور اقوام متحدہ کے دفتر میں شکایت درج کرائی۔ فلسطینی اسی طرح این جی اوز اور دیگر سماجی و سیاسی تنظیموں کے ذریعے ساری دنیا میں اپنی فریاد پہنچاتے رہتے تھے۔

تمام ربی اور آرمی کے افسران جلالت اسرار کو طرح طرح سے آزما رہے تھے۔ کئی ربیوں نے اسرائیلی اکابرین کو یقین دلایا تھا کہ یہ وہی سورما ہے' جس کا ہزاروں سال سے انتظار کیا جارہا تھا۔ اب یہ آزمایا جارہا تھا کہ تنویمی عمل کس حد تک کامیاب رہا ہے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے دین کو بھول چکا ہے۔ اس نے بے انتہا ظلم و ستم کے باوجود پہلے دن قید خانے میں نمازیں پڑھی تھیں۔ تنویمی عمل کے بعد نمازیں بھول گیا تھا۔ بسم اللہ اور انشا اللہ جیسے الفاظ زبان پر نہیں آتے تھے۔

وہ نکاح پڑھائے بغیر کسی حسینہ کو اپنے قریب برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس نے تمام حسیناؤں کو اپنی رہائش گاہ سے باہر نکال دیا تھا۔ اب اس کا مزاج بدل گیا تھا۔ پارسائی ہوا ہوگئی تھی۔ وہ حسین لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ان کے ساتھ راتیں گزارنے لگا تھا۔

میجر ہارپر نے سینی گاگ میں آکر ایک ربی سے شکایت کی کہ اس کے برین واشنگ میں خامی رہ گئی ہے۔ ابھی اس کے اندر اسلام باقی ہے۔ وہ آج بھی کسی مسلمان عورت کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

ربی نے پوچھا۔ ''کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے' کسی کو مظلوم بنا کر اس کی عزت سے نہیں کھیلے گا۔''

ربی نے کہا۔ ''وہ تنویمی عمل کے دوران کہہ چکا ہے کہ ہیکل کے سورما کسی مظلوم اور بے گناہ پر نہ ظلم کرتے ہیں اور نہ ان پر ظلم ہوتے دیکھتے ہیں۔ سورما صرف اپنے مذہبی پیشوا کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔''

میجر نے کہا۔ ''جب وہ یہودی بن چکا ہے تو فلسطینیوں کا سر کچل سکتا ہے۔''

''بے شک سورماؤں کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے۔ کوئی حملہ کرے تو منہ توڑ جواب دیتے ہیں۔''

جلالت اسرار رات کے آٹھ بجے آرمی ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔ وہاں اسے پہننے کے لیے فوجی وردی دی گئی۔ یہ بریفنگ دی گئی کہ کس طرح غزہ کی سرحد پر پہنچ کر پیش قدمی کرنی ہے؟

جلالت نے کہا۔ ''سوری۔ میں پیش قدمی نہیں کروں گا۔ جب تک دشمن ہمارے علاقے میں نہیں آئیں گے' تب تک ان پر گولی نہیں چلاؤں گا۔''

ایک آرمی افسر نے غصے سے کہا۔ ''واٹ نان سنس؟ کیا وہ ہمارے علاقے میں گھس آئیں گے' ہم پر گولیاں چلائیں گے' ہمیں موت کے گھاٹ اتاریں گے' تب تم ان پر گولیاں چلاؤ گے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جب وہ گولیاں چلاتے ہوئے

داخل ہوں گے تو میں ضرور جواباً گولیاں چلاؤں گا۔ لیکن گولیاں چلانے کے لیے ان کی سرحد میں نہیں جاؤں گا۔"

وہ میجر ہار پر کے ساتھ رات کے دس بجے وہاں سے روانہ ہوا۔ ایک درجن گاڑیوں میں مسلح فوجی تھے۔ فاضل اسلحہ بھی تھا۔ وہ پوری تیاریوں کے ساتھ بارڈر لائن پر پہنچے۔ وہاں خاموشی اور گہری تاریکی تھی۔ ان کے پاس اینٹی ڈارک لینسس تھے۔ وہ اندھیرے میں دور تک دیکھ سکتے تھے۔ اپنی پلاننگ کے مطابق دائیں بائیں پھیل گئے تھے۔ میجر ہار پر درمیان میں تھا۔ اس نے جلالت سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جلالت مقابلے پر آنے والے کتنے فلسطینیوں کو گولی مارے گا؟ مارے گا بھی یا نہیں؟

فلسطینی مجاہدین اپنی سرحدی لائن میں ہوں گے۔ اسرائیلی زمین پر نہیں تھے۔ کسی کو مشتعل کیا جائے' تب ہی وہ بھڑکتا ہے۔ میجر ہار پر نے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ منی ٹائم بم پھینکے جائیں۔

یہ منی بم سائز میں دو انچ کے ہوتے تھے۔ ان میں جو ٹائم فکس کیا جاتا تھا' وہ ٹھیک اسی وقت بلاسٹ ہوتے تھے۔ اس ایک ننھے سے بم کے ذریعے تباہی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایک یا دو دشمن ضرور مارے جاتے تھے۔

دو سپاہیوں نے میجر کے حکم کے مطابق ٹائم فکس کر کے دو بم سرحد پار پھینکے۔ مجاہد مستعد رہا کرتے تھے۔ ان بموں کے بلاسٹ ہوتے ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ دوسری طرف سے اشتعال انگیزی ہو رہی ہے۔ وہ زمین پر لیٹ کر رینگتے ہوئے سرحدی لائن پر آ گئے۔

انہوں نے اپنے آگے مصنوعی جھاڑیاں بنا رکھی تھیں۔ ان جھاڑیوں کو آگے بڑھانے کے بعد خود آگے رینگتے جاتے تھے۔ ایسے وقت دو سپاہی اور ان کا ایک جونیئر آفیسر ڈارک لینس لگائے دور تک دیکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک درخت کے پیچھے تھا۔ آگے کی طرف جھک کر دیکھ رہا تھا۔ ایک گولی سیدھی اس کی پیشانی پر آ کر لگی۔ حلق سے بس ایک کراہ نکلی۔ پھر وہ بولنے کے قابل نہ رہا۔

دو جھاڑیوں کے پیچھے تھے' انہیں اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آخری بار دیکھنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے تو تڑاتڑ کی آوازوں کے ساتھ ہی چیخیں مارتے ہوئے موت کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔ اسرائیلیوں نے جوابی فائرنگ کی۔ بڑی دیر تک رات کا سناٹا گونجتا رہا۔ مگر وہ کس پر فائر کر رہے تھے؟

سامنے جھاڑیاں تھیں۔ مجاہدین ان کے پیچھے سے رینگتے ہوئے دور چلے گئے تھے۔ انہوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ دشمن صرف ساٹھ یا ستر گز تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب وہ ان کے دائیں بائیں جا رہے تھے۔

جلالت اسرار دوسروں کی طرح زمین پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ مجاہدین اندھیرے میں اسے نہیں پہچانیں گے۔ گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ لہٰذا وہ اپنی سلامتی کے سلسلے میں بھی محتاط تھا۔

میجر ہار پر اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ زمین پر اوندھے منہ پڑا زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ باغی کہاں مر گئے ہیں؟ انہوں نے جوابی فائرنگ نہیں کی ہے اور ہماری فائرنگ سے کسی کے چیخنے یا کراہنے کی آواز بھی نہیں آئی ہے۔"

اچانک ہی ان کے دائیں بائیں سے فائرنگ ہونے لگی۔ کئی سپاہیوں کی چیخیں سنائی دیں۔ پیچھے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے بھاگنے کے دوران فائرنگ کی۔ دو چار مجاہدین نشانے پر آ گئے۔

جلالت نے بھاگنے کے دوران میجر کے قریب ہو کر کہا۔ "یہ میرا یا تمہارا آخری وقت ہو سکتا ہے۔ تمہارے ایک اعلیٰ افسر نے کہا تھا' تم یہودیوں کی نظروں میں مسلمان ہونا ایک گالی ہے۔"

وہ اس کے ساتھ دوڑتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ "کلمہ کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ گالی مٹا دی جاتی ہے۔ چلو مٹ جاؤ۔"

جلالت نے اس کی پشت پر دو گولیاں ماریں۔ ہر سمت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایسے وقت یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ کس نے کس پر گولی چلائی ہے؟ وہ چیخ مار کر گرا پھر ہمیشہ کے لیے چیخنا بھول گیا۔

جلالت نے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو آواز دی۔ "میجر کو گولیاں لگی ہیں۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔"

تین سپاہی دوڑتے ہوئے آئے ان میں سے دو نے اس لاش کے دو ہاتھ پکڑے۔ تیسرے نے ٹانگیں پکڑیں۔ پھر اسے اٹھا کر دوڑنے لگے۔ وہ میدان نہیں چھوڑ رہے تھے۔ فلسطینیوں کے حصار سے نکلتے ہی رک گئے۔

دوسرا افسر گائڈ کر رہا تھا۔ وہ تمام سپاہی دائیں بائیں پھیلتے ہوئے فائرنگ کرنے لگے۔ مجاہدین انہیں دور تک رگیدتے ہوئے ان کی زمین پر آ گئے تھے۔ لہٰذا جوابی فائرنگ کرتے ہوئے اپنی سرحد کی طرف واپس جانے لگے۔

ایک طرح سے اب وہ مجاہدین کو رگید رہے تھے۔ وہ تعداد میں کم تھے۔ ان کی تعداد اور کم ہو رہی تھی۔ اسرائیلی

فوجی خاصی تعداد میں ہلاک ہوئے تھے۔ جلالت اسرار تاریکی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ زمین پر رینگتا ہوا سپاہیوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ ایک ایک' دو دو کر کے ان کی تعداد کم کر رہا تھا۔

مجاہدین اپنی سرحد میں واپس آ گئے تھے۔ لیکن اسرائیلی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اس لیے جھنجلا رہے تھے کہ ان کے سپاہی خاصی تعداد میں مر چکے تھے۔ وہ حساب برابر کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مجاہدین کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر نقصان اٹھا رہے تھے۔ وہاں دیگر تنظیموں کے مجاہدین آ گئے تھے۔ اب وہ بھاری پڑ رہے تھے۔

ایسے ہی وقت جلالت نے بہت قریب سے اپنی پارٹی کے ایک لیڈر غالی ارتضیٰ کو دیکھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس زخمی حالت میں تھا۔ وہاں سے رینگتا ہوا دور جانا چاہتا تھا۔ لیکن فوجی افسر نے سامنے آ کر گن تان لی۔ پھر کہا۔ "تم غالی ہو۔ ہم نے آج بہت نقصان اٹھایا ہے۔ مگر منافع میں تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ کم آن... جانوروں کی طرح رینگتے ہوئے میرے آگے آگے چلو۔"

غالی نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ اس کی گن خالی ہو چکی تھی۔ ایک بھرا ہوا ریوالور کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کرتا تو مارا جاتا۔ یوں بھی قیدی بن کر ذلتیں اٹھانے کے بعد مرنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنی سلامتی کی خاطر آخری کوششیں کرتا۔

جلالت چھپا ہوا دیکھ رہا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا لیڈر جان پر کھیل جانے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی اس نے فوجی افسر کو گولی مار دی۔ غالی نے ریوالور اٹھا لیا۔ حیرانی سے اندھیرے میں دیکھنے کی کوششیں کرنے لگا کہ کس نے اس دشمن سے نجات دلائی ہے؟

جلالت نے آواز اور لہجہ بدل کر کہا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً یہاں سے جاؤ۔ ان کے دو افسران مارے گئے ہیں۔ یہ واپس جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

غالی رینگتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ جلالت اس افسر کی لاش کو اٹھا کر کاندھے پر لاد کر دوڑتا ہوا سپاہیوں کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمارا دوسرا افسر بھی مارا گیا ہے۔ اب ہمیں کمانڈ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

اس نے لاش کو زمین پر ڈال دیا۔ دوسرے سپاہی اسے اٹھا کر لے جانے لگے۔ واقعی وہ کسی کمانڈر یا جونیئر افسر کے بغیر جنگ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر یہ دیکھ رہے تھے کہ مجاہدین کی تعداد اچانک بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا تمام سپاہی احتیاطاً فائرنگ کرتے ہوئے فلسطینی زمین سے باہر آ گئے' گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس جانے لگے۔

انہوں نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر حساب لگایا۔ ان کے اٹھارہ سپاہی اور دو افسران مارے گئے تھے۔ جلالت نے دل ہی دل میں حساب کیا۔ اس نے دو افسران اور آٹھ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر دل ہی دل میں کہا۔ "یا اللہ! مجھے معاف فرما۔ یہ یہودی بے حد و حساب قوتوں کے مالک ہیں۔ ان سے لڑنے کے لیے مجھے یہ ہتھیار مل گیا ہے۔ میں عارضی طور پر اپنے دین سے دور ہو کر یہودی بن گیا ہوں۔ لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بن گیا ہوں۔ آئندہ بھی یہودی بن کر ان کے چودہ طبق روشن کرتا رہوں گا۔"

اس کے پاس دو منی ٹائم بم تھے۔ جو چیزیں اس نے استعمال نہیں کی تھیں' انہیں ہیڈ کوارٹر میں جمع کرنا تھا اور وہ ایک ٹائم بم کسی ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے ایک مردہ سپاہی کی جیب سے ضرورت کی یہ چیز حاصل کی تھی۔ پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر بالوں کے درمیان ایک ٹیپ سے چپکا لیا تھا۔ اس کے بال گھنے اور لانبے تھے۔ وہ منی ٹائم بم کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر تمام ہتھیار اور دو منی ٹائم بم اس رپورٹ کے ساتھ جمع کر دیے کہ انہیں استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے وردی بھی اتار دی۔ اپنا لباس پہن کر نگرانی کرنے والے افسران اور سپاہیوں کے ساتھ اپنی رہائش گاہ میں واپس آ گیا۔

☆☆☆

پچھلی تمام رات گولیوں کی گونج میں اور بم کے دھماکوں میں گزری تھی۔ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو کر آیا تھا۔ صبح سے شام تک گہری نیند سوتا رہا۔ شام کو آنکھ کھلی تو اپنے متعلق سوچنے لگا۔ "کیا واقعی میں ہیکل کا سورما ہوں؟ دوسرے سورماؤں کے متعلق یہ پیشگوئی ہے کہ وہ سب عجیب و غریب انداز میں نمودار ہوتے رہیں گے۔ آخری بارہواں سورما سب سے اہم ہے۔ وہی گیارہ سورماؤں کو بتائے گا کہ تابوتِ سکینہ کہاں ہے؟"

جلالت چاروں شانے چت لیٹا چھت کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ "پتا نہیں وہ آخری سورما کب نمودار ہو گا؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ملحقہ ڈائننگ روم میں کھانا لگایا جارہا تھا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی دھن پر پانچ کنیزیں رقص کررہی تھیں۔ ان میں سے چار جانی پہچانی تھیں۔ ایک نئی تھی۔ ایک کنیز سے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ مونیکا ہے۔ سترہ برس کی ہے۔''

دوسری کنیز نے کہا۔ ''یہ اَن ٹچڈ ہے۔ پہلے تمہارے پاس آئی ہے۔''

تیسری کنیز نے کہا۔ ''دیکھ رہے ہو' کتنی حسین وجمیل ہے۔ ہمیں تو بھلا دیتے ہو۔ اسے بھی بھلا نہیں پاؤ گے۔''

چوتھی بھی کچھ بولنا چاہتی تھی۔ جلالت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''بس .... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جاؤ یہاں سے۔ صرف مونیکا رہے گی۔''

وہ چاروں مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ جلالت کھانے کی میز پر آگیا۔ مونیکا اس کی پسند کے مطابق ڈشیں اٹھا کر پیش کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''یہاں بیٹھو۔ میرے ساتھ کھاتی رہو اور بولتی رہو۔''

وہ اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اپنے بارے میں کہنے لگی۔ ''میں نہیں جانتی' میرے ماں باپ کون ہیں؟ میری پرورش ایک ایسے ٹریننگ سینٹر میں ہوئی ہے' جہاں غیر ملکی حکمرانوں کی میزبانی کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ انہیں خوش کرنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔''

وہ کھانے کے دوران بولتی رہی۔ اس سے بے تکلف ہوتی رہی۔ رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ وہ کھانے کے بعد ٹیرس پر آکر ٹہلنے لگے۔ اس رنگ محل کے باہر بہت اونچی خاردار چاردیواری تھی۔ احاطے کے اندر اور باہر مسلح گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ وہاں کوئی بڑا سرکاری عہدیدار بھی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ دونوں کھلے آسمان کے نیچے ٹہلتے رہے اور ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے رہے۔ پھر جلالت نے کہا۔ ''میں جوس پینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم سونے جائیں گے۔''

وہ جوس تیار کرنے کے لیے نیچے چلی گئی۔ جلالت اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ وہ کچھ پراسرار سی لگ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے محتاط رہنے کا اشارہ کررہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر ٹیرس سے اتر کر کمرے میں آگیا۔

وہ ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے ایک تپائی پر جوس سے بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔ وہ دوسری کرسی پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گئی۔ جلالت کھانے پینے سے پہلے ہر چیز کو سونگھتا تھا یا ذرا سا چکھتا تھا۔ مونیکا نے کھانے کے دوران اسے ایسا کرتے دیکھا تھا۔ اس نے جوس کے گلاس کو اٹھا کر سونگھا۔ پھر سوچا' جوس کی مہک کے علاوہ ایک اور ہلکی سی بو محسوس ہوئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مونیکا کو دیکھا۔

وہ ذرا پریشان ہوکر بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

اس نے گلاس کو تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے دو گھونٹ تم پیو۔''

وہ ایکدم سے سیدھی ہوکر یوں بیٹھ گئی' جیسے وہاں سے بھاگنے ہی والی ہو لیکن اس کی اجازت کے بغیر کمرے سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ جلالت نے کہا۔ ''یہ میرا حکم ہے' گلاس اٹھاؤ اور پینا شروع کردو۔''

وہ شکست خوردہ سی ہوکر بولی۔ ''پینا ہی پڑے گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ کر آئی تھی کہ تمہیں زہر دینے کے بعد شاید ہی یہاں سے زندہ جاسکوں گی۔ باہر سیکیورٹی والے مجھے مار ڈالیں گے۔''

اس نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم جان پر کھیل کر مجھے زہر دینے کیوں آئی ہو؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ گلاس کو اٹھالیا۔ جلالت نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ پھر گلاس لے کر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میری بات کا جواب دو۔ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ تم میری جان کیوں لینا چاہتی ہو؟''

وہ اچانک ہی حقارت سے بولی۔ ''میں یہودیوں کو زمین کا بوجھ سمجھتی ہوں۔ اب تک چار کو مار چکی ہوں۔ کہیں تو مجھے پھنسنا ہی تھا۔ یہاں آکر پھنس گئی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تعجب ہے۔ تم یہودی ہوکر یہودیوں سے نفرت کرتی ہو؟''

''میں یہودی نہیں ہوں۔ الحمدللہ مسلمان ہوں۔''

یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ جلالت نے بے یقینی سے مگر ذرا اپنایت سے اسے دیکھا۔ ''تم... تم مسلمان ہو؟ میں کیسے یقین کروں؟''

''تمہارے یقین نہ کرنے سے مجھے کیا فرق پڑے گا؟ مجھے تو ابھی مرنا ہی ہے۔''

''اگر جھوٹ نہیں بولو گی۔ اپنی حقیقت بیان کردو گی تو تمہاری موت ٹل جائے گی۔''

اس نے بھرپور نظروں سے جلالت کو دیکھا پھر کہا۔

''سچ یہ ہے کہ میں ایک عرب مہاجر ڈاکٹر شیدہ کی بیٹی ہوں۔ جب ہم ہجرت کرکے یہاں آئے تو میں دس برس کی تھی۔ عبرانی زبان اچھی طرح لکھتی پڑھتی اور بولتی تھی۔

یہ اسرائیلی چاہتے ہیں' یہاں زیادہ سے زیادہ یہودی آکر آباد ہوں۔ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ ہمیں یہودی بن کر رہنا چاہیے۔

یہ بات سراسر ہمارے دینی جذبات کے خلاف تھی۔ میرے والد نے مجھے سمجھایا کہ وہ بوڑھے اور بیمار ہیں ... زندگی کسی وقت بھی رخصت ہوسکتی ہے۔ میں دس برس کی مہاجر لڑکی ہوں۔ کوئی میرا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ لوگ مجھے بازار میں لے جاکر بٹھادیں گے۔

یہاں یہودی مہاجروں کو روٹی کمانے کے وسائل' رہنے کے لیے مکان اور بڑی بڑی رقمیں دی جارہی تھیں۔ میں باپ کے کہنے پر یہودی بن گئی۔ ہمیں سرکاری طور پر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ میرے والد کے انتقال کے بعد مجھے ایک سرکاری ٹریننگ سینٹر میں پہنچایا گیا۔ وہاں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہودیوں کے نظریے کے مطابق مجھ میں سیاسی شعور پیدا کیا گیا۔ مجھے جاسوسہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ پھر غیر ملکی حکمرانوں کو خوش کرنے کے ہتھکنڈے بھی سکھائے گئے۔''

جلالت نے کہا۔ ''تم ضرور تایہودی بن گئیں۔ نہ دین کی رہیں نہ دنیا کی۔ پھر ابھی خود کو مسلمان کیوں کہہ رہی ہو؟''

''یہی بتانے جارہی ہوں۔ میں اٹھارہ برس کی ہوگئی۔ ایک امریکی عہدیدار اسرائیلی حکمرانوں کی اہم ضرورتیں پوری کرنے یہاں آیا تھا۔ مجھے میزبانی کے لیے اس کے حوالے کردیا گیا۔

اس وقت مجھے اپنے والد کی باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے کہا تھا' میں ایک مسلمان مہاجر لڑکی ہوں۔ کوئی مجھ سے ہمدردی نہیں کرے گا۔ لوگ مجھے بازار میں بٹھادیں گے۔ میں یہودی بن کر محفوظ رہوں گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''عورت کہیں محفوظ نہیں رہتی۔ اس رات معلوم ہوا کہ میں یہودیوں کے مہذب سیاسی چکلے میں پہنچ گئی ہوں۔ اس رات میں نے پندرہ برس کی اُس مسلمان لڑکی کو دیکھا' جو اپنا دین ہار کر آبرو بھی ہار چکی تھی۔ مجھے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ میں دوسرے دن اپنی رہائش گاہ میں آکر اس مسلمان لڑکی کی میت پر روتی رہی۔ اتنا تو ہوا کہ پہلی بار مجھے یہودیوں سے نفرت ہوگئی۔ پچھتاوا یہ تھا کہ پھر سے مسلمان بن کر نہیں رہ سکوں گی۔ توبہ کروں گی' خدا کے آگے سجدے کروں گی تو اسرائیلی آقا مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔ میری بوٹی بوٹی نوچ کر پھینک دیں گے۔''

جلالت کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا' نئی یہودیوں کو ہلاک کرچکی ہو۔ تم نے تنہا ایسی واردات کیسے کی ہوگی؟''

''میں کچھ نہیں بولوں گی۔ یہ زہریلا جوس پی کر مرجاؤں گی یا تم مجھے کتوں کے حوالے کردو۔ وہ مجھے اذیتیں دے دے کر مار ڈالیں گے۔''

جلالت نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر جوس سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ٹوائلٹ میں آئی۔ جلالت نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کموڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو۔ اسے پھینک دو۔''

اس نے چونک کر مہربان ہونے والے کو دیکھا۔ پھر کموڈ کے پاس جاکر تمام جوس وہاں انڈیل دیا۔ فلش کرکے اسے بہادیا۔ وہ جاتے ہوئے بولا۔ ''گلاس کو اچھی طرح دھوکر کمرے میں آؤ۔''

وہ دروازہ کھول کر وہاں سے آگیا۔ وہ پہلی بار اس رنگ محل میں آیا تھا تو اس کے کمرے میں خفیہ مائک اور کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ اس کی باتیں دوسرے کمرے میں سنی جاتی تھیں اور ٹی وی اسکرین پر اسے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے شدت سے اعتراض کیا تو وہ مائک اور کیمرے ہٹادیے گئے تھے۔

اس نے باتھ روم سے کمرے میں آکر اچھی طرح ایک بار پھر ایک ایک گوشے کو اور ایک ایک سامان کو دیکھا۔ یہ اطمینان ہوا کہ کہیں بھی خفیہ مائک اور کیمرا نہیں تھا۔ وہ نگرانی کرنے والے بڑی حد تک اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔

وہ دھلا ہوا گلاس لے کر آئی۔ پھر اسے ایک ٹیبل پر رکھ کر اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''میرے قریب آؤ۔''

وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے حماس کے ایک مجاہد جلالت اسرار کے بارے میں کبھی کچھ سنا ہے؟''

''ہاں۔ اس کے دلیرانہ کارناموں کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔''

"وہ جلالت اسرار میں ہی ہوں۔"

وہ ایکدم سے پیچھے ہٹ کر اسے بڑی توجہ سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "اسے تو اسرائیلی قیدی بنا کر غزہ سے یہاں لے آئے تھے۔ اب پتا نہیں کہیں چھپا کر رکھا ہے یا مار ڈالا ہے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ ان کے معزز ربیوں نے مجھ میں کچھ ایسی نشانیاں دیکھی ہیں جو ہیکل کے سورماؤں میں بیان کی گئی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے ہیکل کا پہلا سورما مان لیا ہے۔"

"اگر تم مسلمان ہو اور جلالت اسرار ہو تو مجھے خوشی ہوگی لیکن میں ٹھوس ثبوت کے بغیر یقین نہیں کروں گی۔"

وہ اپنی شرٹ اتارتے ہوئے بولا۔ "میں نے بیشمار زخم کھائے ہیں۔ بڑے سے بڑا زخم دو چار دنوں میں بھر جاتا ہے۔ پھر جسم پر کوئی نشان نہیں رہتا۔ میرا یہ بازو دیکھو۔ یہ پیدائشی نشان ہے۔ یہ ایک ستارے کی طرح ہے۔ یہی میری پہچان ہے۔ سیکڑوں فلسطینی گواہی دیں گے کہ ایسا نشان صرف جلالت اسرار کے دائیں بازو پر ہے۔"

"جب میں یہاں سے جاؤں گی تو اپنے طور پر معلوم کروں گی۔"

"انشاءاللہ تمہیں جلد ہی یقین ہوجائے گا پھر تم مجھ پر بھروسا کروگی۔"

"پھر تو میری خوشی کی انتہا نہیں ہوگی۔ لیکن جب تک مجھے یقین نہ ہوجائے تم میرے متعلق کوئی سوال نہ کرو۔ میں تم پر اعتماد کرنے کے بعد اپنے بارے میں ضرور سچ بولوں گی۔"

"میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ آئندہ جہاد کو جاری رکھنے کے لیے مجاہدین سے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں سے جانے کے بعد کیسے رابطہ رکھو گی؟ یہاں میری فون کالز ریکارڈ کی جاتی ہیں۔"

"تمہاری حقیقت معلوم کرنے کے بعد تم سے ملنے کے لیے بے چین ہوجاؤں گی۔ کیا تمہارے پاس جو حسینائیں آکر چلی جاتی ہیں انہیں کبھی دوبارہ کال کرتے ہو؟"

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "ایک حسینہ ایسی تھی جسے دوبارہ طلب کیا تھا۔"

"اگر میں دوبارہ یہاں آسکتی ہوں تو مجھے کل صبح جانے دو۔ پھر کل رات طلب کرو۔ میں ایک دن میں جلالت اسرار کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرلوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ کل صبح چلی جاؤ۔"

وہ قریب آکر بیٹھ گئی۔ جلالت نے کہا۔ "تم نے ابھی کہا تھا کہ عبرانی زبان لکھنا' پڑھنا اور بولنا جانتی ہو؟"

"ہاں۔ جانتی ہوں۔"

"میں قدیم عبرانی زبان جانتا ہوں۔ اس زبان کے بیشتر الفاظ اور گرامر اب تبدیل ہوچکے ہیں۔ کل رات تم یہاں آؤ گی تو میں تمہیں وہ تمام الفاظ اور گرامر یاد کراؤں گا۔"

"کیا ایک ہی رات میں یاد کرسکوں گی؟"

"میں تمہیں دو چار راتوں تک رکھوں گا۔ یہ ظاہر کروں گا کہ تم نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔"

"کیا اس قدیم زبان سے ہم کوئی فائدہ اٹھا سکیں گے؟"

"ہاں۔ ابھی یہ تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے کہ تم اپنے فون کی سم بدل کر ہیکل کا دوسرا سورما بن کر قدیم عبرانی زبان میں میسج دو گی۔ ہم یہ شوشا چھوڑیں گے کہ دوسرا سورما کہیں ہے اور پہلے سورما کو تلاش کررہا ہے۔ اندازہ کرو کہ یہودی قوم اور تمام ربی کس طرح میرے اور عقیدت مند ہوجائیں گے۔ تب میں ان سے مطالبہ کروں گا کہ مجھے پابندیوں میں نہ رکھا جائے۔ نگرنگر جاکر دوسرے سورما کو تلاش کرنے دیا جائے۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "اس طرح تو تمہیں بہت کچھ کرنے کے مواقع ملیں گے۔ بہت اچھی تدبیر ہے۔"

وہ سر جھکا کر اپنی نوزائدہ تدبیر پر ہر پہلو سے غور کرنے لگا۔ اس کے فون پر قدیم عبرانی زبان میں میسج آئے گا تو تمام ربی اور دیگر یہودی پیشوا یہی کہیں گے کہ ہزاروں برس پہلے کی یہ زبان آج کے چند بڑے یہودی علما جانتے ہیں یا پھر ہیکل کے سورما جانتے ہوں گے۔

لہٰذا میسج دینے والا یقیناً ہیکل کا دوسرا سورما ہے اور وہ پہلے سورما کو ڈھونڈ رہا ہے۔ یوں جلالت سے تمام ربیوں کی عقیدت اور بڑھ جائے گی۔ وہ اس کا مطالبہ تسلیم کریں گے۔ اسے بڑی حد تک آزادی دیں گے۔

اگر ایسا ہوگا تو جلالت کو دشمن کے خلاف محاذ آرائی کی بڑی سہولتیں حاصل ہوں گی اور محاذ آرائی میں مونیکا اور اس کے ساتھی جی جان سے ساتھ دیں گے۔

☆☆☆

غالی ارتضیٰ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہوچکی تھی۔ اس کے آس پاس پارٹی کے تمام بڑے رہنما موجود تھے۔ غالی انہیں بتا رہا تھا کہ پچھلی رات بارڈر لائن پر ایک نادیدہ فرشتے نے اس کی مدد کی تھی۔

سب ہی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہورہا تھا کہ وہ نادیدہ فرشتہ کون تھا؟ ایک رہنما عمر محمود نے کہا۔ "وہ کوئی بھی

تھا' یہ بات اس چار دیواری سے باہر نہ جائے۔ ورنہ اسرائیلی آرمی تک یہ بات پہنچے گی تو وہ اپنے درمیان چھپے ہوئے اس مجاہد کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ پھر اس تنہا جہاد کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ وہ اُس نامعلوم مجاہد کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ وہ تمام لیڈر وہاں غالی کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے اور عیادت کرنے آئے تھے۔ ویسے بھی ایک چھت کے نیچے یکجا ہونے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ دشمن انہیں گھیر کر آسانی سے ہلاک کرسکتے تھے۔

ایسے وقت عمر محمود نے فون پر میسج پڑھا۔ وہ میسج کوڈ ورڈز میں تھا۔ عمر نے سمجھ لیا کہ مونیکا اس سے مخاطب ہے۔ اس نے پوچھا تھا۔ "کیا جلالت اسرار اسرائیلی قید میں زندہ ہے؟"

عمر نے جواب دیا۔ "خدا کرے' وہ زندہ ہو۔ ہم سب اس کے لیے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔"

مونیکا نے پوچھا۔ "اس کی کوئی اہم شناخت بتاؤ اگر وہ زندہ ہے تو ہم اسے کیسے پہچانیں گے؟"

"اس کے دائیں بازو پر ایک پیدائشی نشان ہے۔ وہ نشان ایک ستارے کے مانند ہے۔"

"شکریہ۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔"

مونیکا نے رابطہ ختم کردیا۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ جلالت اسرار سے مل چکی ہے اور پھر ایک بار ملنے والی ہے۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ ہیکل کا سورما کہلانے والا یہودی ایک مسلمان مجاہد ہے' جو یہودیوں کے رنگ میں رنگنے کے باوجود ایک فلسطینی مجاہد ہے اور اس نے اپنے طور پر جہاد کو جاری رکھا ہوا ہے۔

مونیکا اپنی رُوداد جلالت اسرار کو سنا چکی تھی۔ وہ پیدائشی مسلمان تھی۔ باپ کے کہنے پر دس برس کی بچی یہودی بن گئی تھی۔ لیکن جوانی میں یہودیوں کی طرف سے اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ بکاؤ مال بن کر ذہنی اذیتوں میں مبتلا رہی۔ ایسے وقت ایک مسلمان اس کی زندگی میں آگیا۔

وہ ایک چھوٹے سے سرکاری بنگلے میں تنہا رہتی تھی۔ ایک رات ایک فلسطینی مجاہد بنگلے میں گھس آیا۔ اس نے مونیکا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر دھمکی دی۔ "خبردار! شور مچاؤ گی تو اس سے پہلے ہی گولی مار دوں گا۔"

اس نے کہا۔ "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ شور نہیں مچاؤں گی۔ ویسے تم ہو کون؟"

وہ بولا۔ "یہودی مجھے باغی سمجھتے ہیں اور مسلمان مجھے فلسطینی مجاہد کہتے ہیں۔ تم جو چاہو' سمجھ لو۔ وہ میرے پیچھے لگے ہیں۔"

"پھر تو وہ یہاں ضرور آئیں گے۔ اپنی گن ہٹاؤ' مجھ پر بھروسا کرو۔ میں تمہیں کسی طرح چھپانے کی کوشش کروں گی۔"

"میں تم پر کیسے بھروسا کروں؟"

"بھروسا تو کرنا ہی ہوگا۔ مارنے کے بعد یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔ بہتر ہے' اللہ تو کل مجھ پر اعتماد کرو۔"

اس مجاہد کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے مجبوراً بھروسا کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ مونیکا نے باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھول کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "ہم پولیس اور انٹیلی جنس والے ہیں۔ ایک باغی ادھر آیا ہے۔ دروازہ کھولو۔"

وہ ایک بڑا سا تولیا لپیٹ کر باتھ روم سے باہر آئی۔ بدن کا بہت کم حصہ چھپا ہوا تھا۔ باقی تمام حصوں پر صابن لگا تھا۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "میں دروازے اندر سے لاکڈ رکھتی ہوں۔ بھلا یہاں کون آسکتا ہے؟"

وہ بولتی ہوئی پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ ایک افسر نے کہا۔ "وہ چھت کے راستے آسکتا ہے۔ ہمیں اپنی تسلی کرنے دو۔"

وہ دروازے کے پیچھے چھپ کر انہیں دیکھنے لگی۔ چار سپاہی چھت کے اوپر گئے۔ تین سپاہی کمروں میں' الماری کے پیچھے اور بیڈ کے نیچے اسے ڈھونڈنے لگے۔ افسر نے مایوس ہوکر سپاہیوں سے کہا۔ "وہ آس پاس کے کسی بنگلے میں ہوگا۔ چلو یہاں سے۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے باہر جانے لگے۔ افسر نے کہا۔ "میڈم! دروازہ اندر سے بند کرلو۔ چھت کا دروازہ ہم نے بند کردیا ہے۔ وہ ادھر نہیں آسکے گا۔"

وہ اسی طرح تولیا لپیٹے باہر آئی۔ پھر بیرونی دروازے کو اندر سے لاک کرکے باتھ روم میں آگئی۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "وہ جاچکے ہیں۔ اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' تم ایسی تدبیر سے مجھے چھپاؤ گی۔ کسی نے تم پر شبہ نہیں کیا۔"

"عورت چاہے تو آنکھوں کے سامنے سے پہاڑ اوجھل کردے تم تو ایک انسان ہو۔"

مونیکا کو جانباز ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا۔ "میرا نام مونیکا ہے۔ اور خدا مجھ گناہ گار کو معاف کرے۔ میں مسلمان ہوں۔"

"میرا نام ابوالخیر ہے۔ تم مسلمان ہو۔ پھر یہودی بن

کر کیوں رہتی ہو؟''

وہ اپنی روداد سنانے لگی۔ ''جب پہلی بار مجھے ایک غیر مسلم مہمان کی خوابگاہ میں جانے کا حکم دیا گیا تو میں چپ رہی۔ لیکن اندر سے سلگتی رہی۔ کچھ عرصے بعد ایک امریکی اعلیٰ عہدیدار کو خوش کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ عہدیدار اتنا اہم تھا' جیسے یہودیوں کا مائی باپ ہو۔ اس کے اطراف سیکیورٹی بہت سخت تھی۔ اس کی خوابگاہ میں جانے سے پہلے میری بھی سر سے پاؤں تک تلاشی لی گئی تھی۔ لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''تم خالی ہاتھ گئی تھیں۔ اسے ہلاک نہیں کر سکتی تھیں۔''

''میں نے اسے اسی وقت ہلاک نہیں کیا۔ سلیو پوائزن دیا۔ صبح وہاں سے واپس آئی تو وہ زہر رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھانے لگا۔ شام تک اس کا طبی معائنہ ہوتا رہا۔ زہر کے توڑ کی دوائیں دی گئیں۔ امریکا سے ڈاکٹر بلائے گئے لیکن دوسرے دن وہ مر گیا۔

اسرائیل سے امریکا تک کھلبلی مچ گئی۔ انتہائی شاطر قسم کے جاسوسوں نے مجھے حراست میں لے کر معلوم کرنا چاہا کہ میں نے اسے کیسے زہر دیا تھا؟

میں نے کہا' یہاں سیکیورٹی گواہ ہے کہ میرے پاس زہر کی شیشی یا پڑیا جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیڈی رٹی گارڈز نے میرے لباس کے اندر تلاشی لی تھی۔ آپ حضرات میرے پیچھے نہ پڑیں۔ وہاں شراب اور کھانے پینے کی چیزیں لائی گئی تھیں۔ وہ جہاں سے لائی گئی تھیں' وہاں جا کر انکوائری کریں۔

میں بچپن سے سرکاری انکوائری سینٹر میں تربیت حاصل کرنے والی ایک یہودی لڑکی سمجھی جاتی ہوں اور قابل اعتماد ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر چکی ہوں۔ بڑے سخت محاسبے کے بعد میری جان چھوٹ گئی۔''

ابوالخیر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''مگر تم نے اسے کیسے ہلاک کیا جبکہ اس کی خوابگاہ میں زہر لے کر نہیں گئی تھیں؟''

وہ اپنی انگلیاں دکھاتے ہوئے بولی۔ ''لے گئی تھی۔ یہ عورتوں کا فیشن ہے۔ یہ لانبے ناخن کس دن کام آتے ہیں؟ میں ایک ناخن میں زہریلا سفوف بھر کر لے گئی تھی۔''

ابوالخیر کے دیدے حیرانی سے پھیل گئے۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کیا چیز ہو؟''

''ابھی تو کچھ نہیں ہوں۔ آئندہ یہودیوں کے لیے عذاب بن جانا چاہتی ہوں۔ یہ بتاؤ' تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''تم میرے ساتھ چلو۔ ہمارا ایک گروہ ہے۔ اسرائیلی فلسطینیوں کی تعداد کم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اسرائیلیوں کی تعداد کم کرتے رہتے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی تو کہیں چھپ کر نہیں رہ سکوں گی۔ بو سونگھنے والے کتے مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ میں نے اچھی طرح ان کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ مجھے یہیں رہنا چاہیے۔ ہمارے درمیان خفیہ طور پر رابطہ رہے گا۔ میں تمہیں بتاتی رہوں گی کہ غیر ملکی عہدیدار یہاں کب آتے ہیں؟ تربیت یافتہ لڑکیوں میں کون ان کی میزبانی کرنے لی ہے اور ان مہمانوں کے اطراف کس طرح سیکیورٹی کے اقدامات کیے گئے ہیں؟''

''اگر تم اس طرح کی معلومات فراہم کرتی رہو گی تو ہم جان پر کھیل کر بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں کو نشانہ بناتے رہیں گے۔''

پہلے وہ تنہا تھی۔ ابوالخیر سے دوستی ہوتے ہی خفیہ راستے کے ذریعے اور کئی مجاہدین سے دوستی ہو گئی۔ وہ سم بدل بدل کر رابطہ کرتی رہتی تھی۔ اس نے ایک برس کے اندر مجاہدین کے تعاون سے تین مزید غیر ملکی مہمانوں اور سرکاری عہدیداروں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ یوں اس کا نام اور اس کے کارنامے پارٹی کے رہنماؤں تک پہنچے تھے۔ ان سے بھی خفیہ رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

وہ جلالت اسرار کی خوابگاہ میں جانے سے پہلے ابوالخیر کو اطلاع دے چکی تھی۔ یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اسرائیلیوں کے سب سے بڑے مہرے ہیکل کے سورما کو ہلاک کرنے جا رہی ہے۔ زندہ واپس لوٹنے کی امید کم ہے۔ لیکن وہ ناکام نہیں ہو گی۔ اسے مار کر ہی مرے گی۔

اس نے جو سوچا بھی نہیں تھا' وہ پیش آیا۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہیکل کا سورما نہیں ہے۔ بلکہ ایک جانباز معروف مجاہد جلالت اسرار ہے۔ پارٹی کے ایک رہنما نے تصدیق کی تھی کہ اس کے دائیں بازو پر پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہے۔ پیدائشی نشان کی تصدیق ہوتے ہی وہ جلالت تک پہنچنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔

☆☆☆

جلالت اسرار نے رنگ محل کے نگراں افسران سے کہا۔ ''مونیکا میرے دل کو بھا گئی ہے۔ اسے آج بھی پیش کیا جائے۔ جب تک اس سے دل نہیں بھرے گا' یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

اس کی فرمائش پر دوسری رات مونیکا خوابگاہ میں

گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے پورے کمرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں جو بولنا چاہتی ہوں' بول سکتی ہوں؟''

جلالت نے کہا۔ ''میں اطمینان حاصل کر چکا ہوں۔ یہاں خفیہ مائک اور کیمرے نہیں ہیں۔''

وہ تیزی سے قریب آ کر رک گئی۔ پھر بولی۔ ''میں بہت خوش نصیب ہوں۔ ایک ایسے عظیم مجاہد سے دوسری بار مل رہی ہوں جس کے لیے تمام فلسطینی فکر مند ہو کر سوچ رہے ہیں کہ وہ زندہ ہے یا اسرائیلی درندوں نے اسے شہید کر دیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اللہ سلامتی دینے والا ہے۔ مجھے اپنے معبود سے سلامتی مل رہی ہے۔ آؤ بیٹھو مجھے بتاؤ' تم نے کیسے تصدیق کی ہے کہ میں ہی جلالت اسرار ہوں؟''

''میں پارٹی کے رہنماؤں سے رابطہ رکھتی ہوں۔ ان کے ایک رہنما عمر محمود نے تمہارے پیدائشی نشان کی تصدیق کی ہے۔''

''کیا تم نے میرے متعلق انہیں کچھ بتایا ہے؟''

''میں نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔''

''شاباش! اب اپنے متعلق مزید کچھ بتاؤ؟''

وہ بتانے لگی کہ کس طرح ابوالخیر نامی ایک مجاہد سے ملاقات ہوئی تھی پھر اس کے ذریعے ایسے مجاہدین سے رابطے ہونے لگے جو اسرائیلی شہروں میں یہودی اور عیسائی بن کر رہتے ہیں اور فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کا انتقام یہودی سرمایہ داروں اور سرکاری عہدیداروں سے لیتے رہتے ہیں۔

جلالت نے کہا۔ ''تم یہاں کئی راتیں گزار سکو گی۔ میں تمہیں قدیم عبرانی زبان کے مطلوب الفاظ اور گرامر یاد کراؤں گا۔ میری پلاننگ کے مطابق یہاں سے جا کر اس زبان میں میسج دیا کرو گی۔ میسج کے ذریعے باتیں کیا ہوں گی' یہ بھی تمہیں سمجھاؤں گا۔''

وہ اس سے قدیم عبرانی زبان سیکھنے لگی۔ کم سے کم وقت میں بہت کچھ سیکھنا تھا۔ وہ بہت ذہین تھی۔ کمال کی یادداشت رکھتی تھی۔ جو سنتی' پڑھتی تھی' اسے فوراً ذہن نشین کر لیتی تھی۔ اس نے چار راتوں میں بڑی حد تک وہ زبان سیکھ لی۔ وہ دن کو واپس جا کر اپنے بنگلے میں بھی تمام سبق دہراتی رہتی تھی۔

پانچویں رات جلالت نے کہا۔ ''میں مطمئن ہوں۔ ایک تو تم پہلے سے عبرانی زبان اچھی طرح جانتی تھیں۔ اب

انمول موتی

☆ زبان کی حفاظت دولت سے زیادہ مشکل ہے۔

☆ غریب لوگوں پر احسان کرو کیونکہ غریب ہونے میں وقت نہیں لگتا۔

☆ اگر عبادت نہیں کر سکتے تو گناہ بھی نہ کرو۔

☆ دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ تم پہلے کیا تھے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ تم اب کیا ہو۔

☆ جہاں اپنی بات کی قدر نہ ہو وہاں چپ رہنا بہتر ہے۔

مرسلہ: عدنان یوسف، بنوں

تم نے بڑی حد تک یہ قدیم زبان بھی سیکھ لی ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ تم میری پلاننگ کے مطابق یہ زبان استعمال کر سکو گی۔ اب کل سے نہیں آؤ گی۔''

اس نے کہا۔ ''فی الحال فون سے بھی رابطہ نہیں رہے گا۔ تم صرف ہیکل کا دوسرا سورما بن کر میسج دیا کرو گی۔''

''میں دعا کروں گی کہ تمہارا یہ منصوبہ کامیاب رہے۔ تم اس چار دیواری سے باہر نکل سکو۔ تمہیں آزادی نصیب ہو۔''

جلالت نے اسے بڑی اپنایت سے دیکھا پھر کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ میں تمہیں اپنا لینا چاہتا ہوں۔''

وہ مسرتوں سے سرشار ہو کر بولی۔ ''میں اس یقین کے ساتھ بدترین حالات سے لڑتی رہوں گی کہ انعام میں تم ملنے والے ہو۔''

جلالت نے کہا۔ ''تمہارے جانے کے بعد میں زہر کی ایک خوراک حلق سے اتاروں گا۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میرے پاس ایک ایسا زہر ہے جو ہلاک نہیں کرتا مگر ہلاکت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ میرے جسم کا اندرونی نظام ایسا ہے کہ معمولی زہر اور اعصابی کمزوریوں کی دوائیں مجھ پر زیادہ دیر تک اثر انداز نہیں ہوتیں۔ کوئی زخم دیرپا نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑا زخم چوبیس گھنٹوں میں بھر جاتا ہے۔''

وہ سن رہی تھی۔ اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم زہر پینے کا خطرہ کیوں مول لینا چاہتے ہو؟''

"تم پر یہ الزام لگانا ضروری ہے کہ تم یہودیوں کی آستین کا سانپ ہو۔ یہودی بن کر انہیں دھوکا دے رہی ہو اور مجھ جیسے یہودی ہیکل کے سورما کو ہلاک کرنے آئی تھیں۔"

"پھر تو میں یہاں سے اپنے بنگلے میں نہیں جاؤں گی۔ سیدھی مجاہدین کی ایک پناہ گاہ میں چلی جاؤں گی۔"

"تمہیں یہی کرنا ہوگا۔ ان یہودیوں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان دوستی اور محبت ہے اور ہم کسی منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔"

دوسری صبح جلالت اسے رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ وہ پیچھے سے آکر اچانک ہی لپٹ گئی۔ جذبوں سے لرزتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے آغوش میں نہیں لیتے ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ بس ابھی جاتے جاتے مجھے لگنے دو۔ جو جنگ لڑنے جا رہی ہوں۔ اس میں مجھے موت آسکتی ہے۔"

"خدا پر بھروسا رکھو۔ ہم ایک دوسرے کے لیے زندہ رہیں گے۔ خود کو سنبھالو۔ مجھے چاہتی ہو تو اپنی قربت سے نہ بھڑکاؤ۔ شاباش تم بہت اچھی ہو۔ اب جاؤ خدا حافظ..."

اس نے دروازے کو کھولا۔ وہ فوراً ہی الگ ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ جلالت واپس آکر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ جس منصوبے پر عمل ہونے والا تھا۔ اس کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد اس نے اندازہ کیا کہ مونیکا مجاہدین کی پناہ میں پہنچ گئی ہوگی۔ تب اس نے وہ دوا نکالی جو خطرناک حد تک اعصابی کمزوری میں مبتلا کرتی تھی اور کمزور اعصاب والوں کو ہلاک کر دیتی تھی۔

اب سے پہلے بھی جب آرمی افسران اور ربیوں نے اس پر تنویمی عمل کر کے اس کا برین واش کرنا چاہا تھا تو انہوں نے جلالت کو ذہنی طور پر کمزور بنانے کے لیے یہی دوا اسے پلائی تھی۔ اس نے دوسری بار وہ تھوڑی سی دوا جوس میں ڈال کر پی لی۔ پھر بیڈ پر لیٹ کر کال بیل کا بٹن دبانے لگا۔

ایک منٹ کے اندر ہی ایک نگراں افسر دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ دوڑتا چلا آیا۔ جلالت نے بڑی نقاہت سے کہا۔ "وہ... وہ میرے جوس میں زہر ملایا گیا ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو کال کرو۔"

ایک ڈاکٹر وہاں موجود رہتا تھا۔ اس نے فوراً ہی قے کرنے والی دوا کھلائی۔ تھوڑی دیر میں ہی کھایا پیا الٹ کر باہر آنے لگا۔ جلالت نے بہت کم مقدار میں وہ مضر رساں دوا پی تھی۔ اس پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ پھر یہ کہ فوراً ہی طبی امداد پہنچ گئی تو وہ خطرے سے باہر ہو گیا۔

تمام حکمرانوں، آرمی کے افسروں اور ربیوں تک یہ خبر پہنچی کہ ہیکل کے سورما کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو ناکام ہو گئی ہے۔

کئی ربی اس رنگ محل میں دوڑے چلے آئے۔ تمام متعلقہ افسران کو غصہ دکھانے لگے کہ وہ ہیکل کے ایک سورما کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ آئندہ بارہ سورماؤں کی حفاظت کیسے کریں گے؟

یہ سیدھی سی بات سمجھ میں آگئی کہ مونیکا نے اس سورما کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ جاسوس اور پولیس والے اس کی رہائش گاہ میں پہنچے تو وہ وہاں نہیں تھی۔ اسے تلاش کیا گیا یہ یقین ہو گیا کہ وہ گرفتاری کے خوف سے فرار ہو گئی ہے۔

انہوں نے فوراً ہی ایئرپورٹ، بندرگاہ اور ہائی وے کی ناکا بندی کی۔ ٹی وی کے ذریعے اس کی تصاویر نشر کرتے ہوئے اعلان کرنے لگے کہ اس کا نام مونیکا ہے۔ اس نے ہمارے ہیکل کے سورما کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ جو اسے گرفتار کرنے میں قانون کی مدد کرے گا، اسے دس لاکھ امریکی ڈالرز دیے جائیں گے۔

وہ کہاں روپوش ہے؟ اس کی خفیہ پناہ گاہ کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ بلڈ ہاؤنڈ کے ذریعے مونیکا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تربیت یافتہ خونخوار کتے اس کی بو سونگھ کر اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

انہوں نے اتنی سختی سے ناکا بندی کی تھی کہ وہ اسرائیلی حدود سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اسے تلاش کرنے کے لیے تین ٹیمیں بنائی گئیں۔ ہر ٹیم کے پاس تین کتے تھے۔ مونیکا کی رہائش گاہ سے اس کی اُترن حاصل کی گئی۔ اس کے اسکرٹ اور بلاؤز کو ان کتوں کے سامنے ڈالا گیا۔ وہ انہیں سونگھنے لگے اور بھونکنے لگے۔

ان کے ٹرینرز پریشان ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک افسر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

ایک ٹرینر نے کہا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں، یہ چند کتے شمال کی سمت منہ اٹھا کر بھونک رہے ہیں۔ باقی جنوب کی سمت غرا رہے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "مونیکا ایک ٹارگٹ ہے۔ وہ بیک وقت دو سمتوں میں کیسے چھپی ہوگی؟"

ایک افسر نے کہا۔ "وہ بلا کی مکار ہے۔ زبردست چال چل رہی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک سمت میں موجود ہوگی۔ فی الحال دو ٹیمیں بنا کر دو سمتوں میں چلو۔"

وہ لوگ مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ہر ٹیم کے پیچھے مسلح سپاہیوں سے لدی ہوئی چار گاڑیاں تھیں۔ یہ اندیشہ تھا کہ مونیکا کو تحفظ دینے والے مجاہدین سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ کتے بھونکتے ہوئے جدھر جاتے تھے، گاڑیاں ادھر ہی مڑ جاتی تھیں۔ سپاہی بندوقیں تانے گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھے ہر سو دیکھ رہے تھے۔ مجاہدین سے خطرہ تھا، وہ اچانک ہی کہیں سے آسکتے تھے۔ جبکہ اسرائیلی آبادی میں مجاہدین نے کبھی گروہ کی صورت میں حملے نہیں کیے تھے۔

وہ کتے انہیں شہر سے باہر لے آئے تھے۔ ان کا رخ بتا رہا تھا کہ وہ سینا کی سمت جا رہے ہیں۔ افسران گاڑیوں میں بیٹھے دوسری ٹیم سے رابطہ کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی شہری آبادی سے دور نکل آئے ہیں۔ پہاڑ کے قریب کتوں کی رفتار بڑھ گئی۔ ان کے بھونکنے میں شدت آگئی۔ وہ ایک غار کی طرف جا رہے تھے۔ یقیناً مونیکا وہاں چھپی ہوگی۔ گاڑیاں رک گئیں۔ تمام افسران اور سپاہی ان کتوں اور ٹرینرز کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ایک افسر نے ٹرینر سے کہا۔ "ان کتوں کو روکو۔ غار کے اندر مسلح باغی ہو سکتے ہیں۔"

ٹرینر کتوں کی زنجیریں کھینچتے ہوئے ان کی رفتار سست کرنے لگے۔ پہلے دو سپاہی گنیں لے کر غار کے اندر گئے۔ ان کے پیچھے کتے، ٹرینر اور سپاہی تھے۔ وہ سب دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ غار کے ایک موڑ پر پہنچ کر وہ سب ٹھٹک گئے۔

ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے مونیکا کا لباس جھلک رہا تھا۔ کتے پاگلوں کی طرح بھونکتے ہوئے لپکنا چاہتے تھے۔ ٹرینرز بڑی مشکلوں سے انہیں قابو میں کر رہے تھے۔ ایک افسر نے پتھر کے پاس آکر مونیکا سے کہا۔ "سامنے آجاؤ ورنہ ہم تم پر کتے چھوڑ دیں گے۔"

اس دھمکی کا اس پر اثر نہیں ہوا۔ وہ پتھر کے پیچھے سے نہیں نکلی نہ اس نے کوئی حرکت کی۔ افسر نے کہا۔ "ہمیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ اس کے بدن کی اترن ہمیں دکھائی دے رہی ہے۔"

دوسرے افسر نے دو سپاہیوں سے کہا۔ "جاؤ اسے پکڑ کر لاؤ۔ وہ نہ ہو تو اس کا لباس ادھر لاؤ۔"

دو سپاہی پتھر کے پیچھے گئے۔ وہ نہیں تھی۔ اس کا لباس کسی چیز پر رکھا ہوا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس لباس کو اٹھایا تو اس کے ساتھ لگا ہوا تار کھنچ گیا۔ وہ تار بڑی قوت کے آر ڈی ایکس بم سے منسلک تھا۔

پھر ہونا کیا تھا؟ ایک دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ چیخیں سنائی دیں۔ غار کے اندرونی پتھر اور چٹانیں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اوپر سے گرنے والے پتھروں کے باعث غار کا دہانہ بند ہو گیا۔ جو بھاگتے ہوئے باہر آسکے وہ بچ گئے۔ باقی وہاں زندہ دفن ہو گئے۔

سب گاڑیاں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے بہت دور آکر رک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر گنتی کی۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا، دو افسر اور سات سپاہی حرام موت مارے گئے ہیں۔

ایک سپاہی نے فون پر دوسری ٹیم کو اپنے حالات بتائے۔ انہیں تاکید کی کہ کہیں مونیکا کی اترن دکھائی دے تو اس کے قریب نہ جائیں۔ اس کی اترن سے منسلک ایک بم چھپا کر رکھا گیا تھا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم ایک کھنڈر میں پہنچے ہیں۔ یہاں ایک شکستہ دیوار پر اس کی اترن دکھائی دے رہی ہے۔ کتے بھونک رہے ہیں اور اس لباس کی طرف لپک رہے ہیں۔ جبکہ وہ لباس اونچی دیوار پر ہے۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اس اترن کے قریب بھی نہ جاؤ۔ فوراً دور..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فون کے ذریعے ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکے کے ساتھ انسانی چیخیں گڈمڈ ہو گئیں۔ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ جواب نہیں مل رہا تھا۔ موت ایک کی ہو یا اجتماعی ہو۔ سب کو خاموش کر دیتی ہے۔ وہ دو بھیانک وارداتیں ایسی تھیں کہ اسرائیلی اکابرین پر چند لمحوں تک سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ عالمی سطح پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ فلسطینیوں نے انتقامی کارروائی کی ہے۔ ان کے افسران اور دیگر سپاہی، مجاہدین سے مقابلہ کرنے نہیں گئے تھے۔ بلکہ اپنے ہی علاقے میں ایک لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔

☆☆☆

مونیکا اس روز جلالت سے رخصت ہو کر مجاہدین کے پاس آئی تھی۔ مجاہدین نے اس کے موجودہ حالات کے پیش نظر ایک گھنٹے کے اندر اسے چور راستے سے مصری سرحد پار کرائی تھی۔ وہاں دوسرے مجاہدین اسے اسکندریہ لے گئے تھے۔

رات کے تیسرے پہر تک وہ قاہرہ پہنچ گئی۔ یہ سوچ لیا تھا کہ جلالت سے بہت دور جا کر فون پر میسج کا سلسلہ شروع کرے گی۔ میسج ٹریس کرنے والے دشمنوں کو معلوم

ہوگا کہ دوسرا سورما مصر کے کسی علاقے میں ہے۔ پھر وہ پہلے میسج کے بعد جگہ بدل دے گی۔ ہوسکا تو فلسطین جا کر پارٹی کی پناہ میں رہے گی۔

تل ابیب کے دو ربی ہر دوسرے تیسرے دن جلالت سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ انہوں نے دوسرے دن اس کے پاس آ کر بڑی عقیدت سے مصافحہ کیا۔ پھر افسوس کا اظہار کیا کہ سیکیورٹی کی نااہلی کے باعث مونیکا زہر چھپا کر لائی تھی۔ شکر ہے کہ اس زہر کا فوراً ہی توڑ کیا گیا۔ اسے ایک نئی زندگی ملی ہے۔

ایک نے کہا۔ ''یہی تو ہماری دینی کتابوں کی سچائی کا ثبوت ہے کہ تم زہر پینے کے بعد بھی زندہ ہو۔''

اسی وقت فون پر میسج کی ٹون سنائی دی۔ جلالت سمجھ گیا۔ لیکن انجان بن کر فون اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''تعجب ہے، مجھے تو کوئی میسج نہیں دیتا پھر یہ کون ہے؟''

دونوں ربی سوالیہ نظروں سے فون کو تکنے لگے۔ اس نے بٹن دبا کر میسج کی تحریر پر ایک نظر ڈالی۔ پھر حیرانی سے کہا۔ ''یہ تو قدیم عبرانی زبان میں ہے۔''

دونوں چونک کر قریب آ گئے۔ ایک نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر پڑھنے کی کوشش کی پھر کہا۔ ''میں قدیم عبرانی زبان کے چند الفاظ جانتا ہوں۔ اس میں لکھا ہے تابوتِ یہودا۔۔۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

دوسرے ربی نے فون لے کر دیکھا۔ پھر جلالت سے کہا۔ ''تم ہیکل کے سورما ہو۔ کیا تم پڑھ سکتے ہو؟''

اس نے فون لے کر پڑھا۔ ''تابوتِ یہودا کے امین! ہم نہیں آئیں گے۔ اگر آئیں گے تو ہمیں بھی تمہاری طرح کسی چار دیواری میں قید کر دیا جائے گا۔''

تینوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔ جلالت نے بٹن دبا کر میسج دینے والے کے نمبر پڑھے۔ پھر کہا۔ ''یہ میسج کرنے والا میری طرح کوئی ہیکل کا سورما ہے۔ مجھے تابوت یہودا کا امین کہہ رہا ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''اسے کال کرو۔''

جلالت نے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف سے رابطے کی بیل سنائی دینے لگی۔ پھر لائن کٹ گئی۔ جلالت نے پھر نمبر پنچ کیے۔ مونیکا سے یہ طے ہوا تھا کہ فون پر صرف میسج کے ذریعے باتیں ہوں گی۔ اس لیے دوسری بار بھی رابطہ ختم کر دیا گیا۔ جلالت نے ربیوں کو دیکھ کر کہا۔ ''وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہا ہے۔''

ربی نے کہا۔ ''میسج کے ذریعے پوچھو، وہ کون ہے؟ تمہیں کیسے جانتا ہے اور خود کہاں ہے؟''

جلالت نے اس کی ہدایت کے مطابق اسی قدیم زبان میں سوال کیا۔ جلد ہی جواب آیا۔ ''ایک حادثے میں میری زبان جل گئی ہے۔ میں بول نہیں سکتا۔ میں بھی تابوت یہودا کا امین ہوں۔ نائٹ ٹیمپلر (ہیکل کا سورما) ہوں۔ کیا تمہیں قید سے نکال کر لے جاؤں؟''

جلالت نے جواب دیا۔ ''میں قیدی نہیں ہوں۔ میری سلامتی کی خاطر مجھے یہ سیکیورٹی میں رکھا جاتا ہے۔''

ادھر سے جواب آیا۔ ''ہم بارہ سورماؤں کو کبھی سیکیورٹی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جب تک ہم یہودی قوم کو تابوت یہودا پیش نہیں کریں گے۔ ہمیں کوئی دشمن ہلاک نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ ہلاک ہوگا تو سمجھ لو کہ وہ جعلی سورما تھا۔''

ربیوں نے یہ میسج سنا تو فوراً ہی اپنے پیشوائے اعظم سے فون پر رابطہ کیا اور کہا۔ ''بہت بڑی خوشخبری ہے۔ دوسرے سورما کا سراغ مل رہا ہے۔ اس مسئلے میں ایک ذرا پیچیدگی ہے۔ آپ فوراً اعلیٰ حکام اور آرمی کے اعلیٰ افسران کو طلب کریں اور قدیم عبرانی زبان کے جو پروفیسر ہیں، انہیں بھی ضرور طلب کریں۔''

ادھر جلالت کے فون پر میسج آیا۔ ''اے امین! پابندیوں میں رہنا سورماؤں کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہم سورما صرف پیشوائے اعظم کی اور اپنے ربیوں کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔''

ربیوں نے یہ میسج سنا تو خوشی سے پھول گئے۔ کیونکہ وہ سورما ان کی ہدایات پر عمل کرنے اور ان کا پابند رہنے کی بات کہہ رہا تھا۔

ایک سورما آ چکا تھا۔ دوسرا اپنے وجود کی اطلاع دے رہا تھا۔ اس کی بھی آمد آمد تھی۔ اس لیے چند گھنٹوں کے بعد ہی تمام اسرائیلی اکابرین ایک کانفرنس ہال میں جمع ہو گئے۔

اس کانفرنس ہال میں اسرائیل کے شاطر سیاستدان اور جارحانہ عزائم رکھنے والے فوجی افسران بھی تھے۔ جو اپنی ضد پر اڑ جاتے تو نہ اقوام متحدہ کا فیصلہ مانتے تھے، نہ اپنے سرپرست امریکا اور یورپی یونین کے مشورے تسلیم کرتے تھے۔ لیکن مذہبی معاملات میں پیشوائے اعظم اور ربیوں کے آگے سر جھکاتے تھے۔ وہ سب ہی اپنی مصروفیات ترک کر کے وہاں یکجا ہو گئے تھے۔

پیشوائے اعظم نے تمام حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری کامیابی اور دنیا میں حکمرانی کے دن قریب آ رہے ہیں۔ آپ سب کو مبارک ہو۔ ہیکل کا دوسرا

سورما آنے والا ہے۔''

اس نے جلالت اسرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پہلے سورما سولومن یہودا نے آج صبح اچانک اس کا ایک میسج ریسیو کیا ہے۔ وہ پیغام ہماری قدیم عبرانی زبان میں ہے۔ جسے سولومن یہودا نے پڑھا پھر میں نے پڑھا۔ اب آپ کے سامنے قدیم زبانوں کے ماہر پروفیسر ڈی فرائیڈا سے پڑھیں گے۔''

پروفیسر اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈیسک کے قریب آیا۔ پیشوائے اعظم نے اسے فون دیتے ہوئے حاضرین سے کہا۔ ''یہ ہمارے سورما سولومن یہودا کا فون ہے۔ وہ پیغام اس میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ آپ حضرات توجہ سے سنیں۔''

پروفیسر فون کا بٹن دبا کر میسج پڑھنے لگا۔ جلالت نے جو جوابات دیے تھے، اسے بھی پڑھ کر سنانے لگا۔ پیشوائے اعظم نے کہا۔ ''میں اعلیٰ حکام اور آرمی کے اعلیٰ افسران سے گزارش کرتا ہوں۔ وہ بتائیں کہ اس پیغام سے کیا تاثر ملتا ہے؟''

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہم نے پہلے سورما کو قیدی بنا رکھا ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''اور اس کا یہ حتمی فیصلہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ہیکل کے تمام سورما صرف پیشوائے اعظم اور ربیوں کی ہدایات کے پابند رہتے ہیں۔ کسی اور کی غلامی یا پابندی قبول نہیں کرتے۔''

اعلیٰ حکام اور فوج کے اعلیٰ افسران ایک دوسرے سے مشورے کرنے لگے۔ صرف جلالت ہی نہیں، پیشوائے اعظم اور تمام ربی بھی کہہ رہے تھے کہ پہلے سورما سولومن یہودا کو آزادی دی جائے ورنہ کوئی سورما یہاں قیدی بن کر رہنے نہیں آئے گا۔

وہ تمام اکابرین گیارہ سورماؤں کا راستہ روک نہیں سکتے تھے۔ راستہ کھولنے اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے آزادی کی ضمانت لازمی ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ سب متفق ہو کر جلالت اسرار پر سے تمام پابندیاں اٹھانے کے لیے راضی ہو گئے۔

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ''مسٹر سولومن یہودا! تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی لیکن تم اسرائیل سے باہر کسی ملک میں نہیں جاؤ گے۔''

جلالت نے کہا۔ ''مجھے اس ملک سے باہر جانے کا شوق نہیں ہے۔ اگر کسی سورما سے ملنا ہوگا، اسے کسی دوسرے ملک سے لانا ہوگا تو میں کسی ربی کے ساتھ اسرائیل سے باہر ضرور جاؤں گا۔''

تمام ربی خوش ہو گئے۔ کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے جلالت اسرار کو آزادی کی مبارک باد دی پھر کہا۔ ''دوسرے سورما کو میسج دو۔ اسے آزادی کی خوشخبری سناؤ۔''

جلالت نے مونیکا کے اس خفیہ نمبر پر رابطہ کیا۔ وہ اپنے فون کی سم بدل چکی تھی۔ اس لیے رابطہ نہیں ہوا۔ جلالت نے ان سے کہا۔ ''اس کا فون آف ہے۔ پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔''

پھر اس نے کہا۔ ''میں اس رنگ محل میں نہیں رہوں گا۔ میرے لیے گاڑی رکھی جائے۔ میں خود ڈرائیو کروں گا۔ تل ابیب اور حیفہ کی سیر کرتے ہوئے اپنے لیے نئی رہائش گاہ پسند کروں گا۔''

اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔ مونیکا نے اسے چند مجاہدین کے نام اور پتے ٹھکانے بتائے تھے۔ ان سے رابطہ کرنے کے سلسلے میں کوڈ ورڈز بھی یاد کرائے تھے۔ ان میں سے ایک بظاہر عیسائی بن کر رہتا تھا۔ اس کا نام ڈیوڈ براؤن تھا۔ وہ ایک جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ جلالت خریداری کے لیے وہاں پہنچ گیا۔

دکان میں دو چار گاہک تھے۔ دکان کا مالک کیش کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ جلالت محتاط انداز میں دیکھتا آ رہا تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے یا نہیں؟

اب تک کوئی تعاقب کرتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر دکان کے اندر آ کر شوکیس کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ کوئی اس کی ٹوہ میں نہیں تھا۔

اس نے کیش کاؤنٹر پر آ کر کہا۔ ''میں مسٹر ڈیوڈ براؤن سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''میں ہی ڈیوڈ براؤن ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میرا نام سولومن یہودا ہے۔''

اس نے چونک کر دیکھا۔ جلالت نے دھیمی آواز میں کوڈ ورڈز ادا کیے۔ ''ہم فلسطین کے لیے ہیں، فلسطین ہمارے لیے ہے۔''

وہ ایکدم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جواباً دھیمی آواز میں کوڈ ورڈز ادا کیے۔ ''فلسطین ہمارے لہو سے سرسبز رہے گا۔''

پھر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آیئے! جو خریدنا چاہتے ہیں۔ میں ان تمام آئٹم کی کوالٹی آپ کے سامنے چیک کروں گا۔''

پھر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس طرح ہم اپنے مقصد کی باتیں کرتے رہیں گے۔''

وہاں مختلف سامان کی مختلف قطاریں بنی ہوئی تھیں۔
جلالت نے اس کے ساتھ دو قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''میں فوراً مونیکا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''
وہ بولا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے اس سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ اس کا فون بند ہے۔ ویسے وہ جلد ہی کال بیک کرے گی۔ تم اس سے کوئی ضروری کام لینا چاہتے ہو تو شاید میں تمہارا وہ کام کر سکوں گا۔''
''میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری پلاننگ کے مطابق مجھے آزادی مل گئی ہے۔''
''یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔''
''اس کا مطلب ہے' مونیکا نے تمہیں میری پلاننگ کی تفصیلات بتائی ہیں۔''
''جی ہاں۔ ہم ایک دوسرے کو تمام حالات سے اور معاملات سے باخبر رکھتے ہیں۔''
وہ گفتگو کے دوران کبھی کبھی پیسٹ' ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان دیکھ رہا تھا۔ رک رک کر ضرورت کی چیزیں اٹھا کر ٹرالی میں ڈال رہا تھا۔ یوں پوری دکان میں گھومنے کے بعد وہ کاؤنٹر پر واپس آ گئے۔ کام کی تمام باتیں ہو گئیں۔
جلالت نے سامان کا بل ادا کیا پھر مصافحہ کر کے دکان کے باہر آیا۔ ملازم نے تمام سامان کار میں لا کر رکھ دیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی پھر ڈرائیو کرتا ہوا تل ابیب کے ساحل پر آ گیا۔ وہاں اس نے ایک خوبصورت سا بنگلا رہائش کے لیے پسند کیا۔ وہ کرائے کے لیے خالی تھا۔
اس نے فون کے ذریعے ایک ربی کو بلایا۔ ربی نے سرکاری کارندے کے ذریعے اس ویل فرنشڈ بنگلے کو اس کے لیے کرائے پر حاصل کر لیا۔ اس کی خدمت کے لیے وہاں ملازم رکھے۔ یوں شام تک وہ اس رہائش گاہ میں آ گیا۔
وہاں ربی کی موجودگی میں دوسرے سورما کا میسج آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''کیا ابھی تک آزادی کے نام پر چار دیواری میں قید ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''تھینکس گاڈ! آزادی مل گئی ہے۔ میں اپنی پسند کے بنگلے میں آ گیا ہوں۔ اس ساحلی بنگلے میں تمہارے لیے بھی گنجائش ہے۔''
ربی وہ میسج پڑھتا جا رہا تھا۔ جواب موصول ہوا۔ ''فوراً نہیں آؤں گا۔ معلوم کرتا رہوں گا' دیکھتا بھی رہوں گا کہ تم کس حد تک آزاد ہو؟ اگر در پردہ نگرانی نہیں ہو گی اور تمہاری سماجی مصروفیات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا تو میں اچانک سب سے پہلے کسی بھی ربی کے پاس آؤں گا۔''
رابطہ ختم ہو گیا۔ ادھر ربی خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''آج سے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے اعلان کیا جائے گا کہ ہماری دینی کتاب کی پیشگوئی کے مطابق سیکل کا ایک سورما آ چکا ہے اور اب دوسرا سورما عنقریب آنے والا ہے۔ یوں پوری دنیا تمہاری تصویر دیکھے گی۔''
ملازم نے آ کر کہا۔ ''ہمارے شہر کے میئر آپ سے ملنے آئے ہیں۔''
جلالت نے کہا۔ ''انہیں آنے دو۔''
ملازم چلا گیا۔ ربی نے کہا۔ ''کل میئر کی بیٹی دلہن بن رہی ہے۔ وہ دعوت دینے آیا ہو گا۔''
''کیا مجھے اس دعوت میں جانا چاہیے؟''
''بیشک جانا چاہیے۔ کل حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور بڑی بڑی شخصیات وہاں ہوں گی۔ سب ہی تم سے ملنا چاہیں گے۔ ٹی وی چینلز کے لیے اس تقریب کی کوریج کی جائے گی۔''
میئر اپنے پی اے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا۔ جلالت نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ میئر نے اس سے بڑی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر سولومن یہودا! ہمارا دین' ہماری کتابیں کہتی ہیں کہ آپ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ ہماری قوم بڑی عقیدت سے آپ کے سامنے سر جھکاتی رہے گی۔ کل میری بیٹی کی شادی ہے۔ میں آپ کو مدعو کرنے آیا ہوں۔ آپ آئیں گے تو تقریب یادگار ہو جائے گی۔''
جلالت نے دعوت نامہ قبول کیا پھر پوچھا۔ ''وہ مونیکا جو مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی' کیا اب تک لاپتا ہے؟''
میئر نے کہا۔ ''سالی جائے گی کہاں؟ گرفتار ہو جائے گی تو میں حکم دوں گا کہ اسے جنسی جنون میں مبتلا رہنے والے پاگلوں کے آگے ڈال دیں۔ وہ اس کی بوٹی بوٹی نوچتے رہیں گے۔ اس کی چیخیں سن کر ہمارا کلیجا ٹھنڈا ہو گا۔''
جلالت تصور میں مونیکا کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''میری جان! میں آزاد ہو گیا ہوں۔ تمہارا محافظ ہوں۔ یہ میئر اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے ٹھنڈا کر دوں گا۔ بیٹی کو دلہن بنانے کی خوشی ماتم میں بدل جائے گی۔''

☆☆☆

ایک وسیع و عریض عمارت میں شادی کی تقریب تھی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور بڑے بڑے سرمایہ دار آ رہے تھے۔ عمارت کے اندر اور باہر مسلح سپاہی خاصی تعداد میں

تھے۔ سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے گئے تھے۔
جلالت اسرار دوربیوں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ کار سے باہر نکلا تو عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سیکیورٹی گارڈز نے جلالت کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ معزز مہمانوں سے اپیل کر رہے تھے کہ وہ سورما سے دور رہیں۔ وہ ایک سورما سیکڑوں عقیدت مندوں سے مصافحہ نہیں کر سکے گا۔ جلالت عمارت کے اندر آیا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ آتی جاتی' ہنستی کھلکھلاتی نظر آ رہی تھی۔ انہیں معلوم ہوا کہ سیکل کا سورما آیا ہے تو وہ بڑے شوق سے اس کے قریب آنے لگیں۔ مسلح گارڈز انہیں بھی روکنے لگے۔
میئر نے تیزی سے آ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے ساتھ اعلیٰ عہدیداروں کے پاس لے گیا۔ وہ سب بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے متعارف ہونے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''آپ کی آمد سے یقین ہو گیا ہے کہ یہودی قوم تا قیامت افضل اور برتر رہے گی۔ دوسرے مذاہب ختم ہو جائیں گے۔''
ایک خاتون تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ اس نے بڑے جذبے اور اپنایت سے جلالت کا بازو تھام کر کہا۔ ''اوہ گاڈ! آپ ہیں نائٹ ٹیمپلر...؟ جیسا سنا تھا' اس سے بھی زیادہ خوبرو' اسمارٹ اور پرکشش ہیں۔ عورتیں تو آپ پر مرتی ہوں گی۔''
جلالت نے پوچھا۔ ''آپ بھی مرنے آئی ہیں؟''
اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ میئر نے تعارف کرایا۔ ''یہ ہمارے ایک منسٹر کی اہلیہ میڈم سوزانہ ہیں۔''
میڈم نے کہا۔ ''وہ غیر ملکی دورے پر ہیں۔ آج کل میں بالکل تنہا ہوں۔ کل آپ سے کسی وقت ملنے آؤں گی۔ پلیز اپنا فون نمبر بتائیں؟''
جلالت نے نمبر بتائے۔ اس نے وہ نمبر اپنے فون میں محفوظ کر لیے۔ پھر کہا۔ ''میں جا رہی ہوں۔ کل ملاقات ہو گی۔''
وہ وہاں سے جاتے ہوئے مہمانوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔ جلالت نے کہا۔ ''یہ عورت ہے یا بجلی؟ لہراتی ہوئی آئی' جھلک دکھا کر فون نمبر لے کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔''
معزز عہدیدار ہنسنے لگے۔ میئر نے کہا۔ ''یہ منسٹر کی وائف ہے۔ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ویسے فلرٹ ہے۔ ذرا بچ کر رہیں۔ پلٹ کر آ سکتی ہے۔''
وہ سب میڈم سوزانہ کی باتیں کر کے مزے لے رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ جلالت نے اپنے فون پر کالنگ ٹون سنی۔ اس نے فون نکال کر ان لوگوں سے ذرا دور ہو کر بٹن دبایا۔ پھر کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہیلو کون؟''
دھیمی سی رازدارانہ سرگوشی سنائی دی۔ ''وہاں کسی کو معلوم نہ ہو' میں سوزانہ بول رہی ہوں۔ ان سے دور ہو کر مجھ سے دو باتیں کریں گے تو فائدے میں رہیں گے۔''
اس نے کہا۔ ''میرے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''
''ایک ایسا راز ہے' جس کی تم توقع نہیں کر سکتے۔ فون پر نہیں بول سکتی۔ سامنے کوریڈور میں بائیں طرف آؤ۔ میں اس ہجوم میں دروازے پر نظر آؤں گی۔''
وہ کوئی راز بتانا چاہتی تھی۔ تجسس پیدا کر دیا تھا۔ جلالت نے کہا۔ ''اوکے۔ میں آ رہا ہوں۔''
اس نے فون بند کر کے میئر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ مہمانوں سے باتوں میں مصروف تھا۔ جگہ جگہ شراب کی ٹرالیاں چل رہی تھیں۔ لوگ کھانے پینے سے شغل کر رہے تھے۔
وہ تیزی سے چلتا ہوا کوریڈور میں آ گیا۔ پھر بائیں طرف مڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ قریب ہی وہ ایک دروازے کے پاس کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے قریب آتے ہی اس نے دروازہ کھول کر کہا۔ ''اندر چلو۔''
وہ ایک کمرے میں آیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟ لوگ کیا سوچیں گے؟''
وہ روبرو آ کر بولی۔ ''کیا تم جانتے ہو تمہارے کتنے دشمن ہیں؟'' وہ آستین میں چھپے ہوئے سانپ نظر نہیں آئیں گے۔ ایک دشمن تو میری انگلیوں پر ناچتا ہے۔ اپنے سرکاری راز بھی مجھے بتاتا رہتا ہے۔''
''کون ہے وہ؟''
''وہ میرا شوہر سیموئل ڈیسوزا ہے۔ مجھ سے چور رشتہ رکھو گے تو بتاؤں گی کہ تمہاری لاعلمی میں کیا ہو رہا ہے؟ میں جنونی ہوں۔ تمہیں حاصل نہ کر سکی تو مر جاؤں گی۔ مجھے ایک بار آغوش میں لو۔''
''پہلے کام کی بات کرو۔ کسی اہم معاملے میں میرے کام آؤ گی تو میں تمہارے کام آؤں گا۔''
وہ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں بھڑک رہی ہوں۔ مجھے جنون میں آنے سے پہلے شانت کر دو۔ تم جس اندھے کنوئیں میں ہو' اس میں سے میں ہی

تمہیں نکال سکتی ہوں۔''

جلالت نے اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کے ہاتھ سے پرس چھوٹ کر فرش پر آ گیا۔ وہ آہنی شکنجے میں کراہنے لگی۔ زیر لب بڑبڑانے لگی۔ ''بائی گاڈ! تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ اس طرح تمہارے کام آتی رہوں گی کہ تمہاری اہم ضرورت بن جاؤں گی۔ تم خود ہی مجھے طلب کرتے رہو گے۔''

جلالت نے اچانک ہی اسے ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔ وہ پھر تڑپ کر اس سے لگنے کے لیے آئی۔ اس نے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہاری پہلی فرمائش پوری کر دی۔ اب میرے کام کی بات کرو۔

''میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی۔ پلیز مجھے لگنے تو دو۔''

''اب اگر تم نے ضد کی تو میں دروازہ کھول کر چلا جاؤں گا۔ دوستی اسی شرط پر ہوگی کہ پہلے تم میرے لیے اہم بن جاؤ۔''

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا جانتے ہو کہ دوسرا سورما کب آئے گا؟''

''جلد ہی آئے گا۔ اس کی آمد کا کوئی دن مقرر نہیں ہے۔''

''لیکن میرا خاوند ڈیسوزا جانتا ہے' وہ آج سے دو دنوں کے بعد دس تاریخ کو آئے گا۔''

جلالت نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''ڈیسوزا نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں۔ دراصل آنہیں رہا ہے' لایا جا رہا ہے۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے سوزانہ کو تکنے لگا۔ وہ جنسی جنون میں مبتلا رہنے والی عورت تھی۔ مگر خطرے کی گھنٹی بجا کر اس پر احسان کر رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''مجھے اپنی آغوش میں لو۔ پیار کرو۔''

''ذرا صبر کرو۔ پہلے دشمنوں کی سازش سے مجھے پوری طرح آگاہ کرو۔ مسٹر ڈیسوزا کے علاوہ اور کتنے سرکاری عہدیدار اور آرمی کے افسران میرے مخالف ہیں؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''یہ بتاؤ' اپنے مخالفین کے خلاف کیا کام لینا چاہتے ہو؟''

''سیدھی سی بات ہے' ان کی موت میری زندگی ہوگی۔ یہ نہیں چاہوں گا کہ تم کسی کو موت کے گھاٹ اتارو۔ البتہ پلاننگ کر کے انہیں میرے نشانے پر لا سکتی ہو۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں تم سے آزادی سے ملتے رہنے کے لیے اپنے منسٹر شوہر کو قیامت کی نیند سلا سکتی ہوں۔ وہ کبھی اس طرح کہ کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہوگا۔''

''اس پر آخری وقت لانا ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ پہلے یہ معلوم کرو وہ لایا جانے والا سورما کون ہے؟ میں اس کی آمد سے پہلے اس کی شہ رگ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''پہلے تمہارے بیڈ روم میں جاؤں گی۔ پھر اس ڈمی سورما کی پوری ہسٹری معلوم کر کے آؤں گی۔''

جلالت نے کہا۔ ''ابھی اس تقریب میں مجھے ایک اہم معاملے سے نمٹنا ہے۔ ایک مشکل کام ہے۔ اسے کرنے کے بعد ہم یہاں سے جائیں گے۔''

''کام کیا ہے؟ مجھے بتاؤ' شاید میں وہ مشکل آسان کر دوں۔ میں جلد سے جلد تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہاری بے چینی اور دیوانگی سمجھ رہا ہوں۔ ابھی تم میرے لیے کسی بھی خطرے سے کھیل سکتی ہو اور میں بھی تمہیں رازدار بنا کر خطرہ مول لے رہا ہوں۔''

جلالت نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے وہاں گھنے بالوں کے درمیان ایک ڈیڑھ انچ کا ٹائم بم ٹیپ کے ذریعے چپکا کر رکھا گیا تھا۔ اس نے اسے وہاں سے نکال کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس ننھی سی چیز کو ابھی مئیر کی جیب میں ڈال سکتی ہو؟''

اس نے پوچھا۔ ''کیا ہے یہ؟''

''یہ ٹائم بم ہے۔''

اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ جلالت نے پوچھا۔ ''کیا ڈر گئیں؟''

''ہرگز نہیں۔ میں تمہاری خاطر جان پر کھیل جاؤں گی۔ مجھے یہ بتاؤ' بم کیسے بلاسٹ ہوگا؟''

اس نے سمجھایا۔ ''دیکھو یہ ننھا سا بٹن ہے۔ اسے دو بار دبا کر مئیر کی جیب میں ڈالو گی تو یہ دو منٹ بعد بلاسٹ ہوگا۔''

اس نے اس ننھے سے کھلونے کو لے کر اپنے گریبان میں رکھ لیا۔ پھر وہ دونوں دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ کوریڈور میں عورتیں اور مرد آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سوزانہ اور جلالت نے ایک دوسرے سے فاصلہ قائم کر لیا۔ وہ مئیر کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ کسی دوسری طرف دوسرے مہمانوں کو کمپنی دے رہا تھا۔

اچھے خاصے مہمانوں کا ہجوم تھا۔ وہاں ہر طرف کھانے پینے کی ٹرالیاں چل رہی تھیں۔ ایک جگہ مئیر بوڑھی

اور جوان عورتوں کے درمیان دکھائی دیا۔

سوزانہ نے اس سے کچھ فاصلے پر رک کر ایک ٹرالی سے شراب کا جام اٹھا لیا۔ اسے ہونٹوں سے لگا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ وہ مستقل مئیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں یہ بات پکا رہی تھی کہ اسے کیسا طریقہ کار اختیار کرنا ہے؟

تھوڑی دیر میں ہی مئیر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جگہ جگہ میزبانی کے فرائض ادا کرتا آ رہا تھا۔ وہ خواتین سے معذرت کرتے ہوئے اس کے پاس چلا آیا۔ ''ہائے سیڈم! تنہا کیوں ہو؟''

وہ ایک گھونٹ حلق سے اتار کر سرد آہ بھر کر بولی۔ ''مقدر میں تنہائی ہے۔ میرا شوہر تو بیچارہ منسٹر ہے۔ ہمیشہ دورے پر رہتا ہے اور مجھ بے چاری پر جوانی کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔ آہ! میں شاید خوبصورت اور پرکشش نہیں ہوں۔ کوئی مجھے کمپنی نہیں دیتا ہے۔''

وہ قریب آ کر بولا۔ ''تم بہت حسین اور دلنشین ہو۔ لگتا ہی نہیں کہ شادی شدہ ہو۔ پھر بچے بھی نہیں ہیں۔ ٹین ایجر لگتی ہو۔''

''اگر سچ کہہ رہے تو آؤ مجھے کس کرو۔''

اس نے ہچکچاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ اگرچہ سر عام ایک دوسرے کو چومنا ان کی تہذیب کے مطابق تھا لیکن وہ ایک منسٹر کی وائف کے ساتھ کوئی اسکینڈل کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کیا کرتا' وہ تھی ایسی کہ بے اختیار ہو کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر جھک کر اس کے لبوں پر اتر گیا۔ وہ بلاشبہ عمر رسیدہ نہیں تھی۔ منسٹر کی وائف ہونے کے باعث میڈم کہلاتی تھی۔

ان لمحات میں مئیر اپنا بڑھاپا بھول گیا۔ طلسم ہوشربا نے ہوش اڑا دیے۔ مدہوشی میں معلوم نہ ہو سکا کہ موت اس کی جیب میں پہنچ گئی ہے۔

سوزانہ یکدم سے الگ ہو کر بولی۔ ''اوگاڈ! تم تو غضب کے آدمی ہو۔ میں آج رات تمہارے ساتھ گزارنا چاہوں گی۔ بعد میں فون پر بتاؤں گی کہ ہم کہاں مل سکتے ہیں؟''

وہ بڑی دلربائی سے مسکراتی ہوئی تیزی سے پلٹ کر اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ جلالت کو ڈھونڈنے لگی۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ''آگے چلتی رہو۔ میں پیچھے ہوں۔ عمارت سے باہر نکلو۔''

باہر نکلتے ہی ایک دھماکا سنائی دیا۔ یکدم سے بھگدڑ مچ گئی۔ عورتوں' مردوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اگرچہ بڑا دھماکا نہیں ہوا تھا۔ لیکن سب ہی دہشت زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ جلالت نے سوزانہ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اس نے خوش ہو کر اپنی باہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ مہمانوں کی بھگدڑ جاری تھی۔ وہ ان سے ٹکراتے ہوئے جا رہے تھے۔ جلالت نے باہر آ کر پارکنگ ایریا میں اسے بازوؤں سے اتارتے ہوئے کہا۔ ''اپنی کار لے آؤ۔''

وہ تیزی سے ایک طرف چلی گئی۔ جلالت نے کالنگ ٹون سن کر فون کو کان سے لگایا۔ ربی گھبرایا ہوا تھا۔ پوچھ رہا تھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں خیریت سے ہوں۔ بائی داوے یہ دھماکا عمارت کے اندر کہاں ہوا ہے؟''

''کچھ نہ پوچھو۔ معمولی سا دھماکا تھا۔ لیکن مئیر مارا گیا ہے۔''

''میں سوزانہ کے ساتھ جا رہا ہوں۔ آپ کسی وقت بھی میری کار یہاں سے لے جائیں۔''

سوزانہ اپنی کار لے آئی۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کمال کر دیا۔ ابھی ربی نے بتایا ہے' مئیر ختم ہو چکا ہے۔''

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''عورت دغا بھی ہے اور وفا بھی۔ تھوڑی دیر پہلے میرے ایک بوسے نے اسے موت دی۔ جو بوسہ تمہیں دوں گی' وہ وفاداری کی ضمانت ہوگا۔''

وہ رہائش گاہ میں پہنچ گئے۔ کہیں بجتی ہے شہنائی' کہیں ماتم بھی ہوتے ہیں۔ یہی انسانوں کی بیچ در بیچ زندگی ہے۔ جہاں شہنائی بج رہی تھی' اب وہاں ماتم ہو رہا تھا۔ جلالت کی خوابگاہ میں جہاں تنہائی اور خاموشی رہتی تھی' وہاں رات بھر شہنائی بجتی رہی۔

☆☆☆

وہ تھک ہار کر سو گئی تھی۔ کالنگ ٹون نے اسے جگایا۔ وہ آنکھ کھولنے کے باوجود جیسے خواب میں اس فاتح سورما کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ وہ بیڈ پر نہیں تھا۔ اس کی جگہ فون پکار رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ ''ہیلو...؟''

جلالت نے کہا۔ ''صبح ہو گئی۔ تمہیں واپس جانا چاہیے۔''

''تم کہاں ہو؟''

''کھڑکی سے دیکھو' گارڈن میں ہوں۔''

''آل رائٹ۔ میں شاور لے کر آ رہی ہوں۔''

وہ شاور لے کر فریش ہونے کے بعد گارڈن میں آئی۔

پھر بولی۔ ''کب تک ورزش کرتے رہو گے؟ اندر چلو۔''

''میں خوب سمجھتا ہوں' اندر جاؤں گا تو پھر تم باہر نہیں نکلو گی۔ میں نے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔ یہاں سے باہر ہمارا اسکینڈل نہیں بننا چاہیے۔''

اسی وقت فون نے سوزانہ کو مخاطب کیا۔ وہ نمبر پڑھ کر چونک گئی پھر بولی۔ ''میرے شوہر کا فون ہے۔ پتا نہیں اتنی صبح کیوں کال کر رہا ہے؟''

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو ڈیسوزا! کہاں ہو؟ کیسے ہو؟''

''میں صبح کی فلائٹ سے گھر آیا ہوں۔ معلوم ہوا ہے' میئر بم دھماکے میں مارا گیا ہے۔ تم کہاں ہو؟ اس تقریب میں تھیں۔ خیریت سے تو ہو؟''

''میں خیریت سے ہوں۔ اچانک دھماکے کے باعث مجھے شاک پہنچا ہے۔ میری سہیلی مجھے اپنے گھر لے گئی تھی۔ میں ابھی آرہی ہوں۔''

اس نے فون بند کر کے بڑی حسرت سے جلالت کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا' اسکینڈل سے اور شک و شبے سے بچتی رہو۔ کیا یہ سوچ سکتی تھیں کہ وہ اچانک آجائے گا؟''

''درست کہتے ہو۔ آئندہ محتاط رہوں گی۔ لیکن جلد ہی ڈیسوزا کو اپنی زندگی سے نکال دوں گی۔''

وہ اپنی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ کار کی کھڑکی پر جھک کر بولا۔ ''کیا کرنے والی ہو؟ میری بات ذہن نشین کرلو۔ ابھی اسے زندہ رہنے دو۔ شبہات سے بالاتر رہو۔ ورنہ میرا کھیل ادھورا رہ جائے گا۔''

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں تمہارا کھیل بگڑنے نہیں دوں گی۔''

وہ کار آگے بڑھاتی ہوئی احاطے کے گیٹ سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ بیڈ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ سوزانہ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

اس نے پچھلی رات خطرہ مول لے کر بہت بڑا کام کیا تھا۔ وہ کسی شک و شبے کے بغیر اس پر اعتماد کر سکتا تھا۔ مونیکا کے بعد یہ دوسری عورت تھی' جو یہودیوں سے نمٹنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار بن گئی تھی۔

جلالت نے دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے وفاداروں اور جاں نثاروں کی ایک مضبوط ٹیم بنتی جارہی تھی۔

ربی نے اسے فون پر مخاطب کیا اور کہا۔ ''ہم نے تمہاری کار بھیج دی ہے۔ یاد رکھو! آج شام انٹرویو کے لیے ایک اسٹوڈیو میں پہنچنا ہے۔''

ناشتا کرنے کے دوران اس کی گاڑی آگئی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا جنرل اسٹور کے سامنے آکر رک گیا۔

ڈیوڈ براؤن نے مسکرا کر کہا۔ ''ویل کم مسٹر سولومن! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے مستقل گاہک بن رہے ہیں۔''

وہ دونوں پھر سامان کی قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ جلالت نے کہا۔ ''ایک نئی اطلاع ہے۔ میرے مخالفین مجھے مسلمان ثابت کرنے یا جعلی سورما ثابت کرنے کے لیے ایک ڈمی سورما تیار کر چکے ہیں۔ وہ پرسوں دس تاریخ کو کہیں سے نمودار ہونے والا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''یہ تو ہمارے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس بہروپیے کی تو ایسی کی تیسی کرنی ہوگی۔''

''ایک منسٹر کی وائف میری رازدار اور وفادار بن گئی ہے۔''

''تعجب ہے۔ ایک یہودی عورت اور وفادار بن گئی ہے؟''

جلالت نے پوچھا۔ ''کیا تم نے سنا ہے کہ کل رات میئر ایک بم دھماکے میں مارا گیا ہے؟''

''ہاں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے یہ خبریں نشر کی جارہی ہیں۔''

''سوزانہ نے میری پلاننگ کے مطابق اسے جہنم رسید کیا ہے۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''کمال ہے پھر تو واقعی وہ آپ کی رازدار اور وفادار بن کر رہے گی۔''

اس نے جلالت کو ایک مجاہد کی موسس کا فون نمبر اور پتا بتایا۔ وہ ایک ٹی وی چینل میں میک اپ مین تھا۔

فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ ڈیوڈ نے اپنے فون پر نمبر پڑھے پھر کہا۔ ''مونیکا کی کال ہے۔''

جلالت نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ لاؤ مجھ سے بات کراؤ۔''

ڈیوڈ نے فون کا بٹن دبایا۔ پھر اسے کان سے لگاتے ہوئے کوڈ ورڈز ادا کیے۔ اس کے بعد کہا۔ ''مجھ سے پہلے ان سے بات کرو۔''

''کن سے بات کروں؟''

''ایک سرپرائز ہے۔ بات تو کرو۔''

جلالت نے اس سے فون لے کر کہا۔ ''مونیکا! میری جان!''

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ''ہائے یہ تم ہو؟ جب سے جدا

ہوئی ہوں' تمہاری آواز سننے کے لیے ترس رہی ہوں۔ تم سے ملنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔''

''چلو میں دعا کی قبولیت بن گیا ہوں۔''

''آواز سننے کی دعا قبول ہوئی ہے۔ میں تم سے کب ملوں گی؟ اُدھر تم آزاد ہوئے' اِدھر میں بچھڑ گئی ہوں۔''

''فی الحال ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تم یہاں واپس نہیں آسکو گی۔ پتا نہیں جن کتوں کو تمہاری بو سونگھائی گئی ہے' وہ کب تک اسے یاد رکھیں گے؟''

''میں کیا کروں؟ یہ دل تم سے ملنے کو تڑپ رہا ہے۔''

''صبر کرو۔ ہمارا معبود بگڑی بنانے والا ہے۔ ملنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ تمہیں فون پر زیادہ لمبی اور جذباتی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ کوئی کام کی بات کرنی ہو تو مسٹر براؤن سے کرو۔''

اس نے فون ڈیوڈ کو دیا۔ کوئی خاص بات نہیں کرنی تھی۔ مونیکا نے رابطہ ختم کر دیا۔ جلالت کو بھی ڈیوڈ کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہیے تھا۔ لہٰذا وہ اپنی رہائش گاہ میں واپس آگیا۔

بڑی مصروفیات تھیں۔ بڑے اہم معاملات سے نمٹنا تھا۔ دشمن سورما کی آمد کا معاملہ سب سے اہم تھا۔ جلالت کو یقین تھا کہ سوزانہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کر کے ہی آئے گی۔ لیکن اس کا شوہر دورے سے واپس آگیا تھا۔ وہ آزادی سے ملنے نہیں آسکتی تھی۔

راستے ہموار بھی ہو رہے تھے اور رکاوٹیں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔

وہ شام کو ایک ٹی وی چینل کے اسٹوڈیو میں پہنچ گیا۔ وہاں پیشوائے اعظم اور دو ربی موجود تھے۔ وہ بھی انٹرویو کے اس پروگرام میں ہسکل کے سورماؤں کے متعلق بہت کچھ کہنے والے تھے۔

وہاں ان کے بیٹھنے کے لیے ایک سیٹ بنایا گیا تھا۔ تابوت یہودا کی ایک سنہری رنگین تصویر بنائی گئی تھی۔

جب میزبان یہ کہتا کہ ناظرین دو ہزار سال پہلے کی پیشگوئی کے مطابق ہسکل کا پہلا سورما آچکا ہے۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالیں۔ وہ آرہا ہے۔

تب رنگا رنگ لائٹس جلتی بجھتی رہتیں۔ موسیقی گونجتی رہتی پھر اچانک ہی دیوار پر بنا ہوا تابوت یہودا زوردار آواز کے ساتھ جیسے پھٹ پڑتا' دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ تاریکی چھا جاتی۔ پھر اسپاٹ لائٹس کی دائرے نما روشنی میں جلالت اسرار ہسکل کے سورما کی حیثیت سے نظر آتا۔ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا پیشوائے اعظم اور ربیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا۔

ابھی کیمرا آن ہونے اور پروگرام شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ لائٹس مین مختلف زاویوں سے لائٹنگ کے انتظامات کر رہے تھے۔ ایسے وقت وہاں سوزانہ آگئی۔ جلالت نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے؟''

وہ بولی۔ ''کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ کیا تھوڑا وقت دے سکتے ہو؟''

وہ پیشوائے اعظم سے اجازت حاصل کر کے سوزانہ کے ساتھ میک اپ روم میں آگیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ گلے کا ہار بن گئی۔ جلالت نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''تمہارے منسٹر شوہر نے تمہیں آنے کیسے دیا؟''

''میں اس کی پابندیوں میں نہیں رہتی۔ ویسے اس نے خود ہی مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ چاہتا ہے' میں اپنی اداؤں سے تمہیں ٹریپ کروں۔ پرسوں دس تاریخ کو وہ ڈمی سورما جہاں نمودار ہوگا' تمہیں وہاں نہ جانے دوں۔ ایسے وقت تمہیں پھانس کر کسی دوسری جگہ مصروف رکھوں۔''

پھر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''وہ تمہارے ساتھ تنہائی میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے خود ہی مجھے آزادی دے رہا ہے۔''

اُدھر سیٹ پر مکمل لائٹنگ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ پیشوائے اعظم اور دونوں ربی آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے روبرو پروگرام کا میزبان آکر بیٹھ گیا۔ ان کے پیچھے دیوار پر بڑا سا سنہری تابوتِ یہودا جگمگا رہا تھا۔

ایسے ہی وقت اچانک تاریکی چھا گئی۔ ڈائریکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ ''لائٹس آن کرو۔''

ایک لائٹ مین کی آواز سنائی دی۔ ''سر! تمام لائٹس آن ہیں۔ لگتا ہے' کسی تار یا سوئچ میں گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

اس کی بات مکمل ہوتے ہی ایک محدود اسپاٹ لائٹ روشن ہوگئی۔ پھر سب ہی چونک گئے۔ اس کی محدود روشنی میں وہ تابوتِ یہودا ایک زوردار آواز سے پھٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے ہوگئے۔ پھر اس کے پیچھے ایک قدآور شخص کا سایہ دکھائی دینے لگا۔

وہ سب دم بخود ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سایہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا تو لائٹس ایک ایک کر کے آن ہونے لگیں۔ آنے والا واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ اسکرپٹ کے مطابق جلالت اسرار کو ایسے ڈرامائی انداز میں آنا چاہیے تھا مگر وہ تو میک اپ روم میں سوزانہ کو خراجِ تحسین

ادا کر رہا تھا۔

وہ آنے والا پہاڑ جیسا شخص کوئی اور تھا۔ اس نے پیشوائے اعظم کے روبرو آ کر گھٹنے ٹیک دیے۔ پھر اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کہا۔ ''میں ہوں تابوتِ یہودا کا امین... ہیکل کا ایک اور سورما...''

پیشوائے اعظم اور دونوں ربی حیرت و مسرت سے لرزتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سورما نے ایک ہاتھ بڑھا کر مٹھی کھولی۔ اس کی ہتھیلی پر چاندی کی ایک انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''میرے باپ دادا نے کہا تھا' یہ انگوٹھی ہزاروں سال سے نسل در نسل چلی آ رہی ہے۔ ہیکل کی یہ امانت آج میرے پاس ہے۔''

پیشوائے اعظم نے انگوٹھی کو اس کی ہتھیلی پر سے اٹھا کر دیکھا۔ اس پر قدیم عبرانی زبان میں کندہ تھا۔ ''امین...''

پیشوائے اعظم نے انگوٹھی کو بڑی عقیدت سے چوم لیا۔ ربیوں نے بھی اسے چوم کر سورما کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ پھر کہا۔ ''ہمارے سامنے گھٹنے نہ ٹیکو۔ کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ کھڑا ہو گیا۔ ایسے وقت وہ تینوں اس کے دائیں بازو کو دیکھتے ہی چونک گئے۔ ان کے پہلے سورما کی طرح اس کے بازو پر بھی ایک پیدائشی نشان ستارے کے مانند تھا۔

حالات نے اچانک ہی پلٹا کھایا تھا۔ ایسے وقت جبکہ جلالت اسرار اور اس کے مخالفین اپنے طور پر ایک ایک سورما پیدا کرنے والے تھے۔ اُن سے پہلے ہی شاید ایک اصلی سورما نمودار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مخالفین کے منصوبے کے مطابق ان کا سورما بڑے ہی ڈرامائی انداز میں عجائب گھر سے نمودار ہونے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی توقع کے خلاف ہیکل کا ایک سورما اسی وقت اسٹوڈیو کے سیٹ پر نمودار ہو گیا تھا۔

جلالت دھماکے کی آواز سن کر سوزانہ سے بولا۔ ''یہ کیسا دھماکا ہے؟''

سوزانہ نے کہا۔ ''اسٹوڈیو کا بھاری سامان گر پڑا ہو گا۔''

''نہیں۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ چلو یہاں سے۔ ہم شوٹنگ کے بعد اپنے بنگلے میں جائیں گے۔ یوں بھی تمہارے شوہر نے مجھے پھانسنے کے لیے تمہیں کھلی چھٹی دے دی ہے۔''

وہ میک اپ روم سے نکل کر تیزی سے چلتے ہوئے سیٹ پر آئے۔ وہاں کی ایک پچھلی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ شوٹنگ کے مطابق جلالت کو ہارڈ بورڈ کی وہ دیوار توڑ کر کیمرے کے سامنے یعنی ناظرین کے روبرو آنا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ہیکل کا دوسرا سورما آ گیا ہے۔ پیشوائے اعظم نے جلالت کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''سولومن یہودا! ہفتے کا دن ہمارے لیے مبارک ہوتا ہے۔ یہ دیکھو تمہارا دوسرا بھائی۔ تمہارا دوسرا ساتھی' ہیکل کا دوسرا سورما آ گیا ہے۔''

اس نے دوسرے سورما کو دیکھا۔ وہ بھی اسے گہری اپنایت سے دیکھ رہا تھا۔ جلالت نے اس سے کہا۔ ''ابھی ہمارے درمیان جان پہچان ہو گی۔ اعتماد پیدا ہو گا۔ چونکہ پیشوائے اعظم تمہیں ہیکل کا سورما کہہ رہے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

جلالت دونوں بازو پھیلا کر آگے بڑھا۔ دوسرا اس کے سینے سے آ کر لگ گیا۔ اس نے کہا۔ ''برادر سولومن یہودا! میرا نام بنجامن یہودا ہے۔ مجھے اپنے باپ دادا سے جو باتیں معلوم ہوتی رہیں' وہ میں بیان کرتا رہوں گا۔ شاید تمہارے باپ دادا نے بھی تمہیں وہی باتیں بتائی ہوں گی۔''

پیشوائے اعظم اور دونوں ربی فون کے ذریعے اعلیٰ حکام اور فوج کے اعلیٰ افسران کو دوسرے سورما بنجامن یہودا کے متعلق خوشخبری سنا رہے تھے' ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ سب ابھی اس کا استقبال کرنے کے لیے اسٹوڈیو آ جائیں۔

ان اکابرین کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔ وہ سوالات کر رہے تھے کہ جو اجنبی اسٹوڈیو میں آیا ہے' اس پر کیسے یقین کر لیا گیا کہ وہ ہیکل کا دوسرا سورما ہے؟ تمام اکابرین نے پیشوائے اعظم سے کہا۔ ''آپ ٹی وی پروگرام ریکارڈ کرانے کے بعد دونوں سورماؤں کو آرمی ہیڈ کوارٹر میں لائیں۔ ہم وہاں ان کا استقبال کریں گے۔''

وہ پروگرام ریکارڈ ہونے کے تین گھنٹے بعد نشر کیا جانے والا تھا۔ لہٰذا اس کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی۔ کیمرا آن ہوتے ہی میزبان نے کہا۔ ''ناظرین! آج ہم آپ کے سامنے ہیکل کے ایک سورما کو پیش کرنے والے تھے۔ مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اچانک ہی دوسرا سورما بھی نمودار ہو گیا ہے۔''

میزبان کے بعد پیشوائے اعظم اور ربیوں نے دنیا کے تمام یہودیوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ بارہ سورما یکے بعد دیگرے آ رہے ہیں۔ جب یہ یکجا ہو جائیں گے تو ہمیں

تابوت یہودا کی سوغات پیش کریں گے۔

پھر انہوں نے سولومن یہودا اور بنجامن یہودا کو پہلے اور دوسرے سورما کے طور پر پیش کیا۔ یہ بتایا کہ یہ سورما غیر معمولی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے حامل ہیں۔ یہ جب تک یہودی قوم کو تابوت یہودا پیش نہیں کریں گے' تب تک انہیں موت نہیں آئے گی اور نہ ہی کوئی انہیں ہلاک کر سکے گا۔

ان بارہ سورماؤں کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان سب کے دائیں بازو پر ایک خاص پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہے۔

کیمرے کے ذریعے سولومن اور بنجامن کے بازوؤں کو کلوز شوٹ میں دکھایا جا رہا تھا۔ سوزانہ دور کھڑی شوٹنگ دیکھ رہی تھی۔ اس نے سیٹ سے باہر آ کر فون نکالا۔ پھر اپنے منسٹر شوہر ڈیسوزا سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''میں یہاں اسٹوڈیو میں سولومن یہودا کو ٹریپ کر رہی ہوں۔ اگر وہ اب بھی مسلمان ہو گا تو میں اس کے اندر سے بہروپیے مسلمان کو باہر نکال لاؤں گی۔''

''ہم یہی چاہتے ہیں۔ اگر تم اسے بے نقاب کرو گی تو پھر ہم ڈمی سورما کا ڈراما نہیں رچائیں گے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اصل اصل ہی ہوتے ہیں۔ اصل سورماؤں میں جو غیر معمولی صلاحیتیں ہیں' وہ صلاحیتیں ہم ڈمی میں پیدا نہیں کر سکیں گے۔''

''تم گھر کب لوٹو گے؟''

''میری مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ آرمی ہیڈ کوارٹر کی میٹنگ کے بعد چند افسران میجر گورین کی رہائش گاہ میں ذاتی میٹنگ کے لیے جمع ہوں گے۔ مجھے واپس آنے میں صبح ہو جائے گی۔''

سوزانہ خوش ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''میں بھی صبح تک واپس آؤں گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ جلالت آرمی ہیڈ کوارٹر سے فارغ ہو کر آتا تو وہ اس کے ساتھ باقی رات گزار سکتی تھی۔

جلالت شام کو اسٹوڈیو آیا تھا۔ رات کے آٹھ بجے شوٹنگ ختم ہو گئی۔ ہیکل کے سورماؤں کا وہ پروگرام رات دس بجے پوری دنیا کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔

وہ دوسرے سورما بنجامن اور پیشوائے اعظم کے ساتھ مصروف تھا۔ ان کے ساتھ آرمی ہیڈ کوارٹر جا رہا تھا۔

وہ دونوں اپنے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ایک ائیر کنڈیشنڈ گاڑی میں جا رہے تھے۔ پیشوائے اعظم نے کہا۔ ''بنجامن یہوداہ! اپنی ہسٹری بتاؤ۔ تم کون ہو اور اب تک کہاں تھے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے بچپن ہی سے پہلوانی کا شوق تھا۔ میری ماں کہتی تھی' میرے باپ دادا جسمانی طور پر بہت ہی طاقتور تھے۔ پچیس برس کی عمر میں ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ریسلنگ کے مقابلے میں اپنا نام درج کرایا۔ میں کتنا طاقتور ہوں' اس وقت مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا۔

جب ہزاروں تماشائیوں کے سامنے مقابلے شروع ہوئے تو سب ہی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں نے مقابلے پر آنے والے نامی گرامی پہلوانوں کو اٹھا اٹھا کر رنگ کے باہر پھینک دیا تھا۔

ریسلنگ کے آرگنائزر نے مجھے دس لاکھ ڈالرز دیے۔ اگرچہ یہ بڑی رقم تھی لیکن میں دوبارہ ریسلنگ کے لیے نہیں گیا۔ مجھے غیر معمولی جسمانی قوت کی نمائش گوارا نہیں تھی۔

میں تنہا تھا۔ مختلف اداروں میں سیکورٹی افسر کے طور پر ملازمت کرتا رہا۔ میرے اندر اچھی عادتیں ہیں لیکن ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ میں حسین عورتوں کا رسیا ہوں۔''

ایک ربی نے جلالت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سولومن بھی ایسا ہی ہے۔ ہم اس کی طرح تمہاری بھی ہر ضرورت پوری کرتے رہیں گے۔''

بنجامن نے کہا۔ ''جب میں پچاس برس کا ہوا تو ایک رات خواب میں ہیکل کا منظر دیکھا۔ تب سے میرا من مزاج بدل گیا۔''

ایک ربی نے پوچھا۔ ''تم نے خواب میں کیا دیکھا؟''

وہ بولا۔ ''میں نے دیکھا' رات کا وقت ہے۔ میں کچھ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ ہم سب نے سر سے پاؤں تک سفید لبادہ پہنا ہوا تھا۔ ہمارے اوپری آدھے چہرے چھپے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں روشن شمع دان تھیں' ہم ہیکل کے کسی حصے سے گزر رہے تھے اور زیر لب قدیم عبرانی زبان میں کہتے جا رہے تھے...

ہم ہیں تابوت یہودا کے امین... خداوندِ یہودا! ہم ہیں تابوت یہودا کے امین...''

پیشوائے اعظم اور دونوں ربی بڑے ہی جذباتی انداز میں جیسے دم سادھے سن رہے تھے۔ جلالت اسرار بڑی توجہ سے بنجامن کو تک رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ ایک سچا خواب بیان کر رہا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہم شمع دان اٹھائے ہیکل کے ایک ایسے حصے میں پہنچے' جہاں کا فرش دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

ہمارے سامنے چارفٹ کا خلا پیدا ہوگیا۔ نیچے ایک تہ خانہ تھا۔ ہم آگے پیچھے دو دو کی تعداد میں سیڑھیاں اترنے لگے۔ تب میں نے گنتی کی' ہم بارہ افراد تھے۔''

پیشوائے اعظم نے کہا۔ ''یعنی تم ہیکل کے گیارہ سورماؤں کے ساتھ تھے؟ پلیز یاد کرو اور بتاؤ' ہیکل کے کس حصے میں وہ تہ خانہ ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں کبھی ہیکل میں نہیں گیا۔ پہلی بار اسرائیل آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آگے بولو۔ اس تہ خانے میں تم سب کہاں گئے تھے؟''

''وہاں ایک بہت بڑا صندوق تھا۔ وہ خالص سونے کا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے اس پر لگے ہوئے تالے کو کھینچ کر دیکھا پھر یک زبان ہو کر کہا' یہ محفوظ ہے۔''

ربی نے کہا۔ ''یقیناً وہ تابوتِ یہودا تھا۔ آگے بولو۔''

''آگے کچھ نہیں تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ خواب کا منظر گم ہوگیا۔ میں جیتی جاگتی دنیا میں آگیا۔''

پیشوائے اعظم نے کہا۔ ''تمہارا خواب سچا ہے۔ تم یہودی قوم کی امانت تک گئے تھے۔''

بنجامن نے کہا۔ ''میری ماں نے مجھے قدیم عبرانی زبان سکھائی ہے۔ میں نے دو ہزار برس پہلے لکھی ہوئی کتاب ''ہیکل کے سورما'' پڑھی ہے۔ میری ماں کہتی تھی' کتاب میں جو نشانیاں دی گئی ہیں۔ ان کے مطابق تم ہیکل کے سورما ہو۔

ماں کی یہ بات میرے ذہن میں نقش ہوگئی تھی۔ ایک بار میں نے ایک میگزین میں ہیکل کی تصویر دیکھی تو مجھ پر وجد طاری ہوگیا۔ میں آگے پیچھے جھومنے لگا۔

پھر یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ مجھے اسرائیل جانا چاہیے۔ وہاں ہیکل کی چار دیواری میں جاؤں گا تو دلی سکون حاصل ہوگا۔

آج سے تین دن پہلے اخبار میں مختصر سی خبر پڑھی۔ لکھا تھا' اسرائیلی ربیوں کے دعوے کے مطابق ہیکل کا پہلا سورما آگیا ہے۔ جلد ہی دوسرا بھی آئے گا۔

یہ پڑھتے ہی میں نے سفر کی تیاری شروع کی۔ آج یہاں ایک بجے کی فلائٹ سے آیا۔ پھر ہوٹل میں سامان رکھ کر سیدھا ہیکل میں گیا۔ وہاں تھوڑی دیر عبادت کی تو مجھ پر سحر طاری ہونے لگا۔

شام کو وہاں سے نکلا تو اپنے آپ میں نہیں تھا۔

ریفنڈ کار ڈرائیو کرتا ہوا ٹی وی اسٹوڈیو میں چلا آیا۔ مجھ پر ایک بے خودی کا عالم تھا۔ اسٹوڈیو کے اندر آیا تو اچانک ہی بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا' تاریکی میں ایک ہارڈ بورڈ کی دیوار نے راستہ روکا۔

میں کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ اس کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے دیوار پر ایک گھونسا مارا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ ایسے وقت روشنی بھی ہوگئی۔ اس وقت جیسے میری ماں میرے اندر سما گئی تھی' وہ کہہ رہی تھی کہ میں ہیکل کا سورما ہوں اور میں یہی کہتا ہوا پیشوائے اعظم کے قدموں میں جھک گیا۔''

پیشوائے اعظم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''خداوند یہودا ہم پر مہربان ہے۔ ہماری کامیابی و کامرانی کے دن آرہے ہیں۔''

وہ آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ وہاں ایک بڑے ہال میں تمام اکابرین موجود تھے۔ دو سورماؤں کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے لیے انواع و اقسام کی ڈشیں تھیں اور شراب کی ٹرالیاں بھی چل رہی تھیں۔

اکابرین نے بڑی گرمجوشی سے بنجامن یہودا کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے۔ وہاں صرف دو سورما اور مذہبی رہنما تھے' جو شراب سے پرہیز کر رہے تھے۔ جلالت کی طرح بنجامن یہودا بھی نشے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

آرمی کے ایک افسر نے پوچھا۔ ''آپ شراب کو منہ نہیں لگاتے اور عورت کو...!''

بنجامن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ ہماری ضرورت ہے۔ پھر اسے ہماری ضرورت ہو تو ہم ہمیشہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ورنہ اسے چھوڑ کر دوسری کی آرزو کرتے ہیں۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہم نے سنا ہے' سولومن یہودا کی طرح بنجامن یہودا کے دائیں بازو پر بھی ایک پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہے؟''

''بے شک ہے۔ دونوں کے بازوؤں پر یکساں نشان ہے۔ آپ حضرات قریب آکر دیکھ سکتے ہیں۔''

اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''آپ مائنڈ نہ کریں' ہم نے پلاسٹک سرجری کے دو ماہرین کو یہاں بلایا ہے۔ ایسے نشانات سرجری کے ذریعے بنائے جاسکتے ہیں۔''

بنجامن نے کہا۔ ''میں مائنڈ نہیں کروں گا۔ آپ کے ماہرین آئیں اور معائنہ کریں۔''

دو ماہرین اس کے قریب آئے۔ انہوں نے بازو کے اس نشان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس پر لوشن لگا کر ایک

منٹ تک انتظار کیا۔ اس کے بعد محدب شیشوں کے ذریعے بہ غور معائنہ کرنے لگے۔

پھر انہوں نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''پلاسٹک سرجری نہیں ہے۔ یہ واقعی پیدائشی نشان ہے۔''

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''پہلے سورما سولومن یہودا میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ناقابل برداشت اذیتیں سہنے کے دوران نہ چیختا اور تڑپتا ہے' نہ کراہتا ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''بنجامن یہودا بھی ایسی ہی قوتِ برداشت کا حامل ہے۔''

وہاں سوزانہ کا شوہر' جلالت کا دشمن منسٹر ڈیسوزا بھی موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم بنجامن کی قوتِ برداشت کو آزمائیں گے۔''

بنجامن نے کہا۔ ''بے شک آزمائیں۔ لیکن فرسٹ ایڈ کا سامان بھی رکھیں تاکہ مجھے فوری طبی امداد دی جاسکے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ یہاں پہلے سے تمام انتظامات کیے جاچکے ہیں۔''

منسٹر ڈیسوزا ایک چھوٹا سا پش فائر لے کر دونوں سورماؤں کے قریب آیا پھر بنجامن سے بولا۔ ''میں آگ لگا رہا ہوں۔ تم اسے خود بجھاؤ اور اس کی جلن برداشت کرو۔''

پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سب ہی کی نظریں بنجامن پر جمی ہوئی تھیں۔ منسٹر نے اس سے چار قدم کا فاصلہ رکھ کر پش فائر کا بٹن دبایا۔ ''شوں۔ اوں اوں...'' کی آواز کی ساتھ ایک شعلہ سا لپکا اور بنجامن کے لباس میں آگ لگ گئی۔

آگ ایسی زبردست تھی کہ اسے فوراً بجھایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے اپنا لباس پھاڑتے ہوئے اسے جسم سے اتار کر دور پھینک دیا۔ ذرا سی دیر میں اس کے بدن پر آبلے پڑ گئے۔ کہیں کہیں سے کھال جل گئی تھی اور گوشت جھلک رہا تھا۔

اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ اب بھی کس قدر آگ کی جلن محسوس کر رہا ہوگا؟ لیکن منہ سے کراہنے کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ناقابل برداشت تکلیف کو کمال صبر و ضبط سے برداشت کر رہا ہے۔

ایک ربی نے چیخ کر کہا۔ ''اینٹی فائر لوشن لگایا جائے۔ ہمارا یہ سورما آزمائش سے گزر چکا ہے۔''

دشمنی تو جلالت سے تھی۔ اچانک ہی منسٹر نے اس کی سمت پش فائر کا بٹن دبایا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور جلالت آگ میں نہا گیا۔

منسٹر کی شامت آگئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہوجائے گا۔ جلالت اپنا جلتا ہوا لباس اتار کر پھینکنے کے بجائے چھلانگ مار کر اس سے لپٹ گیا۔

گویا موت اس سے لپٹ گئی۔ آگ اسے بھی جلانے لگی۔ وہ چیخیں مار کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوششیں کرنے لگا مگر آہنی شکنجے میں تھا' نکل نہیں سکتا تھا۔ تمام اکابرین چیخ رہے تھے۔ ''سولومن! اسے چھوڑ دو۔ دوڑو۔ پانی لاؤ۔ ان پر ڈال دو۔''

سب چیخ رہے تھے۔ کوئی آگ کے قریب نہیں آرہا تھا۔ بنجامن نے آگے بڑھ کر دونوں کو الگ کیا۔ جلالت کے لباس کو پھاڑ کر دور پھینک دیا۔ پھر منسٹر کی طرف دیکھا۔ وہ فرش پر گر کر تڑپ رہا تھا۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''بنجامن! اس کا لباس بھی الگ کردو۔ اسے بھی بچاؤ۔''

وہ گرج کر بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ یہ صرف مجھے آزمانے آیا تھا۔ پھر اس نے میرے برادر سورما سے دشمنی کیوں کی؟ ہم سورما ہیں۔ دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔''

اس وقت تک پانی لاکر اس پر ڈالا گیا۔ آگ بجھ گئی۔ لیکن وہ بری طرح جلنے کے باعث بیہوش ہوگیا تھا۔ آرمی کے جوان اسے فوراً ہی اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے جانے لگے۔

چند اکابرین غصہ دکھا رہے تھے۔ جلالت کے خلاف بول رہے تھے۔ میجر گورین نے کہا۔ ''اگر منسٹر ڈیسوزا کی موت ہوگئی تو سولومن کو سزائے موت دی جائے گی۔''

جلالت نے کہا۔ ''موت میری نہیں ہوگی۔ سزائے موت دینے والوں کی ہوگی۔ تم اپنی خیر مناؤ۔''

بنجامن نے کہا۔ ''تم کتنے خودغرض لوگ ہو۔ اپنے منسٹر کو تو اسپتال پہنچا دیا۔ ہم دو سورما بری طرح جل چکے ہیں۔ ہمیں کوئی مرہم تک نہیں لگا رہا ہے۔''

ایک ربی نے ہال میں داخل ہو کر کہا۔ ''میں تمہارے لیے مرہم لینے گیا تھا۔ یہ زُود اثر ہے' ابھی آرام آجائے گا۔''

دونوں سورماؤں نے وہ مرہم لے کر ایک دوسرے کے بدن پر لگایا۔ وہ اس بری طرح جل گئے تھے کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اور سب لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ ایسی حالت میں بھی تکلیف سے نہیں کراہ رہے تھے۔ یہ ثابت کر چکے تھے کہ وہ ہیکل کے سورما ہیں۔

فون کال کے ذریعے اطلاع ملی کہ منسٹر ڈیسوزا نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہے۔ جلالت کے مخالفین چیخ چیخ کر مطالبہ کرنے لگے کہ سولومن کو گرفتار کر کے آہنی

سلاخوں کے پیچھے ڈالا جائے۔ اسے سزائے موت نہ ملی تو ہم اسے گولی ماردیں گے۔

مخالفین کم تھے۔ ان سور ماؤں سے متاثر ہونے والے حمایتی زیادہ تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''منسٹر ڈیسوزا نے خوامخواہ دشمنی کی تھی۔ پہلے اس نے سولومن کو آگ سے جلانا چاہا۔ اس کے بعد سولومن نے جوابی کارروائی کی۔ اس کی آگ اسے ہی لگادی۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''منسٹر ڈیسوزا اپنی لگائی ہوئی آگ سے خود ہی جل مرا ہے۔ سولومن یہود ابے قصور ہے۔''

اکابرین کی اکثریت جلالت اسرار کی حمایت میں بولنے لگی۔ یوں آرمی ہیڈ کوارٹر میں ہونے والی میٹنگ برخاست ہوگئی۔

پیشوائے اعظم نے دونوں سور ماؤں سے کہا۔ ''جلے ہوئے بدن کا علاج انتہائی نگہداشت میں کیا جائے گا۔ تم دونوں وی آئی پی اسپتال کے آئی سی یو میں رہو گے۔''

جلالت نے کہا۔ ''ہمارے علاج کے لیے یہ مرہم ہی کافی ہے۔ کل شام تک آپ ہمارے جسموں کو جلا ہوا نہیں پائیں گے۔ فی الحال بنجامن یہودا کے لیے رہائش گاہ کا انتظام کریں۔ میں اپنے بنگلے میں جا کر آرام کروں گا۔''

وہ ان سے رخصت ہوکر بنگلے میں آیا۔ سوزانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بدن کو حیرانی سے دیکھنے لگی۔ وہ صرف ایک ٹیکر پہنے ہوئے تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں ڈیسوزا کی موت کی اطلاع نہیں ملی؟''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ میں ابھی اسپتال میں اس کی جلی ہوئی لاش دیکھ کر آرہی ہوں۔''

''اس کی تدفین سے پہلے تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''ابھی اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ پولیس کارروائی ہوگی۔ کل دوپہر سے پہلے تدفین نہیں ہوسکے گی۔ مجھے جانا ہوگا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔''

وہ قریب آکر دور نہیں جانا چاہتی تھی لیکن گھر جا کر ماتمی لباس پہن کر ایک بیوہ کا رول ادا کرنا تھا۔ لہٰذا حالات سے مجبور ہوکر چلی گئی۔

☆☆☆

مونیکا قاہرہ سے ٹرین کے ذریعے اسکندریہ آئی پھر ایک ٹیکسی میں مصر اور اسرائیل کے سرحدی شہر رفاہ پہنچ گئی۔ اس شہر کے مضافات میں خانہ بدوشوں کی بستی ہے۔ یہ خانہ بدوش خیموں میں رہتے ہیں۔ گھریلو کھانے پینے کے سامان' ٹی وی' کمپیوٹر اور جدید اسلحہ غیر قانونی طور پر فروخت کرتے ہیں۔ جب مصری اور اسرائیلی آرمی چھاپا مارتی ہیں تو یہ فرار ہوجاتے ہیں۔ پھر ان کے جاتے ہی پلٹ آتے ہیں۔ ان کا کچھ سامان آرمی والے لے جاتے ہیں لیکن ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ اسمگلنگ کا مال ہوتا ہے۔ مفت میں آتا ہے' مفت میں چلا جاتا ہے۔ وہ خانہ بدوش اسمگلر فلسطینیوں سے معقول رقم' بھیڑ بکریاں' کینو اور مالٹے لے کر انہیں اناج سے لے کر اسلحہ تک دیتے ہیں اور کسی ضرورت مند کو چور راستوں سے غزہ پہنچا دیتے ہیں۔

انہوں نے مونیکا کو بھی غزہ پہنچایا تھا۔ حماس کے لیڈروں نے بڑی گرمجوشی سے اس استقبال کیا۔

عمر محمود نے کہا۔ ''فی الحال تمہاری دربدری ختم ہوگئی ہے۔ یہاں اسرائیلی کتے تمہاری بو سونگھتے ہوئے نہیں آئیں گے۔''

ایک اور رہنما عبدالباری نے کہا۔ ''ہم جلالت اسرار کے بارے میں بہت کچھ سننا چاہتے ہیں۔ تمہیں پہلے تمہارے گھر پہنچائیں گے۔ وہاں تم غسل کروگی۔ کھا پی کر تھکن دور کروگی۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔''

مونیکا نے حیرانی سے پوچھا۔ ''میرا گھر یہاں کہاں ہے؟''

عبدالباری نے پوچھا۔ ''کیا جلالت اسرار کا گھر تمہارا گھر نہیں ہے؟''

وہ خوش ہوگئی۔ عمر محمود نے کہا۔ ''وہاں جلالت کا بیٹا ایان ایک مختصر سی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ آؤ۔ ہم وہاں چلتے ہیں۔''

مونیکا اپنے جلالت اسرار کے گھر میں پہنچی۔ عمر محمود نے پہلے ایان کا تعارف کرایا۔ ''یہ جلالت کا بیٹا ہے۔ بارہ برس کا ہے مگر اپنے باپ کی طرح قدآور ہوتا جارہا ہے۔''

مونیکا نے اس کے دونوں شانوں پر یوں ہاتھ رکھا' جیسے جلالت کو چھو رہی ہے۔

غزہ کے ہر گھر میں بھیڑ بکریاں پالی جاتی تھیں۔ دودھ مویشی ان کا بہت بڑا سہارا تھے۔ جب سرحدیں کھلتی تھیں تو وہ ان مویشیوں کے عوض اناج حاصل کرتے تھے۔

اسرائیلی اس خوش فہمی میں تھے کہ جب چاہیں گے' سرحدیں بند کر کے انہیں بھوکا ماردیں گے۔ لیکن خدا نے جب پیدا کیا ہے تو پیٹ بھرنے کے وسائل بھی پیدا کیے ہیں۔

ان محصور مسلمانوں سے زرخیز زمینیں چھین لے گئی تھیں۔ انہوں نے اناج اور دیگر ضروری چیزیں حاصل کرنے کے چور راستے نکال لیے تھے۔ یہ راز بہت عرصے بعد کھلا کہ وہ محنت کش فلسطینی زیر زمین سرنگیں کھودتے ہوئے

اسرائیل اور مصر کے ایسے ویران علاقوں میں پہنچ جاتے ہیں' جہاں اسمگلر ان کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ کینو' مالٹے اور سیکڑوں بھیڑ بکریوں کے عوض انہیں اناج کی بوریاں اور اسلحہ دیتے ہیں۔ مصر اور اسرائیل میں روپوش رہنے والے فلسطینی اور عرب مہاجر انہیں امریکی ڈالرز' برطانوی پاؤنڈز اور یورو دیتے ہیں۔ جن کے عوض وہ اسمگلروں سے زیادہ مال خرید کر لے جاتے ہیں۔

زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ انسان کا حوصلہ اپنی ضرورت پوری کرنے لیے آسمان پر کمند ڈالتا ہے اور زمین کی تہ میں سرنگیں بناتا ہے۔

وہ فلسطینی بھی یہی کر رہے تھے۔ انہوں نے باہر کی دنیا سے کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے زمین کے اندر راستے بنائے ہیں۔

کئی جرائد نے لکھا ہے۔ ''انہوں نے زیر زمین میلوں دور تک سرنگیں بنائی ہیں۔ ان کی محنت و مشقت اور حوصلے کی مثال نہیں ملتی۔ یہ اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے کتنی سرنگیں بنائی ہیں اور ان کے ذریعے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے غزہ سے باہر کہاں کہاں نکل آتے ہیں؟''

یہ انکشاف ہوتے ہی اسرائیلی چونک گئے تھے۔ ان کے جاسوس غزہ کے اطراف میلوں دور تک سرنگوں کا سراغ لگانے لگے۔ کئی دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ دو سرنگوں کے دہانے تک پہنچ گئے۔ یہ یقین تھا کہ فلسطینی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کسی دن' کسی وقت وہاں سے باہر نکلیں گے۔ انہوں نے وہاں مورچے بنالیے' ان کی تاک میں بیٹھ گئے۔ دو دن' چار دن گزر گئے۔ پھر ہفتہ گزر گیا۔ ایک چوہا بھی وہاں سے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ جھنجلا گئے۔

اگر چاہتے تو ان سرنگوں میں داخل ہوکر غزہ کی آبادی میں پہنچ جاتے مگر زندہ واپس نہ آتے۔ یہ سمجھ گئے تھے کہ مسلح فلسطینی ان کی مورچہ بندی سے آگاہ ہوچکے ہیں اور ان سرنگوں میں دور کہیں مقابلے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

انہوں نے دونوں سرنگوں کے دہانوں پر بم دھماکے کیے۔ ادھر سے باہر کی دنیا میں آنے کے راستے بند کردیے۔ پھر وہاں چند فوجیوں کو پہرے داری کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔

اُن خفیہ سرنگوں کے متعلق جو سچائی ہے' اسے یہاں آشکار نہیں کیا جائے گا۔ جانباز فلسطینیوں کا راز تمام مسلمانوں کا راز ہے اور مسلمانوں کی دعا ہے کہ اسرائیلی ان سرنگوں تک کبھی نہ پہنچیں۔

یا اللہ! مسلم حکمران کچھ نہیں کرتے۔ عام مسلمان کیا کریں؟ صرف تجھ سے ہی فلسطینیوں کی اور فلسطین کی سلامتی اور بقا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

مونیکا کا اسلامی نام ورقہ رکھا گیا تھا۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر دوسرے کمرے میں پارٹی کے رہنماؤں کے پاس آگئی۔ ذابر کی بیوی نے سب کے لیے کھانا لگایا۔

عمر محمود نے کہا۔ ''باہر سے زیادہ گھر کے دشمن خطرناک ہوتے ہیں۔ یہاں کئی اسرائیلی ایجنٹس ہیں' جو گھر کے بھیدی بن کر یہاں کے راز اسرائیلیوں تک پہنچاتے ہیں۔''

ورقہ نے کہا۔ ''ہمارے لوگ یقیناً ان پر نظر رکھتے ہوں گے؟''

''ہاں۔ وہ سب ہماری نظروں میں ہیں اور غزہ کے مغربی کنارے رہتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی بستیوں میں آنے نہیں دیتے پھر بھی آستین میں چھپے ہوئے سانپ دکھائی نہیں دیتے۔ کچھ ایسے ہیں' جو ہماری آبادیوں میں گھل مل گئے ہیں۔ انہیں ڈھونڈ نکالنا بہت ضروری ہے۔''

''میں یہاں کی ہر عورت اور مرد پر کڑی نظر رکھوں گی۔''

عبدالباری نے کہا۔ ''ہمارا سب سے اہم راز خفیہ سرنگیں ہیں۔ ہم ان سرنگوں کے داخلی راستوں کو بہت خفیہ رکھتے ہیں۔ اگر اسرائیلیوں کو ان راستوں کا علم ہوگا تو وہ فضائی حملے کر کے انہیں تباہ کردیں گے۔ ہمارے زیر زمین راستے بند ہوجائیں گے۔ باہر کی دنیا سے خفیہ رابطہ ختم ہوجائے گا۔''

''بیشک۔ سرنگیں ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ میں کسی سرنگ کے دہانے کی دن رات نگرانی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری وہاں ڈیوٹی لگائیں۔''

''تم ہماری ایک بڑی اہم سرنگ کے پاس رہتی ہو۔ جلالت کے گھر کے احاطے میں جو خشک کنواں ہے۔ وہاں سے سرنگ کا راستہ جاتا ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے لگی۔ عمر محمود نے کہا۔ ''تم اچانک پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ کیا بات ہے؟''

وہ بولی۔ ''مجھے وہاں نہیں رہنا چاہیے۔''

''کیوں نہیں رہنا چاہیے؟''

''اسرائیلی میرے خون کے پیاسے ہیں۔ یہاں سے ان کا کوئی ایجنٹ اطلاع دے گا کہ میں نے جلالت کے گھر میں رہائش اختیار کی ہے تو وہ فضائی حملہ کر کے وہاں بم گرا سکتے ہیں۔ میں مروں نہ مروں' مگر وہ سرنگ تباہ ہوجائے گی۔''

تمام رہنماؤں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے کہا۔ ''ہم نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔ واقعی مخبری ہوسکتی ہے کہ تم اس گھر میں رہتی ہو۔ وہ تم پر جھنجلائے ہوئے ہیں۔ اس گھر پر بمباری کرسکتے ہیں۔''

عبدالباری نے کہا۔ ''تم اس گھر کی طرف نہ جاؤ۔ ہم یہ خبر پھیلائیں گے کہ تمہاری رہائش گاہ بدل گئی ہے۔ اسرائیلی ایجنٹوں تک یہ بات پہنچے گی کہ تم ہر دوسرے تیسرے دن رہائش گاہ بدلتی رہتی ہو۔''

پھر یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ جلالت کے مکان کی طرف نہیں گئی۔ ایک بڑی اہم سرنگ کی حفاظت ہر حال میں لازمی تھی۔ اسے وہاں سے دور دوسری فیملی کے ساتھ رہنے کے لیے ایک کمرا مل گیا۔

تیسرے دن ٹی وی چینل کے ذریعے اعلان ہوا کہ رات کے دس بجے ہیکل کے سورما کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یہ ثابت کیا جائے گا کہ یہودیوں کی ایک دینی کتاب میں کتنی سچی پیشگوئی کی گئی ہے۔

غزہ میں تباہ حال گھرانے تھے۔ ہر گھر میں ٹی وی نہیں تھا۔ یہ تو سب ہی کو معلوم ہوگیا تھا کہ جلالت اسرار ہیکل کا سورما ہے۔ سب ہی عورتیں' بچے' بوڑھے اُس سورما کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

سب نے یہ طے کیا کہ جس کے گھر میں ٹی وی ہے' وہ اسے محلے کی گلی اور چوراہے پر لاکر رکھے۔ تاکہ پورا محلہ اپنے جلالت اسرار کو دیکھ سکے۔ وہ غزہ سے گرفتار ہوکر گیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ آج اسے دیکھنے والے تھے۔ ورقہ کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بہت دنوں کے بعد اپنے محبوب کا دیدار کرنے والی تھی۔

ایان کا دل بھی باپ کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہ شرمندہ تھا۔ اس کی غلط بیانی کے باعث باپ قیدی بن کر اسرائیلیوں کے شکنجے میں پہنچ گیا تھا۔

رات کے نو بجے سے ہی جگہ جگہ چوراہوں اور محلوں میں ٹی وی کے سامنے عورتوں' مردوں' بچوں اور بوڑھوں کی بھیڑ لگ گئی۔ دس بجے پروگرام شروع ہوا تو پیشوائے اعظم نے کہا۔ ''آج ہم ایک سورما کو پیش کرنے والے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اچانک ہی دوسرا سورما نمودار ہوگیا ہے۔''

اسکرین پر پہلے اس دوسرے سورما کو پیش کیا گیا۔ اس سے گفتگو ہونے لگی۔ تمام فلسطینی بیزار ہوگئے۔ انہیں ہیکل کے کسی سورما سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے سورما کو دیکھنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر ان کا مطلوب ومحبوب اسکرین پر نظر آیا۔ سب ہی خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ان لمحات میں پورا غزہ تالیوں سے گونج رہا تھا۔ وہ مجاہد جو قیدی بن کر اسرائیل گیا تھا۔ وہاں یہودی ربیوں کے سر کا تاج بن گیا تھا۔

ایان باپ کو دیکھ کر خوشی سے رونے لگا۔ ورقہ نے پوچھا۔ ''کیوں رو رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ندامت سے رو رہا ہوں کہ میں نے بابا پر الزام لگا کر نظروں سے گرا دیا تھا اور خوشی سے بھی رو رہا ہوں۔ انہیں گرا نہ سکا' وہ بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔''

ورقہ بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے باپ کو سحر زدہ ہوکر دیکھ رہی تھی۔ اس کے جی میں آرہا تھا کہ آگے بڑھ کر اسے چھولے۔ پیشوائے اعظم اور ربی کہہ رہے تھے کہ آئندہ اور دس سورما آئیں گے۔ پھر یہ بارہ سورما یہودی قوم کو وہ تابوت یہودا پیش کریں گے۔ اس کی برکت سے یہودی قوم قیامت تک سلامت رہے گی۔ باقی تمام مذاہب اس دنیا سے نابود ہوجائیں گے۔

یہ بات سن کر تمام فلسطینی لعنت بھیج رہے تھے اور کامل یقین سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا اسلام قیامت تک رہے گا۔

ان ربیوں نے کہا۔ ''سورماؤں کی سب سے اہم پہچان یہ ہے کہ ان کے دائیں بازو پر ایک پیدائشی نشان ستارے کے مانند ہوتا ہے اور وہ تمام نشانات ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

ورقہ نے ایان کے بارے میں سوچا۔ اس کے دائیں بازو پر بالکل ویسا ہی نشان تھا۔ اس نے عمر محمود سے کہا۔ ''اگر سورماؤں کی سب سے اہم پہچان وہ بازو کا نشان ہے تو پھر ایان کو بھی ہیکل کا سورما کہنا چاہیے۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ بچہ ہے۔ سورما کیسے بن جائے گا؟''

ورقہ نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ایان کو تکلیف میں روتے یا کراہتے دیکھا ہے؟''

''میں نے اسے ماں کی موت پر روتے دیکھا ہے۔''

''وہ تو ماں کے لیے صدمہ تھا۔ ایک جذباتی معاملہ تھا۔ کیا وہ دکھ' تکلیف یا اذیت سہتے وقت ہائے ہائے کرتا ہے؟''

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس نے یہاں آکر مختلف ہتھیاروں سے نشانہ بازی سیکھی ہے۔ جنگی مشقوں کے دوران کئی بار زخمی ہوا' مگر میں نے اسے روتے یا کراہتے نہیں دیکھا۔ جبکہ بچے ہوں یا بڑے سب ہی زخمی ہوکر کراہتے ضرور ہیں۔ ایسے وقت ہم اس کی تعریفیں کرتے

تھے اور کہتے تھے' وہ اپنے باپ کی طرح جیدار ہے۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر نئی رہائش گاہ کی طرف جانے لگی۔ عمر محمود نے کہا۔ ''سنو...!''

وہ رک گئی۔ اس نے کہا۔ ''کسی کے سامنے یہ بات زبان پر نہ لاؤ کہ ایان کے بازو پر باپ دادا کے جیسا پیدائشی نشان ہے۔ اس لیے وہ بھی ہیکل کا سورما ہوسکتا ہے۔ یہ بات اسرائیلیوں اور ان کے ربیوں تک پہنچے گی تو وہ ایان کو حاصل کرنا چاہیں گے۔''

عبدالباری نے کہا۔ ''اگر ان کے گیارہ سورما یکجا ہوجائیں گے تو وہ گنتی پوری کرنے کے لیے ایان کو بارہواں سورما بنانا چاہیں گے۔''

ورقہ نے کہا۔ ''ہاں۔ اگرچہ یہ مضحکہ خیز بات ہے لیکن وہ اپنی دینی کتاب کی پیشگوئیاں سچ ثابت کرنے کے لیے ایسا کرسکتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں ایان کے سلسلے میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ دفتر کے باہر ایک خاتون اس کی منتظر تھی۔ جس کے خاندان میں اب اسے بھی جاکر رہنا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

وہاں جو اسرائیلی ایجنٹ تھے' وہ ایان کو اور اس کے بازو کے نشان کو بچپن سے دیکھتے آرہے تھے۔ اس رات انہوں نے پیشوائے اعظم کی باتیں سنیں کہ ہیکل کے سورماؤں کی ایک خاص پہچان ان کا پیدائشی نشان ہے۔

دو دنوں کے بعد ایک اسرائیلی ایجنٹ کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اپنے آقاؤں سے ایان کے سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ یہ بات ان یہودیوں کے لیے اہم ہوسکتی ہے۔

اس نے اسرائیلی انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر سے فون پر رابطہ کیا۔ افسر نے پوچھا۔ ''کیا رپورٹ ہے؟''

وہ بولا۔ ''سر! مونیکا کا نام بدل گیا ہے۔ وہ ورقہ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اس نے رہائش گاہ بدل دی ہے۔ صبح تک معلوم ہوگا' وہ کہاں رہنے گئی ہے؟''

افسر نے کہا۔ ''جہاں بھی موقع ملے' اسے گولی سے اڑادو۔''

اس زرخرید شخص نے کہا۔ ''سر! ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ ٹی وی پر پیشوائے اعظم نے کہا تھا کہ جس کے بازو پر ایک خاص پیدائشی نشان ہوگا' وہ ضرور ہیکل کا سورما ہوگا۔ یہاں غزہ میں ایک بارہ برس کے لڑکے کے بازو پر ویسا ہی پیدائشی نشان ہے۔ وہ بناوٹی نہیں ہے۔ ہم بچپن سے اسے دیکھتے آرہے ہیں۔''

''اس کا نام ایان ہے اور وہ ہیکل کے پہلے سورما سولومن یہودا کا بیٹا ہے۔''

''اوہ گاڈ! وہ ہمارے پہلے سورما کا بیٹا ہے۔ میں ابھی اعلیٰ افسران سے اور پیشوائے اعظم سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔

پھر پیشوائے اعظم سے پوچھا۔ ''کیا سولومن یہودا کے بیٹے ایان کو ہیکل کا سورما کہا جاسکتا ہے؟''

پیشوائے اعظم نے کہا۔ ''یہ بہت ہی روحانی اور جذباتی حقیقت ہے۔ یقیناً سولومن کے بیٹے کے بازو پر ویسا ہی پیدائشی نشان ہوگا۔ اب یہ معلوم کرنا ہے کہ باپ کی طرح بیٹے میں بھی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں یا نہیں؟ ہم اس سلسلے میں ابھی سولومن سے بات کریں گے۔''

وہ بات تو کرنے والے تھے۔ اس سے پہلے یہ ارادہ دماغ میں پکنے لگا کہ ایان میں باپ کی طرح غیر معمولی صلاحیتیں ہوں گی تو اسے ضرور ہیکل کا سورما تسلیم کیا جائے گا۔ چونکہ ابھی وہ کم سن ہے' اس لیے اسے دنیا والوں پر ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ آئندہ بارہ کی گنتی پوری کرنے کے لیے اسے ایک اثاثے کے طور پر محفوظ رکھا جائے گا۔

☆☆☆

جلالت نے فون پر نمبر پنچ کیے پھر ایک ربی سے پوچھا۔ ''بنجامن کا کیا حال ہے؟''

ربی نے کہا۔ ''میں اسپتال میں ہوں۔ بنجامن کی حالت تشویشناک ہے۔ جو آبلے پڑ گئے تھے' وہ پھوٹ رہے ہیں۔ ان میں سے مواد بہہ رہا ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی تھا' کھال بری طرح جل گئی تھی۔ اندر سے گوشت جھلک رہا تھا۔ ڈاکٹر دوائیں لگاتے ہیں تو وہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔''

پھر ربی نے رازدارانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں کہا۔ ''ایک بات ہمارے دعوے کے خلاف ہورہی ہے۔ بنجامن سے تکلیف اور جلن برداشت نہیں ہورہی ہے۔ یہ آنکھیں بند کیے کراہ رہا ہے۔ اپنے بارے میں کہو' کیا تمہاری جلن اور تکلیف بھی بڑھ گئی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''کیسی جلن؟ کیسی تکلیف؟ وہ تو کل رات ہی ختم ہوگئی تھی۔ تمام چھالے ماند پڑ گئے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی پرابلم نہیں ہے اور بنجامن کے ساتھ بھی نہیں ہونی چاہیے۔''

''مگر ہورہی ہے۔ میں نے دروازے کو بند رکھا ہے تاکہ کوئی اندر نہ آئے اور اسے کراہتے ہوئے نہ دیکھے۔ ہمارے حکمرانوں اور آرمی کے افسروں کو معلوم ہوگا تو وہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گھر بیٹھے

رسالہ حاصل کیجیے

[illegible]

(0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مسکرا رہا تھا۔ ”آؤ ہم شمعیں روشن کریں۔“
اس نے ایک موم بتی کو تیلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”آگ لگاتے وقت یہ سوچنا چاہیے کہ تمہارا گھر بھی جل سکتا ہے۔“
وہ کن انکھیوں سے جلالت کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم سیلینا کو قتل کرنے گئے تھے۔ مگر کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے کہ تم نے میری سیلینا پر گولی چلائی ہے اور... اس بات کا بھی کوئی چشم دید گواہ نہیں ہوگا کہ میں نے تمہاری سوزانہ کی گردن توڑی ہے۔“
جلالت اور پیشوا نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ ”پیشوائے اعظم! میں سورما ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میں نے دوسرے سورما سے جانی دشمنی نہیں کی۔ اس کے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی اور ایسا کبھی ہوگا بھی نہیں۔ ابھی اور سورما آئیں گے۔ ہمیں بارہ کی تعداد میں یکجا ہونا ہے۔“
پیشوا نے کہا۔ ”یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ تم سولومن کو جانی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ لیکن دلوں میں بغض اور کینہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اپنی ذہانت سے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ سمجھنا چاہیے۔ عورت کی شیطانی کشش مرد کو مرد سے لڑاتی ہے۔“
جلالت نے کہا۔ ”تم نے سیلینا کی باتوں میں آکر میری محبوبہ کو مار ڈالا۔ میں سوزانہ کا انتقام لینے کے لیے سیلینا یا اس کے باپ کو مار ڈالوں گا یا انہیں اپاہج بنا دوں گا۔ اس کے جواب میں تم پھر مجھ سے انتقام لو گے اور یہ سلسلہ نجانے کب تک چلتا رہے گا؟“
وہ بولا۔ ”یہ سلسلہ تو اب چلتا ہی رہے گا۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ میں نے پیشوائے اعظم کو زبان دی ہے۔ تمہیں کبھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کروں گا۔“
”تم بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ اس وقت میرے برابر زندہ سلامت کھڑے ہو۔ اگر سورما کو ہلاک کرنے کی اجازت ہوتی تو۔“
اس نے پھونک مار کر ایک موم بتی بجھائی پھر کہا۔ ”تو ایک ہی پھونک میں تمہیں بجھا کر رکھ دیتا۔“
بنجامن نے حملہ کرنے کے انداز میں تن کر کہا۔ ”پیشوائے اعظم! یہ مجھے للکار رہا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
پیشوا فوراً ہی ان کے درمیان آکر بولا۔ ”ذرا عقل سے سوچو اور سمجھو، دلوں میں بغض اور کینہ رہے گا اور عورت فساد کا سبب بنے گی تو تم اپنی زبان سے پھر جاؤ گے۔ بھول جاؤ گے کہ کسی سورما کو ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔ اور ابھی تم سے یہی غلطی ہو سکتی ہے۔“
جلالت نے کہا۔ ”چلو غصہ تھوک دو۔ میں سوزانہ کا خون معاف کرتا ہوں۔“
وہ گرج کر بولا۔ ”میں تم سے معافی نہیں مانگ رہا ہوں۔“
جلالت نے مسکرا کر کہا۔ ”تم نے انتقاماً جو کیا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے برادر سورما! تم نے دشمنی نہیں کی ہے۔ سوزانہ کو ہلاک کر کے ایک خطرناک بلا سے نجات دلائی ہے۔“
بنجامن اس بات سے الجھ گیا۔ اس نے گھور کر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“
وہ بولا۔ ”وہ میرے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گئی تھی۔ جسے نہ میں نگل سکتا تھا، نہ اُگل سکتا تھا۔ وہ میری بہت بڑی کمزوری بن گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں؟ مگر تم نے پلک جھپکتے ہی پیچھا چھڑا دیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“
”بکواس کر رہے ہو۔ میں اور تم پر احسان کروں گا۔ اُونہہ...“
”تم نے یہ مہربانی انجانے میں کی ہے۔ ہم دونوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ تم غصہ اور انتقام کے جنون میں مجھے نقصان پہنچاؤ گے اور میں اپنی ذہانت سے، ٹھنڈے دماغ سے اس نقصان کو منافع میں بدل دوں گا۔“
پیشوائے اعظم نے اور ربیوں نے شمعدان اٹھا لیں۔ بنجامن سنجیدگی سے دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ ابھی اس نے سولومن کو نقصان پہنچایا تھا مگر اس عداوت سے اسے فائدہ حاصل ہوا تھا۔ جلالت نے اپنی شمعدان اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آؤ! اب ہیکل کی چار دیواری میں چلو۔ وہاں ایک ایسا دماغی جھٹکا پہنچاؤں گا کہ اس کے بعد تم کبھی مجھ سے دشمنی نہیں کرو گے۔“
جلالت نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ وہ اپنی شمعدان اٹھا کر رقیب کے ساتھ چل رہا تھا۔ اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ آگے کیا کرنے والا ہے؟
اب تک دو ہی سورما آئے تھے اور طرح طرح کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔
آئندہ مزید دس سورما آئیں گے تو کیا ہوگا؟ ایک دوسرے کی نیندیں اڑا دینے والے کیسے کیسے مسائل پیدا کریں گے؟

(جاری ہے)